قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

نومبر 2015، قیمت -/15₹

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

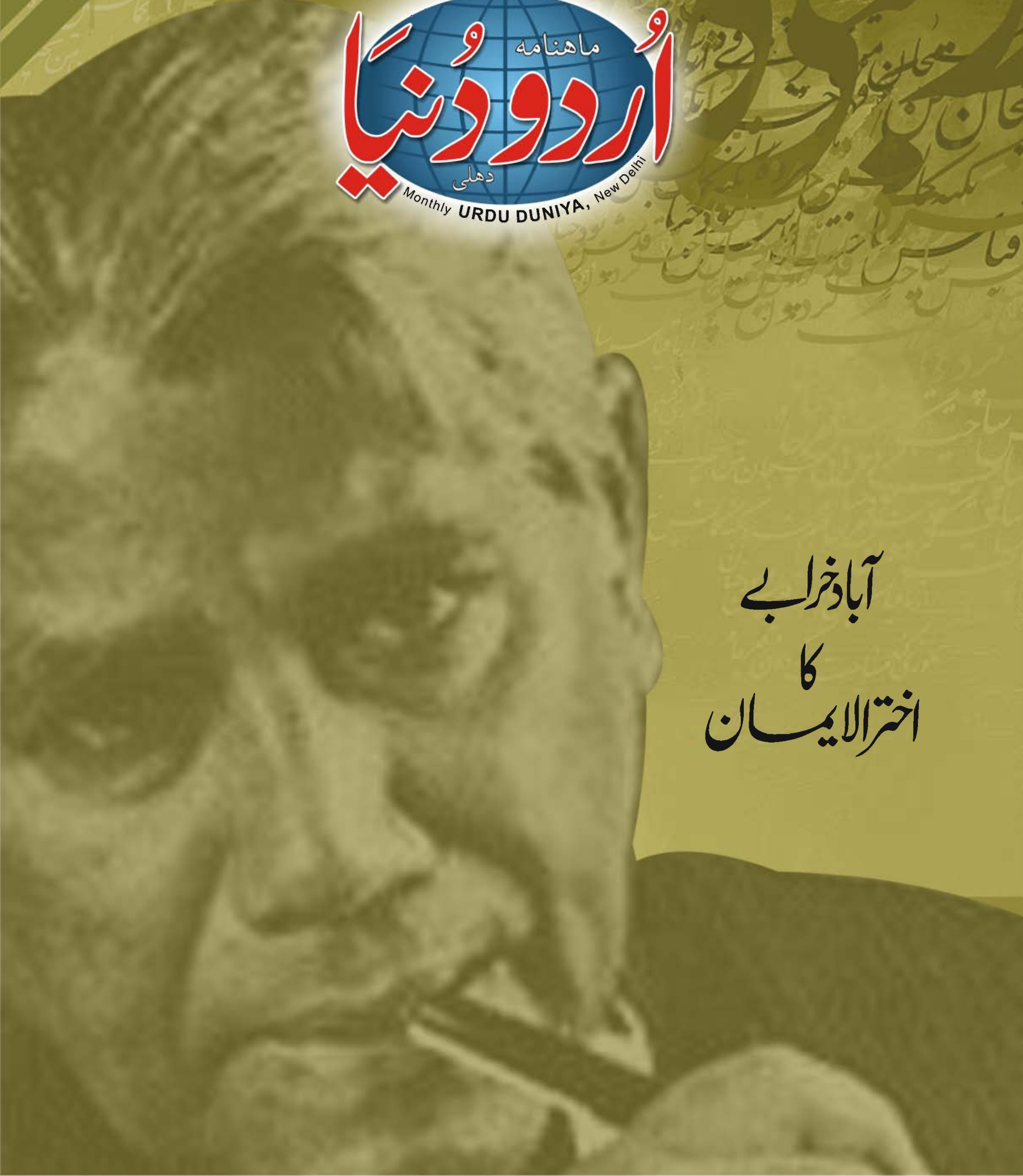

آباد خرابے کا اختر الایمان

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ◆ کامکس کہانی ◆ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

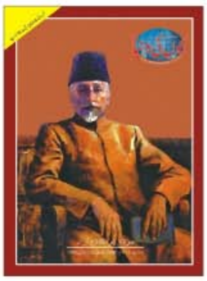

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ:11 نومبر 2015

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

یوم آئین پر خصوصی تحریر
بھارت کا آئین اور انسانی حقوق خواجہ عبدالمنتقم 8

انٹرویو
زبان رفتہ رفتہ کمزور ہوتی
جارہی ہے: ناوک حمزہ پوری احمد صغیر 10

گوشہ اخترالایمان
اخترالایمان کا انفرادی آہنگ منظر اعجاز 15
اخترالایمان کا نظمیہ افق کرشن بھاوک 19
اخترالایمان کی شاعری میں
اتحاد و قومی یکجہتی صدیق محی الدین 24
اخترالایمان-رومانیت سے آگے کا سفر یوسف رامپوری 27
روح کے کرب کا بیانیہ محمد امتیاز احمد 30
اس آباد خرابے میں حنا فردوس 33
انتخاب کلام اخترالایمان 35

زبان و تعلیم
اردو زبان و ادب اور مکھی... محمد محفوظ الحسن 37
مشترکہ بنگال میں اردو کا ارتقا
خطبات عبدالحق کی روشنی میں معین الدین 39

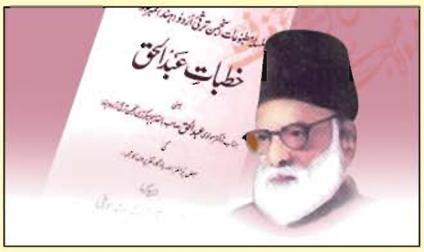

ادبی مباحث
تخلیق اور تخلیقیت احمد خان 41
اردو ادب میں تہذیبی
اشتراک اور رواداری جمشید احمد 47

نقد و نظر
کھلے گا کس طرح مضموں ترے
ہر شعر کا غالب پروفیسر یونس اگاسکر 50

دوسری زبانوں سے
حاتم طائی کے ملک سے عذرا نقوی 52

تہذیب و ثقافت
مشترکہ تہذیب کے فروغ میں
چشتی صوفیا کا حصہ حبیب نثار 54

غار ہائے ایلورہ: فن سنگ تراشی
کا ایک قابل قدر کارنامہ رفعت سعید قریشی 56

کیریئر
اردو اور روزگار کے 21 نکات ثروت خان 58

طب
طب میں علاج بالتدبیر کی اہمیت جلیل احمد 60

فلم
فلموں میں اردو غزل کا جادو سلیمیٰ بی کولور 63

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 67

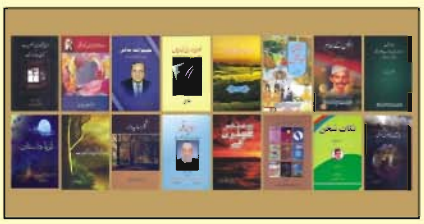

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ ادارہ 78

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 80

ہماری بات

نئی لسانی آبادی کی تعمیر اور نئے تخلیقی معاشرے کی تشکیل پرانے حصاروں سے نکلے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے رویے اور رجحان میں تبدیلی لانی ہوگی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا اور یوں بھی گلوبلائزیشن اور نئی صارفی معاشرت کی وجہ سے ذہنی ترجیحات بدل چکی ہیں۔ ٹیکنالوجی کی نئی ترقیات نے بھی ہمارے معاشرتی تقاضے بدل دیے ہیں۔ مسائل کی صورت بھی تبدیل ہوئی ہے اور موضوعات میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ پس سائنسی سماج ایک نیا ثقافتی اور علمی محاورہ وضع کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں ثقافتی اور ادبی معاشرے کے سامنے بہت سے سوالات ہیں۔ ان میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ سائنسی اور سماجی علوم کے عہد میں ادبی مباحث کی کیا اہمیت ہے؟ کیا نظریاتی بحثوں میں الجھ کر انسانی بحران کے مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔ انسانی وجود اور اس کی تہذیب سے جڑے ہوئے بہت سے مسائل ہیں جن کے جوابات ہمیں تلاش کرنے ہیں۔ ایسے میں ادب ہی ایک ایسا نسخہ نظر آتا ہے جو ہمارے معاشرتی، ثقافتی، روحانی کرب اور درد کا درماں بن سکتا ہے۔ ادب کے ذریعے بہت سے تناقضات وتنازعات کے حل نکالے جاسکتے ہیں کہ ادب انسانی اقدار وافکار کی تبلیغ اور ترسیل کرتا ہے۔ ثقافتی تنوع اور تہذیبی تکثیریت ہی اس کے تشخص کا مرکزی حوالہ ہے۔

اردو زبان وادب نے بھی اسی ثقافتی تنوع اور تہذیبی تکثیریت کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک اردو زبان کا یہ وہ کردار ہے جس کی وجہ سے اس زبان کو ہر طبقے اور ہر علاقے میں محبوبیت اور مقبولیت نصیب ہوئی ہے اور اس کی شیرینی کا جادو پوری دنیا میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ قلی قطب شاہ ہوں یا نظیر اکبر آبادی، سلسلۂ شعر ونثر کے بیشتر فنکاروں نے اتحاد، یگانگت اور رواداری کے جذبے کو ہی فروغ دیا ہے اور یہی اردو زبان کا طرۂ امتیاز ہے۔

قومی اردو کونسل کے ترجمان 'اردو دنیا' نے اسی تصور اور احساس کو اپنا محور بنایا ہے اور ایسے موضوعات کو اپنے مجلّے کا حصہ بناتا رہا ہے جس سے انسانیت، اتحاد اور تہذیبی یگانگت کو فروغ حاصل ہو۔ 'اردو دنیا' کا دائرہ وسیع ہے اور اس رسالے کا مزاج اور منہاج بھی الگ ہے۔ اس کا رشتہ معاشرے کے تمام طبقات سے ہے اس لیے یہ ایسا کثیر جہتی رسالہ ہے جس میں تمام وہ موضوعات شامل رہتے ہیں جن کا معاشرے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس میں طب اور صحت، سائنس اور سماج اور دیگر موضوعات اس لیے شامل کیے جاتے ہیں کہ اردو زبان صرف چند موضوعات تک محدود نہ رہے بلکہ اس کا موضوعاتی دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو۔ خاص طور پر سائنسی اور سماجی علوم سے متعلق تخلیقات سے اردو رسائل وجرائد محروم رہتے ہیں اسی لیے اردو دنیا میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے جو ہماری معاشرتی زندگی کے لیے مفید ثابت ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اردو میں ایسے موضوعات پر زور دیا تھا جن سے سماج کی فلاح و بہبود وابستہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جدید معلوماتی اور ٹکنیکی علوم پر لکھی گئی کتابوں سے ہی زبان ترقی کرسکتی ہے۔

'اردو دنیا' کے اس شمارے میں اہم مضامین کے علاوہ ایک گوشہ نظمیہ افق کے تابندہ ستارے اخترالایمان پر شامل ہے۔ اس گوشے کا جواز یہ ہے کہ 12 نومبر 2015 کو ان کی پیدائش کے سو سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس مناسبت سے انھیں شایانِ شان خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی شخصیت اور فن کی مختلف جہتوں پر مضامین شائع کیے جارہے ہیں جن سے اخترالایمان کی تخلیقی شخصیت کی مجموعی تصویر لوگوں کے سامنے آجائے گی۔ مگر ان کی شخصیت کی اتنی تہیں ہیں کہ چند صفحات میں اس کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی ہمیں یہ امید ہے کہ اخترالایمان پر یہ پیشکش آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

ہمیں آپ کی گراں قدر آرا اور مشوروں کا انتظار رہے گا۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

ڈاکٹر سراج الدین احمد قادری
محلّہ بنجریا پچھمی، خلیل آباد، ضلع سنت کبیر نگر

ماہنامہ 'اردو دنیا' شمارہ اکتوبر 2015 اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں سے متصف ہے۔ ہر ایک کا ماہنامہ یا کتاب پڑھنے اسے دیکھنے کا اپنا ایک انداز اور طریقہ ہے۔ میں ماہنامے کو کتابوں پر تبصرے کے موضوع سے شروع کرتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے نئی کتابوں اور مجلوں کی جستجو رہتی ہے۔ میری التجا ہے کہ اس میں کچھ تبدیلی ہونی چاہیے جیسے مصنف، مولف یا مترجم کی تفصیلی معلومات، ایڈریس، ای میل اور ناشر ایڈریس، فون نمبر، موبائل نمبر وغیرہ معلومات درج ہونی چاہیے جس سے قاری اپنے ذوق و جستجو کے اعتبار سے کتاب یا میگزین کو حاصل کر سکے۔ ماہ اکتوبر 2015 کا شمارہ مطالعہ کر رہا تھا۔ عالی جناب رتن سنگھ صاحب سے ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ کا لیا گیا انٹرویو مطالعہ کیا مگر اس میں تشنگی کا احساس ہوا ان کی زندگی کے حوالے سے کچھ باتیں بھی آنی چاہیے تھیں جو نہیں آسکیں۔ باقی مشمولات قابل ستائش ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

اردو دنیا کا ستمبر 2015 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ متعدد معلوماتی اور قیمتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اردو فکشن کے قطبین راجندر سنگھ بیدی اور عبداللہ حسین کے فکر و فن کے گوناگوں پہلوؤں اور امتیازی خصوصیتوں کا بیان ہے۔ مندرجہ ذیل مضامین بہت پسند آئے: انٹرویو کے تحت تنقید کبھی ایماندار نہیں رہی، راجندر سنگھ بیدی کا افسانوی جہان، راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقی انفرادیت، راجندر سنگھ بیدی مشاہیر کی نظر میں، عبداللہ حسین، فن و شخصیت، عبداللہ حسین: قدح قدح تیری یادیں، عبداللہ حسین کے کرداروں کا المیہ اور تبصرے۔

کرشن بھاوُک
201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' کا ستمبر 2015 کا شمارہ مقبولِ عام ادیب راجندر سنگھ بیدی کے یومِ پیدائش کی صدی کے مکمل ہونے پر اور شہرۂ آفاق فکشن نگار عبداللہ حسین کی دو ماہ قبل ہوئی رحلت پر شائع مناسب و اعلیٰ مضامین پر مبنی ہے اور

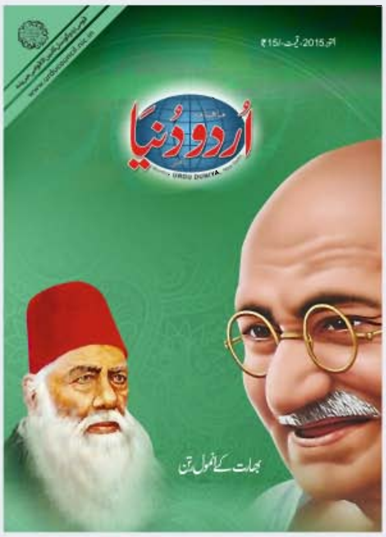

یہ شمارہ دونوں ادیبوں کے تئیں مناسب و معقول خراجِ عقیدت پیش کرنے والا دستاویزی نوعیت کا واقع ہوا ہے۔ محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے اپنے مضمون میں بیدی صاحب کے افسانوں کا لائقِ تحسین تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ محترمہ زیب النسا سعید صاحبہ نے اپنے مضمون میں مرحوم ادیب عبداللہ حسین کے ضمن میں موصوف کے ساتھ کی گئی ایک گفتگو پر مبنی ان کا لائقِ تائید یہ پختہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ... ''کسی قسم کی تکلیف سے کسی نہ کسی طرح کی تخلیق جنم لیتی ہے۔'' (ص 35) میں یہاں افریقہ کے ایک پوئٹ جاک پریورٹ کی یہ شاندار سطور درج کرنا چاہتا ہوں:
''ماں میں ایک بچہ، بچے میں ایک ماں رموت چھپی ہوئی ماں کی ایک چیخ میں ر بچہ نئی زندگی میں!''

الحاج شفیق احمد
استاد مدرسہ انوار العلوم، رام نگر، ضلع بارہ بنکی (یو پی)

ماہ نامہ اردو دنیا ستمبر 2015 کے سرورق پر لکھا ہوا 'فکشن کے قطبین بیدی اور حسین' نیز خوبصورت تصاویر کے ساتھ شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ بڑی ہی اہمیت کا حامل ہے۔ سہیل انجم کا قلمی خاکہ پروفیسر ارتضیٰ کریم بڑے ہی اچھے انداز میں ردیف اور قافیہ کے طرز پر سپرد قلم ہوا ہے جو کہ لائق ستائش ہے۔ مشتاق احمد نوری سے صدف اقبال کا لیا گیا انٹرویو بھی بہت خوب ہے۔ گوشۂ راجندر سنگھ بیدی کے جو بھی مضامین ہیں وہ بہت ہی اہم ہیں۔ جمیل اختر نے زندگی نامہ راجندر سنگھ بیدی بھی کیا خوب لکھا ہے۔ گرم کوٹ تو اپنے آپ میں بے مثال ہے۔ گوشۂ عبداللہ حسین میں شامل تمام مضامین معلومات سے بھرپور ہیں۔ نصیر احمد ناصر کی تحریر کردہ نظم 'کہانی اور کتنی دور جائے گی' بھی بہت ہی اچھے انداز میں قلمبند کی گئی ہے۔ محمد خلیل کا لکھا ہوا مضمون 'ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام عظیم انسان و سائنس داں' سمندر کو کوزے میں مقید کیے جانے کے مانند ہے۔

عبدالشاہد
لیکچرار، اردو جونیئر کالج، پوسہ ضلع ایوت محل (مہاراشٹر)

ماہِ ستمبر 2015 کا 'اردو دنیا' پوری آب و تاب اور شان کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ رسالہ شروع سے آخر تک ایک نئی رنگت اور کشش لیے ہوئے ہے۔ ہر مضمون اپنی مثال آپ ہے۔ خصوصاً راجندر سنگھ بیدی پر انتہائی عمیق انداز میں مضامین تحریر کیے گئے ہیں۔ بیدی کی کہانیوں میں ملک کی تقسیم کا درد صاف جھلکتا ہے۔ اس سانحے کی وجہ سے آج تک دونوں قومیں مضطرب دکھائی دیتی ہیں۔ پنجاب کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو بھی ان کے افسانوں کا ایک خاص وصف ہے۔ 'ایک چادر میلی سی' پر علاحدہ سے مضمون تیار کیا جا سکتا تھا جس کی کمی شمارے میں محسوس ہوتی ہے۔ 'عبداللہ حسین شخصیت و فن' بھی پسند آیا۔ موصوف کی 'اُداس نسلیں' کا باب پڑھ کر ٹی ایس ایلیٹ کی شہرۂ آفاق تصنیف Wastland کی بے اختیار یاد تازہ ہوگئی۔ حسین صاحب کی تحریر میں ایک حرف نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔ بشر نواز کی شاعری کا مختصراً جائزہ بہتر طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ مرحوم ایک سادہ لوح اور دردمند انسان تھے۔ ان کی انسانیت دوستی ان کی شاعری میں جا بہ جا نظر آتی ہے۔ سابق صدر جمہوریۂ ہند عبدالکلام پر لکھا گیا مضمون کافی معلوماتی ہے۔ خلیل صاحب کے قلم نے اس مضمون کو اور جاذب بنا دیا ہے۔ چند ایک گذارشات آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ گذشتہ دور کے ادیب اور شعرائے کرام، نقاد، مثلاً سراج انور، م ک مہتاب، ایم اے تشنہ، واجدہ تبسم، راجیو مرزا، بشیشر پردیپ، رام لعل، ہرچرن چاؤلہ، بلونت سنگھ،

عطیہ پروین، م م راجندر، عظیم اقبال، غیاث احمد گدی، نور شاہ کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ ساتھ ہی سید احتشام حسین، ظ انصاری، مظفر حنفی، مظفر حسین برنی، رفیق زکریا اور خشونت سنگھ کے بارے میں جاننے اور معلومات حاصل کرنے کا مجھ جیسے بے شمار قارئین کو گویا جنون سوار ہے۔ کیا ہی اچھا ہوگا آپ سلامت علی مہدی (مدیر: محراب، آنچل، عوام) خوشتر گرامی (مدیر: بیسویں صدی)، ادریس دہلوی (شمع)، رحمٰن نیر (روبی)، گوپال متل (تحریک) کے بارے میں بھی تفصیلی مضامین آئندہ شماروں میں پیش کریں!

اختر کاظمی
12/14، سائی نگر، بھیونڈی (مہاراشٹر)

ماہنامہ 'اردو دنیا' ستمبر 2015 کا شمارہ موصول ہوا۔ بزرگ ادیب علیم صبا نویدی کے خط نے یہ حقیقت واضح کردی کہ خواتین قلم کاروں کی تخلیقات اور ان کی ادبی خدمات کا محاسبہ کرنا بہت آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے عرق ریزی اور گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ صدف اقبال صاحبہ کے ذریعے محترم مشتاق احمد نوری سے لیا گیا انٹرویو اہمیت کا حامل ہے اور یہ بات برحق ہے کہ بہار کے فکشن نگاروں نے ہی فکشن کی امامت کی ہے اور اس بات سے کسی کو انکار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اردو ادب میں در آئے کچھ مخصوص تنقیدی رویے کے پرموشن نے تنقید کو روشن نہیں ہونے دیا۔ سہیل انجم نے جس انداز میں ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کا قلمی خاکہ پیش کیا ہے وہ نہ صرف آپ کی علمی ادبی، تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں کا منظرنامہ ہے بلکہ اس خاکے نے مرزا غالب کی نثری شاعری (خطوط غالب) کی یاد تازہ کردی۔ معروف افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی سے متعلق گوشہ بڑا ہی معلوماتی ہے۔ ہماری ناقص معلومات کے مطابق وہ زود قلم نہیں تھے ان کے تحریر کردہ افسانوں کا سالانہ اوسط تین چار رہی ہوا کرتا تھا۔ لیکن ان کی سوچ کا کینوس بہت وسیع تھا اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ممبئی میں قیام کے دوران افسانے، ناول اور ڈرامے کے ساتھ فلموں کے لیے کہانیاں، نغمے اور مکالمے بھی لکھے۔ قابل مبارکباد ہیں جمیل اختر جنھوں نے بیدی کی تمام تخلیقات اور دیگر کارگذاریوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ محمد بشیر مالیر کوٹلوی، شائستہ فاخری، شکیل احمد اور حاذق فرید کے تحریر کردہ مضامین نے بیدی کی علمی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کے کئی در وا کیے ہیں۔ دوسری جانب مشہور ناول 'اداس نسلیں' کے خالق عبداللہ حسین سے اقبال خورشید کا مکالمہ بے حد پسند آیا۔ ساتھ ہی عبداللہ حسین کے فن اور شخصیت پر مذاکرہ، طاہر مسعود، ممتاز احمد خان، انیس اکرام فطرت، نصیر احمد ناصر اور غلام

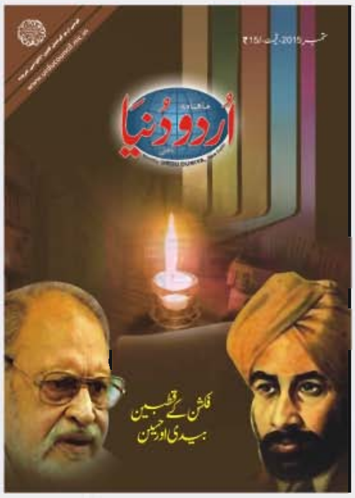

ابن سلطان کی تخلیقات نے گوشہ عبداللہ حسین کو مکمل کردیا ہے۔ بزرگ استاد شاعر بشر نواز (مرحوم) کو خراج عقیدت پیش کرتا معروف افسانہ نگار حمید سہروردی اور خان مقیم خان کے مضامین مرحوم کے شعری اور شخصی جہات کے کئی پہلوؤں کو روشن کرتے ہیں۔ اس نوعیت کے مضامین کی فوری اور بروقت اشاعت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپ کا ادارہ ہمہ وقت چاق و چوبند بھی رہتا ہے اور تمام حالات سے باخبر بھی۔ کتابوں پر تبصروں کی اشاعت کا سلسلہ نہ صرف قارئین کو بلکہ صاحب کتاب کو بھی مزید بہتر پڑھنے اور لکھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ لیکن اساتذہ کی کتابوں پر نام نہاد غیر مستند قسم کے 'خود ساختہ مبصروں' کے تبصرے ذہن پر گراں گزرتے ہیں۔

رونق شہری

ستمبر 2015 کا 'اردو دنیا' ہر لحاظ سے منفرد ہے۔ عبداللہ حسین، راجندر سنگھ بیدی، بشر نواز پر شامل مواد محفوظ کرنے کے لائق ہیں۔ سرور عثمانی ہمارے معاصرین میں تھے۔ ان کی رحلت سے اردو کی ادبی صحافت کو نقصان پہنچا ہے۔

نسیم اختر شاہ قیصر
شاہ منزل محلہ خانقاہ دیوبند

احقر 'اردو دنیا' کا ایک طویل عرصے سے قاری ہے اور مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں کہ رسالے نے نہ صرف کتابت وطباعت اور کاغذ کا معیار بلند کیا ہے بلکہ اس کے مضامین بھی متنوع، معتبر اور فکر انگیز ہوتے ہیں۔ ماہِ ستمبر 2015 کا شمارہ میرے سامنے ہے جو راجندر سنگھ بیدی اور عبداللہ حسین کی ادبی خدمات پر مشتمل ہے مشتاق احمد نوری کا صدف اقبال صاحبہ کے ذریعے لیا گیا انٹرویو کچھ اہم نکات پر مشتمل ہے خاص طور پر ان کا یہ جملہ ''تنقید کسی بھی دور میں ایماندار نہیں رہی'' معنی خیز ہے اور اس صورت حال کو اجاگر کرتا ہے جس کا شکار ہمارے نقاد رہے اور جس کی وجہ سے بہت سے باصلاحیت فنکار پذیرائی حاصل نہ کرسکے، عبداللہ حسین اور راجندر سنگھ بیدی پر مضامین اہم ہیں لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ عبداللہ حسین کے انتقال کے بعد ان کے ناول 'اداس نسلیں' کو بڑی اہمیت دی جارہی ہے اور یہ شاید غلط بھی نہ ہو، نہ تو ہم نے اس ناول کو پڑھا اور نہ اس سے پہلے اردو کے ہندوستانی ادبی رسائل وجرائد میں اس ناول کا اتنے وقیع انداز میں تعارف وتذکرہ دیکھا، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ عبداللہ حسین کے اس ناول پر بہت زیادہ یا اہم طریقے پر لکھا گیا ہو، اگر کہیں ضمناً تذکرہ ہوا ہو تو اس کے بارے میں گفتگو نہیں کرسکتا، بہرحال یہاں بھی ہمارا وہ مزاج کام کررہا ہے جو کسی کے مرنے کے بعد اس کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے، راجندر سنگھ بیدی کا 'گرم کوٹ' آج بھی افسانوی دنیا کا نمائندہ افسانہ ہے اور اس کی چمک ختم نہیں ہوئی ہے، تعارف وتبصرہ کا کالم بڑا وقیع ہے اور تبصرہ نگار اس کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ تبصرہ وتعارف کا حق ادا کرسکیں۔ جتنے کارآمد، مفید، معلوماتی اور تاریخی خطوط محترم ہاشم قدوائی صاحب کے ہوتے ہیں کسی دوسرے کے نہیں۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم
صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ویمنس کالج

ستمبر 2015 کا شمارہ بروقت باصرہ نواز ہوا۔ موضوعات کا تنوع اور چونکا دینے والے مضامین کی اشاعت اردو دنیا دہلی کا طریقہ امتیاز رہا ہے۔ اردو ادب کے اعلیٰ و معیاری درجات کے نصاب کے مقتضیات کی حصولیابی میں آپ کا یہ علمی جریدہ ہمیشہ سے مقبول خواص و عام رہا ہے۔ بیدی اور عبداللہ حسین دونوں اردو فکشن کی قدآور شخصیتیں ہیں کہ جن کے ذہن اور قلم نے انسانی نفسیات، جذبات واحساسات کی ترجمانی میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ بیدی اور عبداللہ حسین پر بھرپور گوشہ معلومات و اطلاعات کی ایک دنیا خود میں سموئے ہوئے ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم پر قلمی خاکہ بہت خوب ہے۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کو قلمی خراج عقیدت پیش کرنے والے مصنف کا جذبہ خلوص، شخصیت اور سائنسی فکر کے تئیں خیالات قابل رشک ہیں۔ بشر نواز پر بھی قابل قدر تحریریں شامل ہیں۔ غرضیکہ اردو دنیا موصول ہوتے ہی اس کی بقا اور ارتقا کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

زیبا خانم
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی

اردو دنیا ستمبر ماہ کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ اپنی عادت کے مطابق میں رسالے کو اداریے سے شروع کرتی ہوں اور محظوظ ہوتی ہوں۔ مشتاق احمد نوری صاحب سے صدف صاحبہ کی گفتگو علم افزا ہے۔ صدف صاحبہ نے اردو فکشن کے حوالے سے نہایت موزوں استفسار مشتاق

صاحب سے کیے ہیں۔ جن کے جوابات انھوں نے ادب کے ماضی حال اور مستقبل کو زیرنظر رکھ کر دیے ہیں۔ بہار اردو اکادمی کے حوالے سے مشتاق احمد صاحب کے منصوبات کو اللہ صحیح انجام دے۔ رسالے میں بیدی اور عبداللہ حسین کا گوشہ شائع کر کے جہاں ایک طرف آپ نے اردو کے دو نمائندہ فکشن نگاروں کو خراج عقیدت پیش کیے ہیں، وہیں دوسری طرف اپنے قارئین کو ان کی لا فانی تخلیقات کو مزید سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ جمیل اختر صاحب کا بیدی پر تیار کیا ہوا اشاریہ پسند آیا۔ یہ اشاریہ بیدی کی پوری زندگی اور ان کے کارناموں کا احاطہ کرتا ہے۔ 'بیدی کا افسانوی جہان' کے عنوان سے محمد بشیر صاحب کا مضمون مختصر مگر جامع ہے۔ اس طرح کے مختصر مضامین (جن میں باتیں موضوع بہ موضوع کی گئی ہوں) قارئین کو اکتاہٹ سے بچاتے ہیں۔

شمارے کے دونوں گوشوں کا اہتمام، ادارے کی قابل صد ستائش کارکردگی ہے۔

محمد ادریس فردوس

سلطان گنج، پٹنہ 6

ستمبر 2015 کا شمارہ نظروں کے سامنے ہے۔ انٹرویو کالم میں جناب مشتاق احمد نوری کا انٹرویو پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ صدف اقبال نے بہت اچھا انٹرویو لیا ہے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے 'ہماری بات' اور 'آپ کی بات' کالم سب سے زیادہ پسند ہے۔

حبیب الرحمن چغانی

حریم، ملت روڈ، دودھپور، سول لائنز، علی گڑھ

ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست 2015 نظرنواز ہوا۔ 'زندگی نامہ گوپی چند نارنگ' مرتبہ جمیل اختر پر ڈاکٹر وسیم بیگم کا تبصرہ بہت غور سے پڑھا۔ موصوفہ نے کہیں بھی اشاریے کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ اشاریہ کبھی انسائیکلوپیڈیا نہیں ہوسکتا۔ وسیم بیگم صاحبہ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

نائب مدیر کو یاد ہوگا میں نے اپنا ایک تبصراتی مضمون 'زندگی نامہ گوپی چند نارنگ: ایک جائزہ' ای میل کیا تھا۔ جب آپ سے فون پر گفتگو ہوئی تو آپ نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ ''ہم زندہ لوگوں کی سوانح نہیں چھاپتے ہیں۔'' میں نے استفسار کیا آپ نے مضمون پڑھ لیا ہے۔ پڑھ کر رائے قائم کریں تو بہتر ہوگا۔ میرا جائزہ سوانح کہہ کر مسترد کردیا اور محترمہ وسیم بیگم کا تبصرہ شامل اشاعت کرلیا۔ کیا آپ کے یہاں اشاعت کے دو پیمانے ہیں؟ تبصرہ پڑھ کر یہ واضح ہوگیا کہ 'اردو دنیا' محولہ کتاب پر صرف تعریف وتوصیف ہی کو شائع کرنا چاہتا تھا۔ مدیر کو اختیار ہے وہ جس مضمون کو چاہے شائع کرے اور جس کو چاہے رد کردے پھر عذر لنگ کی کیا ضرورت تھی۔

مجھے یقین ہے صحافتی دیانت داری کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ یہ خط ضرور شائع فرمائیں گے۔ اگر یہ خط اشاعت سے محروم رہا تو 'اردو دنیا' جیسے معتبر و مؤقر رسالے سے میرا اعتبار اٹھ جائے گا جس میں میرے بہت سے مضامین اور خطوط شائع ہو چکے ہیں۔

اطلاعاً عرض ہے میرا یہ مضمون 'تہذیب الاخلاق' علی گڑھ، اگست 2015 میں شائع ہوگیا ہے اور محققین و اشاریہ سازوں نے بہت پسند کیا ہے۔

خط لکھنے کا شکریہ! اردو دنیا میں تبصراتی مضامین نہیں شائع ہوتے ہیں کیونکہ رسالے میں تبصرہ کا الگ سے کالم موجود ہے اس لیے ہمیں معذرت کرنی پڑی۔ آپ کا خط من وعن شائع ہورہا ہے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل، ڈگری کالج، مورتاڑ، نظام آباد، تلنگانہ

'اردو دنیا' اگست بروقت موصول ہوا۔ سرورق پر ترنگا اور انڈیا گیٹ کی تصویر شائع ہوئی جسے دیکھ کر ہمارے دل و دماغ آزادی کے جذبے سے سرشار ہوگئے۔ اس شمارے میں عصمت چغتائی کے فکر وفن اور شخصیت پر 11 مقالے و مضامین شائع ہوئے اس سے عصمت کی شخصیت اور ادبی اسلوب وتکنیک اور خصوصیات سامنے آئیں ایک زمانے سے عصمت کو فحش نگار سمجھ کر لوگ نظرانداز کرتے تھے۔ ان کی تخلیقات کو پڑھنے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن آج ملک کی جامعات کے نصاب میں عصمت چغتائی کو شامل کیا گیا ہے اور پڑھا جارہا ہے۔

نور محمد جنیدی

شولاپور، (مہاراشٹر)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ ہر بار کی طرح اس بار بھی عمدہ ہے۔ مبارک باد اردو سے محبت کرنے والے ہندوستان میں ایسے کتنے حضرات ہیں۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ برائے نام چاہنے والے بہت اور عملی طور پر چند فی صدی 'اردو دنیا' کو ایسے کتنے حضرات خرید کر پڑھتے ہیں۔ ہر شہر کی کتنی دکان میں اردو دنیا کی کتنی کاپیاں آتی ہیں۔

شمیم اعظمی

حاجی باغ، نزد آغا مسجد، گورکھپوری

اگست کے شمارے میں 'گوشۂ عصمت چغتائی' کے تحت شائع ہونے والے یوں تو سب ہی مضامین لائق ستائش ہیں لیکن جمیل اختر، ذکیہ مشہدی اور صبیحہ انور کے مضامین بالخصوص پسند آئے۔ ان مضامین میں عصمت کی زندگی اور ان کے فکر وفن کے ہر پہلو پہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں نسوانی کرداروں اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی جنسی و نفسیاتی کیفیات کو جس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی مثال دوسرے قلم کاروں کے یہاں نہیں ملتی۔

آر۔ اے۔ صدیقی

بہرائچ یوپی

ماہ اگست کا شمارہ 'اردو دنیا' میں عصمت چغتائی فکر و فن پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ خاص کر پیج نمبر 27 پر 'عصمت آپا کا سفر بہرائچ ایک بازیافت' کے لیے قلمکار ڈاکٹر صبیحہ انور اور آپ کا بہت بہت شکریہ، مضمون نگار سفرنامہ اسپشلسٹ لگتی ہیں۔ 1987 کے لکھنؤ سے بہرائچ تک کے سفر کو 2015 میں بھی تازگی سے بھر دیا ہے، پڑھ کر ایسا لگا جیسے 28 سال پرانی بات نہ ہوکر آج کا سفر ہو مضمون نگار نے عصمت کے گزارے ایک ایک قدم، ایک ایک پل کا ذکر کر کے جس خوبصورتی سے روبرو کرایا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، عصمت کے ہاتھوں کا لکھا بمبئ سے بھیجا گیا خط اور اس رسالے میں چھپی تصویر خود ہی بول رہی ہے اور گواہی دے رہی ہے کہ مضمون نگار نے یادوں کو کس طرح سے محفوظ رکھا اور اردو دنیا کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا۔ احسان مند ہوں، ہندوستان کے سب سے پچھڑے ضلع بہرائچ یوپی کا نام بھی روشن ہوا، یہ فخر کی بات ہے۔ درگاہ شریف میں ڈاکٹر صبیحہ نے اچھل اچھل کر کمرک کو توڑا تو عصمت نے سید سالار مسعود غازی کو بوائے فرینڈ کہا ایسی تمام باتیں دل کو چھوگئیں۔ اس مضمون کو کئی بار پڑھا ہر بار صبیحہ انور اور ایڈیٹر کے لیے دل سے شکریہ کی آواز نکلی، کور پیج سے لے کر پورا رسالہ پھولوں کا گلدستہ لگا جس کی خوشبو دنیا میں اردو کی شکل میں پھیلے گی۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

نزد مولانا آزاد کالج، نیشنل کالونی، پلاٹ نمبر 34 اورنگ آباد

ماہنامہ 'اردو دنیا' جولائی 2015 کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ انتخاب کا ہر حصہ بہتر ہے۔ سرگرمیاں اور خبرنامہ پورے ملک کا احاطہ کرتے ہیں۔ زیرنظر شمارہ میں ایک مضمون بنام 'اردو کی چند کم معروف شاعرات' پڑھا۔ مصنفہ کی تحریر ہے ''جہانگیر کی بیٹی زیب النسا بیگم کا تخلص مخفی کیا جاتا ہے'' لیکن جہاں تک معلومات کا تعلق ہے مورخین، مصنّفین نے بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی دختر نیک اختر لکھا ہے۔ شہزادی زیب النسا دِل رس بانو بیگم کی پہلی اولاد تھی۔ مولانا شبلی نعمانی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اور دیگر مورخین نے زیب النسا بیگم مخفی کو اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی لکھا ہے۔ اسے تیموری شہزادیوں کے علمی چمنستان کا گل سرسبد کہا ہے۔ ■

خواجہ عبدالمنتقم

بھارت کا آئین اور انسانی حقوق

ہندوستان کی آزادی سے قبل 22 جنوری، 1947 کو قانون ساز اسمبلی نے ایک تجویز پاس کی تھی جس میں ان اغراض ومقاصد کا ذکر کیا گیا تھا جنھیں ہندوستان کا آئین وضع کرتے وقت ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ اس تجویز میں اگرچہ انسانی حقوق جیسے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے تھے لیکن تجویز کے متن میں یہ جذبہ مکمل طور پر مضمر تھا۔ دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے قانون میں اس بات کی ضمانت دی جائے کہ تمام لوگوں کو سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف ملے، انھیں آزادیِ خیال میسر ہو، وہ اپنے دین دھرم اور مذہب وعقیدے کے مطابق عبادت کر سکیں، اپنی پسند کا پیشہ اختیار کر سکیں اور اپنی انجمنیں بنا سکیں البتہ اس کے ساتھ یہ فقرۂ شرطیہ ضرور لگا دیا گیا تھا کہ ایسی آزادی، اخلاق عامہ اور مفاد عامہ کا خیال رکھتے ہوئے عطا کی جائے گی۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یعنی آئین کو وضع کرنے کے لیے بہت سی کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں اور ان کمیٹیوں کی رپورٹ کی بنیاد پر ڈاکٹر امبیڈکر کی چیئرمین شپ میں 19 اگست، 1947 کو ایک ڈرافٹنگ کمیٹی وجود میں آئی۔ فروری 1948 میں اس قانون کا مسودہ (ڈرافٹ) شائع کیا گیا۔ 26 نومبر، 1949 کو آئین کو منظوری دے دی گئی اور اس کا مکمل اطلاق 26 جنوری، 1950 کو ہوا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آئین کی دفعات 5، 6، 7، 8، 9، 60، 324، 366، 367، 379، 380، 388، 391، 392، 393 اور 394 چھبیس نومبر، 1949 کو ہی نافذ العمل ہو گئی تھیں جبکہ آئین کی باقی دفعات کا اطلاق 26 جنوری 1950 کو ہوا۔

بھارت کے آئین کے نہ صرف متن میں بلکہ اس کی تمہید میں بھی اُن تمام باتوں کا مکمل خیال رکھا گیا ہے جو ہمارے آئین کے واضعین، آئین کے متن میں شامل کرنے کے خواہاں تھے۔ یہ تمہید اس طرح ہے۔

تمہید (Preamble/उद्देशिका)

''ہم، بھارت کے عوام، بھارت کو ایک مقتدر سماج وادی سیکولر عوامی جمہوریہ بنانے کے لیے،
اور اس کے تمام شہریوں کو:
سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف،
خیال، اظہار، عقیدہ، مذہب اور عبادت کی آزادی،
بہ اعتبار حیثیت اور موقع مساوات
حاصل کرانے کے لیے،
اور اُن سب کے مابین
فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد
اور سالمیت کو یقینی بنانے والی اخوت
کو فروغ دینے کے لیے
متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہوئے اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج مورخہ 26 نومبر، 1949 (متی مارگ شیرش شُکلا سپتمی، سموت 2006 وکرمی) کو ذریعہ ہٰذا اس آئین کو اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔''

تمہید پر محض ایکِ طائرانہ نظرِ ڈالنے سے ہی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آئین کی رو سے بھارت میں ایک ایسی جمہوریت کا قیام مقصود تھا اور ہے جس میں سبھی لوگوں کو مذہبی آزادی، آزادیِ خیال وحق مساوات حاصل ہو اور اُن کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں انصاف کیا جائے۔ انصاف میں معاشرتی، معاشی اور سیاسی انصاف بھی شامل ہے۔ اس طرح آئین کی تمہید آئین کے غرض وغایت کی واضح طور پر عکاسی کرتی ہے اور تمہید کے فوراً بعد آئین کا مکمل متن تمہید میں درج اغراض کے لیے تائیدی مواد فراہم کرتا ہے۔ ویسے بھی کسی بھی قانون میں تمہید اس غرض سے شامل کی جاتی ہے تا کہ اس بات کا پتہ لگایا جا سکے کہ مقننہ یا قانون ساز اداروں کا ایسا قانون لانے کا کیا منشا اور کیا غرض وغایت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آئین یا کسی قانون میں کوئی دفعہ واضح نہیں ہوتی تو اس کی صحیح تعبیر کے لیے تمہید کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

آیئے اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ جہاں تک بھارت کے آئین میں انسانی حقوق کے تحفظ کا سوال

ہے تو اس کے جز 3، جو بنیادی حقوق سے متعلق ہے، میں شامل دفعات کی روشنی میں بلاشبہ اور بلا مبالغہ قانونی اعتبار سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آئین کا جز 3 انسانی حقوق کا ایک مکمل منشور ہے البتہ یہاں پر یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ آئین میں انسانی حقوق کو بنیادی حقوق کا نام دیا گیا ہے۔ کسی بھی ملک کے آئین میں بنیادی حقوق کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو جسمانی نظام میں شہ رگ کی۔ انسانی حقوق عطا کرنے کی غرض اور واحد غرض یہی ہوتی ہے کہ عوام کے تمام شہری، سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی و مذہبی حقوق کی حفاظت کی جائے۔ کون سا ملک کتنا مہذب اور کتنا ترقی یافتہ ہے اس بات کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں عوام کو کس حد تک بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ ہندوستان میں صرف ان بنیادی حقوق کو انسانی حقوق کو قانونی درجہ دیا گیا ہے جو انسانی حقوق تحفظ ایکٹ، 1993 کی دفعہ 2(د) میں دی گئی انسانی حقوق کی تعریف کی حدود میں آتے ہیں یعنی کسی فرد کی زندگی، آزادی، مساوات اور عظمت کی نسبت ایسے حقوق جن کی آئین کی رو سے ضمانت دی گئی ہو یا جو بین الاقوامی معاہدوں میں شامل کیے گئے ہوں اور بھارت میں عدالتوں کے ذریعے قابل نفاذ ہوں۔

اس کے علاوہ آئین میں مملکت کی حکمت عملی کے ہدایتی اصولوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان اصولوں میں بھی مختلف انسانی حقوق کے تحفظ کی بات کہی گئی ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ ہر انسانی حق بھارت کے آئین کی رو سے بنیادی حق نہیں ہے۔ مثلاً انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیے کے مطابق جائیداد کا حق ایک انسانی حق ہے لیکن بھارت کے آئین میں یہ حق بنیادی حق کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔

بھارت کے آئین کے جز 3 (دفعہ 12 تا 35) میں بنیادی حقوق کی شکل میں انسانی حقوق کے تحفظ کی بابت توضیعات کی گئی ہیں۔ دفعہ 13 میں بنیادی حقوق کے تناقض یا ان کو کم کرنے والے قوانین کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ دفعہ 14 میں قانون کی نظر میں مساوات اور قانون کے مساویانہ تحفظ کی بات کہی گئی ہے۔ دفعہ 15 میں مذہب، نسل، ذات، یا جنس یا مقام پیدائش کی بنا پر کسی بھی طرح کے امتیاز کی ممانعت کی گئی۔ دفعہ 16 میں سرکاری ملازمت کے لیے سبھی کو مساوی مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔ دفعہ 17 کے ذریعہ چھوت چھات کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ دفعہ 18 کے ذریعہ خطابات کا خاتمہ کیا گیا ہے، دفعہ 19 میں تقریر اور اظہار خیال کی آزادی بشمول پریس کی آزادی، امن پسندانہ طریقے سے اور غیر مسلح طور پر جمع ہونے، انجمنیں یا یونین قائم کرنے، بھارت میں کہیں پر بھی آنے جانے اور کہیں پر بھی بود و باش اختیار کرنے، کوئی بھی پیشہ اختیار کرنے یا کاروبار کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے۔ دفعہ 20 میں ایک ہی جرم کے لیے دوبار مقدمہ چلانے یا دوبار سزا دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ دفعہ 21 میں جان اور شخصی آزادی کے تحفظ کو یقینی بنایا گیا ہے اور واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو اس کی جان یا شخصی آزادی سے صرف قانون کے مطابق ہی محروم کیا جاسکتا ہے نہ کہ دیگر طور پر۔ دفعہ 22 میں کسی بھی ایسے شخص کو جسے گرفتار کیا گیا ہو، گرفتار کرنے کی وجوہات بتانا ضروری ہے ورنہ اسے

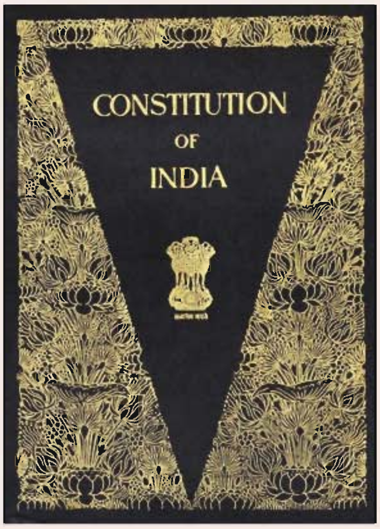

دفعہ 29 میں اقلیتوں کو اپنی زبان، رسم الخط اور ثقافت کو محفوظ رکھنے کا حق دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ کسی بھی سرکاری ادارے میں یا کسی ایسے ادارے میں، جسے سرکار سے مالی امداد ملتی ہو، داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات، زبان، یا ان میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔ دفعہ 30 میں اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق عطا کیا گیا ہے۔ اگر متذکرہ بالا حقوق میں سے کسی بھی حق کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو متاثرہ شخص دفعہ 32 کے تحت سپریم کورٹ سے اور دفعہ 226 کے تحت ہائی کورٹ سے رجوع کر سکتا ہے۔

حوالات میں نہیں رکھا جاسکتا یعنی گرفتاری کی وجہ سے جس قدر جلد ہو سکے آگاہ کیا جانا چاہیے اور گرفتار شدہ شخص کو قانونی پیشہ ور سے صلاح لینے اور پیروی کروانے کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں ہر ایسے شخص کو جسے گرفتار کیا گیا ہو یا حوالات میں رکھا گیا ہو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر قریب ترین مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا جانا چاہیے۔ یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ چوبیس گھنٹے کی مدت میں سفر کی مدت یعنی مقام گرفتاری سے عدالت تک پہنچنے میں صرف ہونے والا وقت شامل نہیں ہے۔ دفعہ 23 میں انسانوں کی تجارت اور جبری خدمت کی ممانعت کی گئی ہے۔ دفعہ 24 میں بچوں کو کارخانوں وغیرہ میں مامور کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ دفعہ 25 میں مذہب کی آزادی کی بات کہی گئی ہے۔ دفعہ 27 کے مطابق کسی شخص کو ایسے ٹیکس ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جن کی آمدنی کسی خاص مذہب یا مذہبی فرقے کی ترقی پر صرف کی جائے۔ دفعہ 30, 29 ثقافتی اور تعلیمی حقوق کے تحفظ کو یقینی بناتی ہیں۔ دفعہ 29 میں اقلیتوں کو اپنی زبان، رسم الخط اور ثقافت کو محفوظ رکھنے کا حق دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ کسی بھی سرکاری ادارے میں یا کسی ایسے ادارے میں، جسے سرکار سے مالی امداد ملتی ہو، داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات، زبان، یا ان میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔ دفعہ 30 میں اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق عطا کیا گیا ہے۔

اگر متذکرہ بالا حقوق میں سے کسی بھی حق کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو متاثرہ شخص دفعہ 32 کے تحت سپریم کورٹ سے اور دفعہ 226 کے تحت ہائی کورٹ سے رجوع کر سکتا ہے۔

آئین کے جز 4 میں شامل کیے گئے حکمت عملی کے ہدایتی اصولوں (دفعہ 36 تا دفعہ 51) میں لوگوں کی بہبودی کے لیے ایک بہتر نظام قائم کرنے، مساوات مرد و زن جس میں دونوں کو برابر مزدوری کا حق بھی شامل ہے، مزدوروں کو قابل گزارہ اجرت دینے، صنعتوں کے انتظام میں کام گروں کے اشتراک، تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ، بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم، درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں اور دوسرے زیادہ کمزور طبقوں کے تعلیمی و معاشی مفادات کے فروغ، غذائیت کی سطح اور معیارِ زندگی بلند کرنے اور صحت عامہ کو ترقی دینے، زراعت اور افزائش حیوانات، ماحولیاتی تحفظ اور جنگلی جانوروں کی حفاظت، قومی اہمیت کی یادگاروں اور مقامات اور اشیا کی حفاظت، بین الاقوامی امن و سلامتی کے فروغ وغیرہ کی بات کہی گئی ہے۔

اس کے علاوہ آئین کی دفعہ 51 الف جو بنیادی فرائض سے متعلق ہے اس میں بھی بھائی چارے کے فروغ، خواتین کی تعظیم، ملک کی ملی جلی ثقافت اور اس کی برقراری، قدرتی ماحول کو، جس میں جنگلات، جھیلیں، دریا اور جنگلی جانور شامل ہیں محفوظ رکھنے اور جانوروں کے ساتھ محبت و شفقت کا جذبہ رکھنے، انسان دوستی، قومی جائداد کا تحفظ کرنے اور تشدد سے گریز کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

■

Khwaja Abdul Muntaqim, H-3, Dharma Apts., 2-I.P. Extn. Delhi 110092, Ph.: 011-42271258
E-mail.: ahmkhwaja2007@yahoo.co.in

احمد صغیر

زبان رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جارہی ہے: ناوک حمزہ پوری

کثیر التصانیف شاعر و ادیب ناوک حمزہ پوری کا نام محتاج تعارف نہیں۔ بہار کے تاریخی شہر شیر گھاٹی میں رہ کر انھوں نے شعر و ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ خصوصاً صنف رباعی میں انھوں نے ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ نادر تشبیہات اور عام فہم الفاظ کے مناسب استعمال نے ان کی رباعیوں کو ایک وقار و اعتبار عطا کیا ہے۔ 82 برس کی عمر میں بھی بینائی کے زائل ہونے کے باوجود وہ فعال ہیں اور لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ افسانہ نگار احمد صغیر کے ان سے لیے گئے انٹرویو کے اقتباسات: (ادارہ)

احمد صغیر: اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتایئے؟

ناوک حمزہ پوری: خاندانی جڑیں مدینہ میں پیوست ہیں۔ یہ سلسلہ سید الشہدا حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے۔ بزرگوں نے پہلی ہجرت کی تو نیشاپور (ایران) آبسے۔ دوسری ہجرت غالباً جہانگیر یا شاہجہاں کے وقت میں کی تو دلّی (ہندوستان) آئے۔ دو بھائی اپنے وقت کے معروف بزرگ تھے۔ شاہ عبداللطیف اور شاہ عرب۔ اورنگ زیب بہ نفس نفیس شاہ عبداللطیف کی خدمت میں گیا اور بعض مواضعات جاگیر میں دینا چاہتا تھا۔ حضرت نے فی البدیہہ فرمایا:

شاہ مارا دہِ دہد منت نہد
رازق ما رزق بے منتِ دہد

واقعات عالمگیری میں واقعہ لکھا ہوا ہے بعد میں حضرت شاہ عرب کو چند مواضعات دے کر حضرت قمر علی سلطان کی دیکھ بھال کے لیے شیر گھاٹی (حمزہ پور) بھیج دیا گیا۔ اس وقت حمزہ پور نرا جنگلستان تھا۔ آپ نے مورہر ندی کے مشرقی پہلو پر سکونت اختیار کی۔ انھیں کے اخلاف میں حضرت برہان علی نے حمزہ پور آباد کیا۔ ان کا مزار حضرت قمر علی سلطان کے احاطے میں تاحال موجود ہے۔ الغرض حمزہ پوری سادات انھیں حضرت شاہ عرب کی اولاد در اولاد ہیں۔ جن کا مزار شمالی محلہ کی قبرستان میں اب بھی موجود ہے۔ اسی خاندان کے چشم و چراغ حضرت علامہ قوس حمزہ پوری تھے جو اپنے وقت کے اُردو، فارسی و عربی کے فاضل اجل تھے اور ناوک حمزہ پوری انھیں کی نشانی ہیں۔ ایک اور تخصیص چاہیے تو لکھ لیجیے اسی خاندان کی 35 ویں و 36 ویں پیڑھی پر یہ خاندان سر سید احمد کے خاندان سے مل جاتا ہے۔

اص: اپنے تعلیمی سفر کی تفصیل بتایئے؟

ناوک حمزہ پوری: تعلیمی سفر کی تفصیل کیا بتاؤں۔ حمزہ پوری سادات کا عجیب حال تھا اور کسی نہ کسی حد تک اب تک ہے۔ حالانکہ اب پورا کنبہ علم پدر بھلا بیٹھا ہے۔ پہلے کے لوگ باپ دادا سے سینہ بہ سینہ چلنے والے علم سے اپنے مقدور بھر حصہ لیتے تھے اور آئندہ زندگی اسی کے سہارے کھیپ لے جاتے تھے چنانچہ 25 ذی الحجہ 1351 ہجری (21 اپریل 1933) میں پیدا ہوا۔ ہوش سنبھالنے پر والدہ ہی نے حرف شناسی سکھائی۔ قاعدہ بغدادی سے لے کر پارہ عم (30 واں پارہ) کی ابتدائی صورتیں پڑھائیں۔ دینیات کی ابتدائی جانکاری دی۔ کلمات سے لے کر روزے نماز سے متعلق احکامات اور آیات سکھائیں۔ اپنے ماموں جمیل احمد صاحب بستی کے مکتب میں سرکاری معلم تھے۔ انھیں کے سپرد کر دیا چنانچہ لور پرائمری انھیں کے زیر سایہ پاس کیا۔ اُس کے بعد والدہ نے خاموشی سے مجھے نزدیک کے گاؤں بھدیہ بھیج دیا۔ بابو مشتاق علی خاں رئیس بھدیہ کا طوطی بولتا تھا ان دنوں۔ اور وہ خوش بختی سے نامور زمیندار تھے نیز والد صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ان کے والد کے وقت ہی سے بھدیہ میں ایک مڈل اسکول کھل گیا تھا۔ باہری بچے بھی پڑھتے تھے۔ اسکول کا دو ہوسٹل بھی تھا۔ ایک ہندو بچوں کے لیے اور ایک مسلمان بچوں کے لیے۔ بیس بیس طلبا دونوں فرقے کے ان میں رہتے تھے اور ان کے کھانے پینے، رہنے سہنے کا تمام نظم تھا۔ میری والدہ نے سکھلایا تھا کہ بابو مشتاق علی خاں کو کہہ دینا کہ والد نے بھیجا ہے۔ اسکول میں نام لکھوا دیجیے۔ میں نے جا کر یہ رٹا رٹایا سبق دہرا دیا اور بابو صاحب نے ہیڈ ماسٹر کو بلا کر مجھے ان کے حوالے کر دیا پھر سارا نظم انھوں نے ہی کیا۔ خوش بختی سے ہیڈ ماسٹر بھی شیر گھاٹی ہی کے تھے کبیر الدین پولس انسپکٹر کے صاحب زادے خود وکالت پاس تھے لیکن قسمت میں معلمی لکھی تھی۔ بھدیہ مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ انھوں نے ہی نام رجسٹرڈ کر دیا اور اپنی سمجھ سے ایک اٹکل پچو تاریخ پیدائش 15 جنوری 1938 درج کر دی۔ اس ریکارڈ پر ہم نے 1948 میں بھدیہ مڈل اسکول سے مڈل کا بورڈ امتحان پاس کیا۔

بھدیہ کا ایک واقعہ چھوڑنا مناسب نہیں لگتا۔ بابو صاحب (بابو مشتاق علی خاں) کی کچہری جیسی سفید براق عمارت میں نے کہاں دیکھی تھی۔ ایک دن وہاں صبح ہی صبح گیا۔ قریب میں اڑہل کے سرخ سرخ پھول کھلے تھے۔ ایک پھول توڑ کر دیوار پر بسم اللہ الرحمن رحیم لکھ دیا اور چپ چاپ کھسک آیا۔ دربار لگا تو ہنگامہ ہو گیا کہ یہ کس نے لکھا۔ پکڑو مارو کس نے یہ گندگی پھیلائی۔ ایک شخص نے مجھے لکھتے دیکھا تھا۔ یہ راز کھول دیا کہ ایک 'تلبیلی' نے لکھا ہے۔ وہاں طالب علم کو تلبیلی ہی کہتے تھے۔ دو تین کارندے ہوسٹل پہنچ گئے اور مجھے گرفتار کر کے دربار میں لے گئے۔ ایک طرف بابو صاحب بیٹھے تھے دوسری طرف منیجر بابو علی خاں بیٹھے تھے، تیسری طرف ایک لالہ جی اپنا کھاتہ پتر لے کر بیٹھا تھا۔ علی خاں نے گرج کر پوچھا کیا نام ہے تمھارا؟ میں نے نام بتایا۔ دوسرا سوال یہ ہوا کہ یہ گندگی تمھیں نے پھیلائی ہے۔ میں نے سوال کر دیا کہاں ہے گندگی؟ علی خاں نے

’بسم اللہ‘ کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ کیا ہے؟
میں نے جوابی سوال کر دیا۔ ’’بسم اللہ گندگی ہے؟‘‘
بابو مشتاق علی مسکرائے۔ فرمایا‘ منیجر صاحب آپ کو پتا ہے آپ حضرت مولانا قوس صاحب کے صاحبزادے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ عقل گدّی میں ہو تو سمجھنا چاہیے 1946-47 میں ادب کا یہ پہلا انعام تھا میرے لیے۔ مجھے پانچ روپے دیے گئے پانچ روپے پر نہ جاؤ کہ اس زمانے میں پانچ روپے کی کیا قدر تھی؟

1948 میں وہیں سے بورڈ کا مڈل امتحان پاس کر کے گھر چلا آیا۔ شیر گھاٹی رنگ لال ہائی اسکول سے 1953 میں میٹرک پاس کیا۔ اسی درمیان 1953 میں میٹرک کا رزلٹ آنے سے پہلے 6 اپریل کو شادی ہوگئی۔

میٹرک کا رزلٹ آنے پر گیا کالج میں داخلہ لے لیا۔ گیا کالج میں شعبۂ اُردو میں دو استاد تھے۔ پروفیسر شاہ شکیل احمد غالباً عقیدۃً قادیانی تھے۔ دوسرے نوجوان استاد سید محمد حسنین تھے۔ بہار میں اردو میں سب سے پہلے پی ایچ ڈی کی ڈگری انھوں نے ہی حاصل کی تھی۔ قسمت سے دونوں حضرات قوس حمزہ پوری کے معترف و مداح تھے لیکن حمزہ پور گھر کی جو مالی حالت تھی وہ ایسی نہ تھی کہ کالج کی پڑھائی نیز گیا میں رہنے سہنے کا بوجھ برداشت کرتی۔ چنانچہ ٹیوشن کرنا پڑی۔ شروع شروع میں جناب ہدایت حسین خاں پیشکار (مرار پور) کے بچوں کو پڑھانے لگا اور مرار پور میں رہ کر کالج آنے جانے لگا۔ مرار پور سے گیا کالج کا فاصلہ طویل تھا اور آتے جاتے ہی تھک جاتا تھا۔ چنانچہ معروف گنج کیپٹن شاہ جہاں خاں کے صاحبزادگان کو پڑھانے پر مامور ہو گیا۔ آزاد ہند فوج کے کیپٹن کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ سیاسی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ بڑی اچھی انگریزی جانتے تھے۔ اردو، فارسی حمزہ پوری اساتذہ سے پڑھے ہوئے تھے اور اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ قدرے بخیل تھے۔ مجھے صرف کھانا پینا دینے پر راضی ہوئے۔ میں نے بہت زور مارا تو دس روپے ماہوار تک ہونے کو راضی ہوئے اور پڑھنے والے تین بچے اور ایک لڑکی۔ انھیں دنوں گرواسیٹ سے شاہ جہاں خاں نے الیکشن جیتا اور جیت کی خوشی میں پنڈت نہرو کو خط لکھنا چاہتے تھے۔ مجھے بلا کر کہا کہ پنڈت نہرو کو خط لکھنا ہے۔ ایک دعائیہ شعر بتایئے۔ تم سلامت رہو ہزار برس۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار کی طرح کا شعر میں نے معذرت چاہی ’میں شاعر نہیں ہوں‘ وہ چونکے شاعر نہیں ہو۔ علامہ قوس حمزہ پوری کے فرزند ہو اور شعر نہیں کہہ سکتے۔ میں نے عاجزی سے کہا کہ والد کو درمیان میں لانا ٹھیک نہیں۔ دراصل یہ بات اپنی جگہ سچ ہے کہ میں شاعری نہیں جانتا اور پھر جس نوعیت کا شعر آپ چاہتے ہیں اس پایے کا شعر کہنا تو کار دارد والی بات ہے ہی۔ یہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ چارپائی پر افسردہ لیٹ گیا تھوڑا سوچنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد جیسے کوندا لپکا اور ایک شعر ذہن میں آ گیا:

ہو ترے واسطے ہر صبح پیام عشرت
اور اس صبح درخشاں کی کبھی شام نہ ہو

شعر سن کے کیپٹن صاحب بہت مسرور ہوئے۔ بولے دیکھیے میں کہتا نہ تھا‘ بہت اچھا شعر نکال لائے آپ۔ واہ وا‘ واہ وا دیر تک کرتے رہے۔ یہ پہلا باضابطہ شعر پنڈت نہرو کو خط میں لکھا گیا۔ مجھے خاموشی سے کیپٹن صاحب نے پچیس روپے ایک لفافے میں رکھ کے دیے کہ یہ آپ کا انعام ہے۔ اس زمانے میں یہ بھی ایک بڑی رقم تھی اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ دوسرا ادبی انعام تھا، اس کے بعد مہینوں تک جو بھی پڑھا لکھا آتا گیا، اسے کیپٹن صاحب یہ شعر سناتے رہے اور داد و تحسین لوٹتے رہے۔ بسمل سنسہاروی نے بھی بڑی تعریف کی۔ شمس گیاوی نے کہا کہ یہ لڑکا ایسا شعر کیا کہے گا؟ قوس صاحب کا شعر ہوگا۔ لڑکے نے اپنا کہہ کے آپ کو دے دیا ہے۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد کپتان صاحب نے مجھے یہ بات بتائی لیکن یہ بھی کہا کہ شمس صاحب حاسدانہ طبیعت کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں دنوں گیا کالج کی اُردو مجلس نے ایک رسالہ شائع کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ نظم و نثر کی کئی صنفوں میں طلبا سے تخلیق مانگی گئی تھی۔ ایک نظم بعنوان ’’مہہ تمام ابھی کتنی رات باقی ہے؟‘‘ میں نے بھی داخل کی تھی۔ اس پر پہلا انعام ملا اور ان دنوں مجاز لکھنوی کا مجموعہ چھپ کے تازہ تازہ آیا تھا۔ اسی کا نسخہ بطور انعام پا کے مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔

اص: آپ اپنی ادبی زندگی کے بارے میں بتایئے؟

ناوک حمزہ پوری: شاعری کے بارے میں عرض کر دوں کہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے باضابطہ شاعری سیکھی نہیں تھی۔ 1945 کے آس پاس سے ہی اکثر بستی کے وہ بزرگ جو ٹوٹی پھوٹی شاعری کرتے تھے اور کبھی کبھار والد کو دکھلاتے تھے بعض موقعے پر والد کے پاس نہ جا کر مجھے ہی کہتے تھے کہ ذرا دیکھو تو بابو۔ اس کو تم ہی ٹھیک کر دو اور اپنی پسند و ناپسند کے مطابق میں کبھی ادھر ادھر کر دیا کرتا تھا۔

1949 کی بات ہے شیر گھاٹی کے ایک تاجر یٰسین شاہ نے بہار سنگیت کمپنی کے نام سے ایک نوٹنکی کمپنی بنائی تھی۔ یوں بنیادی طور پر وہ بیڑی کا تاجر تھا اور درجنوں کاریگر اس کے یہاں کام کرتے تھے۔ غالباً آپ جانتے ہوں گے کہ نوٹنکی میں تمام ڈرامے منظوم ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا بعض منظوم مکالمے کو نثر کر دینے کی ضرورت پڑتی تھی اور کبھی نثری مکالموں کو منظوم کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ میرے ہی گاؤں کا محی الدین نام کا ایک ہم عمر مجھے یٰسین شاہ کے پاس لے گیا۔ اس نے بڑی آؤ بھگت کی اور مجھ سے کہا کہ میں آپ کو اپنی کمپنی کا ڈائرکٹر بنا دوں گا۔ آپ میرا یہ کام کر دیجیے۔ لڑکپن کی عقل ڈائرکٹر بڑا چمکیلا نام لگا۔ سو میں بھی اس کی کمپنی سے وابستہ ہو گیا اور تین چار سال اس کی ہر طرح سے خدمت کی اور اس نے بھی میری بڑی قدردانی کی۔ یوں شعر

رباعیات

دیکھو تو ذرا فطرتِ انساں کا تضاد
مجموعۂ اضداد ہے یہ آدم زاد
پل بھر میں یہ جبریل امیں کا شاگرد
دم بھر میں ہے ابلیس لعیں کا استاد

جب تک کہ نہ ہو جنون میرے بھائی
ٹپکے نہ جبیں سے خون میرے بھائی
ہوتا نہیں شاہکار کوئی تخلیق
فن ہے کوئی تیل نون میرے بھائی

تسلیم کہ کہو رموزِ فن سے آگاہ
لیکن ہے رباعیات کہنا جاں کاہ
کس پھیر میں پڑ گئیل ہو تم بھی ناوک
لاحول ولا قوہ الا باللہ

ایمان ہے روح کی ترقی کا ستون
اخلاق ہے تہذیب کی شریان کا خون
ساتھ ان دونوں کے ہو اگر علم و ہنر
حاصل ہو تجھے معجزہ کن فیکون

یہ ٹال مٹول، اگر مگر جانے دے
یہ پیش و پس زیر و زبر جانے دے
یا تو ہی آ کے میرے دل میں بس جا
یا اپنے دل میں گھر کر جانے دے

تن جاؤ اگر تو سوئی بن جاتی ہو
من جاؤ تو چھوئی موئی بن جاتی ہو
پتھر بنتے بھی میں نے دیکھا ہے تمھیں
دیکھا ہہ یہ بھی کہ روئی بن جاتی ہو

کلیوں کے چٹکنے کی صدا لگتی ہو
پھولوں کے مہکنے کی ادا لگتی ہو
لگتا ہے کبھی یوں کہ ہو ساون کی گھٹا
پھاگن کی کبھی مست ہوا لگتی ہو

گوئی کا ملکہ جلا پاتا گیا۔

لیکن ہوا یہ کہ آئی اے پاس کرتے کرتے میں ایک بچے کا باپ بھی ہو گیا۔ گھر کی مالی حالت کو دیکھتے ہوئے مجھے اب بیوی بچوں کی ضروریات کے لیے کچھ کام کرنا ضروری ہو گیا۔ یوں 1955 میں آئی اے کا رزلٹ آتے ہی میں شیرگھاٹی سے نو دس میل دور آمس' مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گیا۔ کمیٹی کا اسکول تھا سکریٹری بل بھدر سنگھ قدرے متعصب اور سخت مزاج تھا۔ یوں دسمبر 1955 میں نوکری چھوڑ کر ہزاری باغ چلا گیا۔ وہاں کسمار مڈل اسکول میں بحال ہو گیا۔ یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا اسکول تھا۔ چار پانچ مہینے وہاں رہا۔ اس کے بعد گانڈے (گریڈیہہ) تبادلہ ہو گیا۔ چھ سات برس وہاں رہا پھر تیلوڈیہہ مڈل اسکول سلیا، پدما اسکول اس کے بعد سونداون سیڈی سی مڈل اسکول اور اس کے بعد سنوڈیہہ (کوڈرما) مڈل اسکول میں تبادلہ ہوا۔ ملازمت ہی کے دوران ڈپ ان ایڈ بھی کیا۔ بی اے پاس بھی کیا۔ ایم اے بھی پاس کیا اور جنوری 1998 میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر گھر آ بیٹھا۔

ملازمت کے دوران ہی گانڈے مڈل اسکول ہی کے زمانے میں کچھ غزلیں اور قطعات و منظومات کہہ رکھی تھیں۔ ایک مولانا ریاض صاحب تھے ابھی متعلم ہی تھے۔ دہلی کے کسی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ میرے ایک طالب علم محمد یونس انصاری کے رشتے دار تھے۔ جب گھر آتے تھے ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ وہ ان قطعات و رباعیات اور غزلیات کو ساتھ دہلی لیتے گئے اور اپنے خرچ پر ایک کتابچہ نام 'جذباتِ ناوک' 1956 میں چھپوا دیا۔ تصنیفات کے سلسلے میں گویا یہ بسم اللہ تھی۔ اس وقت گریڈیہہ میں بہت اچھی ادبی فضا تھی۔ گاہے گاہے شعری و ادبی نشستیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہزاری باغ آنا جانا ہوتا ہی رہتا تھا۔ وہاں بھی اچھا ادبی ماحول تھا۔ ان سب کا اثر ہوا ادھر ادھر رسائل میں بھی لکھتا رہا اور سب سے اچھی یا سب سے بری بات یہ ہوئی کہ ہر طرح کی چیزیں لکھتا رہا۔ نظم بھی' نثر بھی' رسالوں کے مزاج کے انداز سے بھی۔

یوں شومیِ تقدیر سے 1963 میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ گھر آیا ٹین کے ایک صندوق میں والد صاحب کے اردو فارسی کے کلام تھے۔ رباعیات فارسی کا ایک مجموعہ نکال کر ساتھ لیتا گیا اور سیکڑوں فارسی رباعیات کو اردو میں منظوم ترجمہ کر ڈالا۔ خوبی یہ کہ منظوم ترجمہ بھی رباعیات ہی کے وزن میں کیا۔ جب لگ بھگ سو رباعیات کا ترجمہ ہو گیا تو انھیں لے کر گیا پہنچا۔ پروفیسر حسنین صاحب کو دکھلایا۔ وہ بہت خوش ہوئے بولے چھپوا ڈالو۔ میں نے کہا پیش لفظ لکھ دیجیے۔ وہ خوش ہو گئے لیکن بولے کہ میں شاعر نہیں ہوں۔ یہ کیسے سمجھوں گا کہ جو ترجمہ تم نے کیا ہے وہ بحر و وزن کے مطابق درست ہے یا نہیں۔ پھر قدرے سوچ کر خود ہی بول پڑے میں خط لکھ کر دیتا ہوں۔ پٹنہ چلے جاؤ۔ عطا صاحب کو دکھلا دو۔ وہ بھی تقریظ لکھ دیں گے اور ایک نظر دیکھ بھی لیں گے۔ چنانچہ میں پٹنہ گیا عطا صاحب خوش تو بہت ہوئے۔ تقریظ بھی لکھ دی لیکن یہ پوچھ بیٹھے کہ عروض والد صاحب سے پڑھا تھا؟ میں گھبرا گیا۔ جواب دیا میں عروض نہیں جانتا۔ عطا صاحب حیران ہوئے۔ آپ عروض نہیں جانتے اور ان رباعیات کا رباعی ہی کے اوزان میں ترجمہ آپ نے کیا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ بے شک میں نے کیا ہے۔ وہ پھر متعجب ہوئے۔ واہ یہ عجیب معجزہ ہے۔ خیر میں مسودہ لے کر گیا آ گیا۔ حسنین صاحب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کتاب پر مقدمہ لکھ دیا۔ میں نے تاج پریس گیا ہی سے 'قوسِ قزح' کے نام سے وہ مجموعہ چھپوا ڈالا۔ اس مجموعے کی وساطت سے پوری ادبی دنیا پوری طرح قوس صاحب کے نام سے بھی آشنا ہوئی اور ان کے صدقے میں ناوک حمزہ پوری کا بھی ایک قد بن گیا۔ بڑی پذیرائی ہوئی اس مجموعے کی۔ اس ذریعے سے جناب ہوش عظیم آبادی سے رابطہ ہوا۔ وہ والد مرحوم کے بڑے مداح تھے۔ انھوں نے فرمائش کر کے بہت سے مضامین لکھوائے اور اپنے رسالے 'بہار کی خبریں' میں چھاپتے رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رسالہ سرکاری تھا اور وہ اس کے مدیر تھے۔ بہرحال اس رسالے سے مجھے بحیثیت شاعر اور مضمون نگار مشہور ہونے میں مدد ملی۔ رفتہ رفتہ دوسرے رسالوں میں بھی لکھتا رہا اور ہر قسم کی چیزیں لکھتا رہا۔ اس درمیان جناب ادریس صاحب مرحوم نے فرمائش کی کہ ان کے رسالے 'سہیل' کے ہر شمارے پر اس میں شامل تخلیقات کے تعلق سے اپنی رائے یا تبصرہ لکھ دوں۔ جسے وہ چھاپتے رہیں گے۔ یہ کام ان کے لیے کیا اور اس سے پوری ادبی دنیا میں صاحب نظر مشہور ہو گیا۔

اس درمیان مولانا عبدالوحید صدیقی (مرحوم) سے رابطہ ہو گیا۔ وہ متعدد رسالے نکالتے تھے۔ مجھ سے بھی لکھنے کو کہا حالانکہ دوسروں کو معاوضہ نہیں دیتے تھے بلکہ غیر مشروط و بلا معاوضہ لکھوا کے دستخط کروا لیتے تھے تب شائع کرتے تھے لیکن مجھے حق محنت کے نام سے معاوضہ دینے لگے۔ ان کے ڈائجسٹوں کے لیے ہر قسم کی چیزیں لکھیں اور پوری ادبی دنیا میں انھوں نے مجھے مشہور کر ڈالا۔ اسی درمیان 'پیام تعلیم' کے مدیر حسین خاں (مرحوم) سے بھی رابطہ ہوا۔ انھوں نے فرمائش کر کر کے بچوں کے لیے لکھوایا۔ ازیں قبیل مختلف راہیں کھلتی گئیں اور اس خاکسار کو آگے بڑھنے کے مواقع ملتے گئے۔ اس درمیان 1979 کو بچوں کا سال قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ بچوں کے لیے منظومات کے دو مجموعے چھپوائے۔ 'گل دستہ' کو مغربی بنگال اُردو اکادمی نے اور 'چڑیا خانہ' کو بہار اردو اکادمی نے انعامات واعزازات سے نوازہ۔ اس کے بعد سلسلۂ تصنیف و تالیف چلتا رہا جو اب تک جاری ہے اور ایک سو دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اص: آپ نے اُردو شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی

سوانحی کوائف

نام: غلام السیدین، **قلمی نام:** ناوک حمزہ پوری
سن پیدائش: 21اپریل1933
تعلیم: ایم اے، ڈپ ان ایڈ
شعری تصنیفات: (جہاں تک ناوک حمزہ پوری کی شعری و نثری تصانیف کا تعلق ہے تو تقریباً ایک سو سے زائد تصنیفات منظرعام پر آچکی ہیں۔ ان میں چند کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں)

(1) جذبات ناوک (شعری مجموعہ) 1956، (2) انتشار غزل (شعری مجموعہ) 1989، (3) ترسیل سخن (پابند نظمیں) 1990، (4) انداز بیاں (رباعیاں) 1992، (5) ذریات (طنز و مزاح) 2001، (6) تفہیم (رباعیات) 2003، (7) ہزار رنگ (دیوان رباعیات) 2007، (8) تقطیر سخن (نظموں کا مجموعہ) 2008، (9) مصحف تاریخ (قطعات تاریخیہ کا مجموعہ) 2008، (10) فانوس (مجموعہ غزلیات) 2010

نثری تصنیفات:
(1) قوس حمزہ پوری ایک تعارف (تحقیق وتنقید) 1982
(2) دشام چند (انشائیے) 1984، (3) سمت سفر (افسانے) 1980، (4) قندیل (مکتوبات) 1998، (5) تشکیل وتعبیر (مقالات) 2001، (6) تادیب ادب و پاسخ (تنقید) 2003، (7) پرسش و پاسخ (مکاتیب) 2003، (8) ادب گا ہسیت زیر آسماں 2003، (9) رخسار شیرگھاٹی (تذکرہ) 2007، (10) قوس حمزہ پوری و اُردو غزل (تنقید) 2007، (11) وہ اکثر یاد آتے ہیں (خاکوں کا مجموعہ) 2011، (12) قوس حمزہ پوری ایک تعارف (تحقیق وتنقید) 1982

بچوں کا ادب:
(1) گل دستہ (بچوں کے لیے نظموں کا مجموعہ) 1979
(2) چڑیا خانہ (بچوں کے لیے نظمیں) 1979
(3) جانو پہچانوں (بچوں کے لیے نظمیں) 1988

انعامات واعزازات:
- صوبائی و مرکزی حکومتوں سے ایوارڈ۔
- بہار سرکار سے مجموعی ادبی خدمات کے لیے ایوارڈ۔

ہے لیکن آپ کو کس صنف پر مہارت حاصل ہے؟

ناوک حمزہ پوری: میں نے اپنی بساط بھر اپنی قوت صرف کی، کامیاب ہوا بھی یا نہیں ہوا یہ فیصلہ دنیا کرے گی۔ مجھے کیا پتہ۔ مہارت بہت بلیغ لفظ ہے۔ کوئی شخص اگر دعویٰ کرتا ہے کہ اسے فلاں صنف میں مہارت حاصل ہے تو یا تو بے وقوف ہے یا مغرور۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ جو بھی مرحلہ سامنے آیا ہے۔ اس سے نپٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے زیادہ کا فیصلہ دنیا کرے گی۔

اص: آپ کو بحیثیت رباعی گو زیادہ مقبولیت ملی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ناوک حمزہ پوری: وجہ پر بھی میں زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتا۔ میرا مطالعہ یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ادبی اصناف میں سب سے زیادہ نقصان رباعیات کو پہنچایا۔ کسی نے اسے محض اساتذہ کی چیز قرار دے دیا اور کوئی اسے صرف پندونصائح پر مشتمل صنف سخن سمجھ کر اس سے گریزاں ہو گیا اور دوڑ پڑا مغرب کی طرف اور جو کچھ اینٹ پتھر وہاں ملا اسے بٹور لایا۔ کوئی ہائیکو کا دیوانہ ہو گیا۔ کوئی ماہیے پر جان چھڑکنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شعرا کو تو جانے دیجیے جو اساتذہ اس صنف میں مشہور تھے انھوں نے بھی رباعی سے توبہ کر لی اور اسے ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ اس فقیر کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس نے رباعی کہنے سے پہلے رباعی کے تعلق سے ہر گوشے کو کھنگالا۔ فنی و لسانی گتھیاں سلجھائیں۔ لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیا پھر یہی حال دوہوں کے ساتھ بھی روا رکھا اور جہاں تک بن پڑا نک سک سے درست اصناف کے نمونے لوگوں کے سامنے پیش کیے۔ رباعی میں مجھ کو زیادہ نام حاصل یوں ہوا ہے کہ میرے پاس لوگوں کے تمام اعتراضات کے جوابات ہیں۔

اص: آپ کا ایک افسانوی مجموعہ 'سمت سفر' شائع ہوا تھا پھر افسانہ لکھنا کیوں ترک کر دیا؟ آج کے اردو افسانہ نگاروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ناوک حمزہ پوری: افسانے میں نے شوق سے نہیں لکھے، ضرورتاً لکھے۔ افسانوں کے حدود اربعہ کا مطالعہ کیا۔ اپنے ہی رسالہ 'قوس' میں ایک مذاکرہ شائع کیا تھا۔ 'نئے افسانے اور چند نئے نام'۔ اس سے بہتر تجزیاتی مضمون افسانوں پر بہار میں کسی نے لکھا ہے کیا؟ معروف صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی اپنے رسالے کے لیے مجھ سے افسانے لکھواتے تھے، اب ان کے لیے لکھا تو لگے ہاتھ دوسرے رسائل میں بھی بعض افسانے چھپ گئے اور بیشتر افسانوں پر بہت شور مچایا گیا۔ افسانے زندگی کے جس قدر قریب ہوں گے۔ اتنے کامیاب ہوں گے۔ یہ بنیادی نکتہ لوگ بھول گئے ہیں۔

اص: آج اُردو شاعری کس مقام پر ہے؟

ناوک حمزہ پوری: آج وہ زبان ہی نہیں ہے۔ ادب خواہ نثر ہو یا نظم ہو کتنے لوگ صحیح اردو جانتے ہیں۔ گیا میں حضرت سریر کابری، بسمل سنسہاروی اور شمس گیاوی وغیرہ کے اٹھ جانے کے بعد کتنے لوگ ایسے ہیں جنھیں صحیح اردو آتی ہے۔

اص: آج اُردو غزل میں کوئی بڑا نام کیوں نہیں پیدا ہو رہا ہے؟

ناوک حمزہ پوری: کہہ تو دیا کہ زبان پر ہی مردنی چھائی ہے۔ اصناف سخن کی زندگی کا کیا سوال ہے؟

اص: کیا نظم ہی اُردو شاعری کی سب سے مستحکم صنف ہے؟

ناوک حمزہ پوری: نہیں ایسا نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ آج نظم ہے کہاں۔ عروضیات سے خوفزدہ ہو کر بہتیرے شاعر بھی دور کھڑے ہوئے ہیں۔ پابند نظم کہنے والا کوئی ہے بھی کیا؟

اص: آپ کی شاعری پر مذہب کیوں غالب ہے؟

ناوک حمزہ پوری: اس لیے کہ بیشتر لوگ لامذہب ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں مذہب کہاں سے آئے۔ میں بہ فضل الٰہی مذہب سے بیزار نہیں ہوں۔ یوں مذہب تو غالب رہے گا ہی اور رہنا ہی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وہ آدمی جس کی رگوں میں امام عالی مقام کا خون دوڑ رہا ہو۔ مذہب سے بیزار کیوں کر ہو سکتا ہے۔

اص: ادب میں تحریک اور رجحانات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے ترقی پسند دور بھی دیکھا جدید دور بھی اور اب مابعد جدیدیت کا دور بھی۔ آپ کی شاعری میں ان تحریکوں اور رجحانات کا اثر کیوں نہیں ہے؟

ناوک حمزہ پوری: کوئی تحریک آسمان سے نہیں اترتی۔ ضرورتاً پیدا ہوتی اور اپنی پیش رو تحریک کی خوشہ چینی رہی ہے۔ ان تحریکات میں جو چیزیں اچھی ہیں یا تھیں ان کے اثرات بلاشبہ نئی تخلیقات میں ہیں۔ جو چیزیں مفید مقصد نہیں تھیں ان کی طرف میں نے توجہ نہیں کی۔ میری نظر میں سب سے بڑی کمی اور کمزوری یہ رہی کہ زبان رفتہ رفتہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا چلن کم سے کم ہوتا گیا ہے۔ فارسی بالکل آنکھوں سے اوجھل ہوتی گئی ہے اور میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ جو شخص کام چلاؤ فارسی بھی نہیں جانتا وہ اردو بھی نہیں جانتا۔ فارسی کا کوئی معمولی سا بھی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے تو خواہ گیا ہو پٹنہ فون بج اٹھتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟ حیرت ہوتی ہے۔ پوچھنے والے تمام معروف لوگ ہوتے ہیں۔ فنی روابط ٹوٹے ہیں۔ سوال یہ ہے۔ اس کا جواب تلاش کیجیے۔

اص: آپ نے تنقید بھی لکھی ہے۔ موجودہ دور میں کن ناقدین کو اہم ناقد تسلیم کرتے ہیں؟

ناوک حمزہ پوری: زبان پر ہی عام طور پر گرفت اس قدر ڈھیلی ہے کہ ان کا ناقد ہونا دور کی بات ہے۔ ابھی ذرا پہلے ایک پروفیسر جو ہمارے معتبر ناقد تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ عروضیات سے واقف نہ تھے۔ ان کی نگاہ میں قطعہ اور رباعی میں کوئی فرق نہ تھا۔ جب ایک اہم ناقد کا یہ حال ہے تو آج کے دوسرے ناقدین کے بارے میں کیا پوچھتے ہیں۔

اص: 1980 کے بعد جو شاعر سامنے آئے ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ناوک حمزہ پوری: صرف گیا یا بہار کی بنیاد پر، پورے برصغیر کی بنیاد پر پوچھیے تو:

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی است
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

معاف کیجیے یہاں پلنگ سے چارپائی مراد نہیں ہے۔ جس پہ آپ سوتے ہیں۔

اص: ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے باوجود وہ مقام نہیں ملا جو ملنا چاہیے تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ناوک حمزہ پوری: مقام ان دنوں کہیں ملتا ہے؟ کیسے ملتا ہے؟ آپ نے کسی صاحب اثر و رسوخ کے آگے پیچھے کاسۂ گدائی لیے گھومتے مجھے کبھی دیکھا ہے؟ جو لوگ اپنے زمانے میں بااثر رہے ہیں۔ انھیں ہی مقام ملتا ہے۔ آج بھی جو لوگ بااثر ہیں میں نے ان کی اچھی خبر لی ہے۔ وہ میری طرف ملتفت کیوں ہوں گے۔

اص: بہار میں اُردو شاعری کا کیا مستقبل ہے؟

ناوک حمزہ پوری: چار پانچ ایسے شعرا کو جو استاد شاعر مشہور ہیں سامنے رکھیے۔ انھیں پرکھیے۔ انھیں اردو زبان تو آتی نہیں پھر وہ شاعری کیا کریں گے۔

اص: آپ کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان میں سے کون ہے جو اُردو شاعری میں ایک بلند مقام تک پہنچے گا۔

ناوک حمزہ پوری: باضابطہ میرا کوئی شاگرد نہیں۔ کچھ لوگ جو خواہ مخواہ لگ گئے تھے ان کی تعداد بھی بیس پچیس سے زیادہ نہ تھی۔ پچھلی صدی کے دور آخر میں جب بینائی بہت کمزور ہو گئی تمام لوگوں سے معذرت کر لی۔ سب کو آزاد کر دیا۔ آج میرا کوئی شاگرد نہیں ہے۔

اص: آپ کی آنے والی کتابیں کون کون سی ہیں؟

ناوک حمزہ پوری: غالباً ایک سو سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں اب آنکھ میں توانائی باقی نہیں ہے۔ لکھنا سخت عذاب ہے ایسے میں بھی سر پر سوار ہو کر بعض لوگ کچھ نہ کچھ لکھوا لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے دو ایک کتابیں اور آجائیں۔ ویسے اب ارادہ نہیں ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

■

Dr. Ahmad Sagheer, Haneef Manzil, Koily Pokhar, Police Line, Gewal Bigha, Gaya - 823001 (Bihar)

بابِ اخترالایمان

پیدائش : 12 نومبر 1915 وفات : 9 مارچ 1996

ممبئی کے باندرہ قبرستان میں مدفون اخترالایمان کا تعلق یوپی کے ضلع بجنور کے قصبہ نجیب آباد سے تھا۔ انھوں نے ابتدائی زندگی بڑی جدو جہد میں گزری۔ بہت سی مشکلات کا انھیں سامنا بھی کرنا پڑا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ نظمیہ شاعری کے میدان میں اخترالایمان نے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔ انھیں ان کے شعری مجموعہ 'یادیں' پر ساہتیہ اکادمی کا اعزاز بھی ملا۔ اس کے علاوہ انھیں بہترین مکالمے کے لیے فلم فیئر ایوارڈز بھی ملے۔ ادب اور فلم دونوں سے ان کی گہری وابستگی رہی۔ ان کے شعری مجموعوں میں : گرداب (1943)، تاریک سیارہ (1952)، آبجو (1959)، یادیں (1961)، بنت لمحات (1969)، نیا آہنگ (1977)، سروسامان (1983)، زمین زمین (1990)، زمستاں سرد مہری کا (پس مرگ)، (1997) مرتبہ: سلطانہ ایمان، بیدار بخت شامل ہیں۔ ان کی ایک خودنوشت: اِس آبادخرابے میں (1996) کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ ان کی نظمیہ شاعری کو معتبر اور مقتدر ناقدین نے سراہا۔ ان پر کئی تحقیقی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی رسالوں کے خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے۔ جن میں 'معیار' نئی دہلی، 'آجکل' نئی دہلی فروری 1994، اور 'ایوانِ اردو' دہلی قابل ذکر ہیں۔

معتبر ناقدین کی نظر میں

باقر مہدی

مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک نہیں ہوتی کہ اخترالایمان اردو شاعری کے تاریک اُفق کے سب سے روشن ستارے ہیں۔

خلیل الرحمن اعظمی

اخترالایمان عہد حاضر کے ان دو چار شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے وقت کے چیلنج کو قبول کیا ہے۔

جمیل جالبی

اخترالایمان میں صداقت بھی ہے اور خلوص بھی اور اسی لیے میں اسے شاعرالایمان کہتا ہوں۔

سجاد ظہیر

تمھاری شاعری کی ایک انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فوراً ایک بار سننے اور پڑھنے سے اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ اس کا اثر آہستہ آہستہ ذہن اور نفس پر سرایت کرتا ہے۔ جوں جوں مدت گزرتی جاتی ہے لذت بڑھتی جاتی ہے۔ نئے نئے گوشے اور پہلو سامنے آتے جاتے ہیں اور پھر ایک دائمی کیفیت اختیار کر لیتے ہیں۔ باسی پن کا نہیں، نئی نفسیاتی اور ذہنی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

وارث علوی

اخترالایمان پتھرائی آنکھوں سے تاریخ کے ہولناک کھیل کو دیکھتے ہیں، آنکھ سے آنسو نہیں گرتا مگر جگر خون ہو جاتا ہے جو ان کی شاعری کی حنابندی کے کام آتا ہے۔

آل احمد سرور

اخترالایمان نے خود بھی زندگی سے آنکھیں چار کی ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی یہ حوصلہ دیا ہے۔ ان کے ہاں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں۔ وہ اور شعرا کی طرح صرف اپنی ذات سے محبت میں گرفتار نہیں۔ زندگی کے ہر رنگ سے محبت کرتے ہیں اور سب دل اور نظر والوں کے شاعر ہیں۔

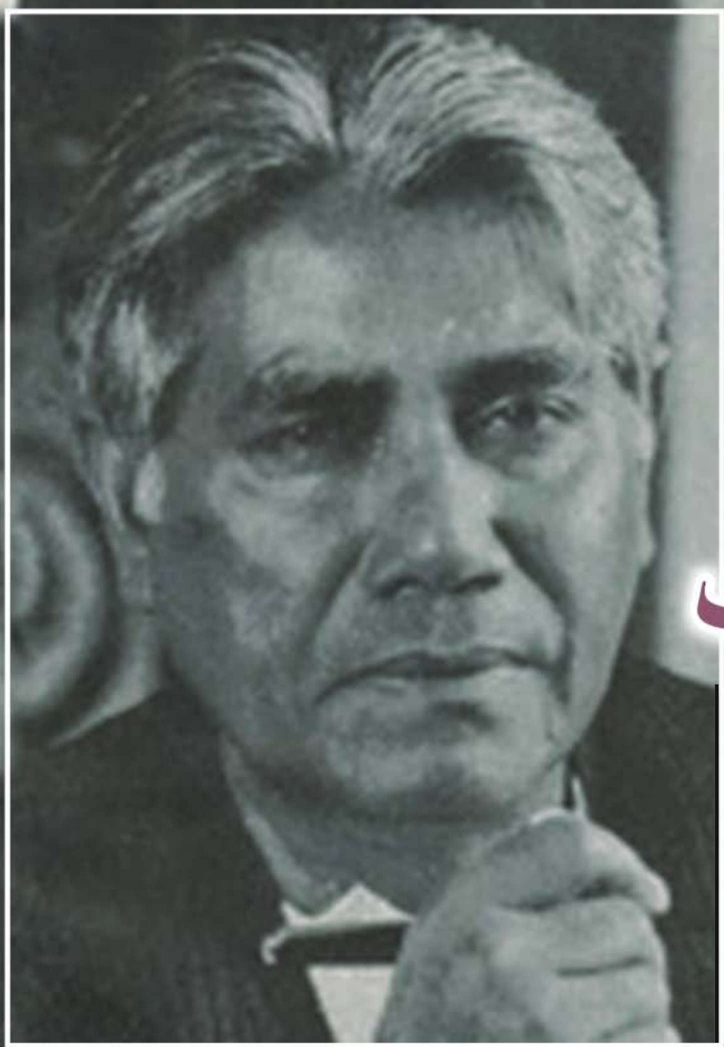

منظر اعجاز

اختر الایمان کا انفرادی آہنگ

اختر الایمان نے اس آباد خرابے میں اب سے ٹھیک ایک سو سال پہلے قدم رنجہ فرمایا اور چشم وجود کھولی۔ وطن عزیز اور عزیزانِ وطن کی بربادیوں کے آثار خوں نابہ بار نقش ہائے رہ گزار سے دیوار چمن زار تک پھیلے ہوئے تھے۔ خود ان کا اپنا مولویانہ گھر گھرانہ افلاس زدہ اور مفلوک الحال تھا۔ والد جس حال میں تھے اسی میں تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا۔ لیکن اختر الایمان کو یہ راس نہ آسکا۔ یہ سکھ مدرسہ کا زمانہ تھا۔ وہاں کی کس مپرسی کا ذکر اختر الایمان نے بڑے ہی دلدوز انداز میں 'سروساماں' کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہاں سے بھاگ کر وہ دلّی چلے آئے اور 'مؤید الاسلام' یتیم خانہ اسکول میں چار سال کا عرصہ گزار کر فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً انیس سال کی تھی۔ لیکن مؤید الاسلام ہی کے دو استاد کا ذکر انھوں نے کیا ہے اور اپنی ذہنی تربیت میں ان کے کردار کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ اختر الایمان نے یہیں 16,17 کی عمر میں شعر کہنا اور لکھنا شروع کردیا تھا۔ ان کے وہ دو استاد عبدالصمد اور عبدالواحد تھے۔

(خودنوشت موشوعہ سوغات، ستمبر 1991)

اختر الایمان کو فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں بھی دو مخلص اور جوہر شناس استاد نعمت علی اور محمد غوث ملے جو ان کی خوب خوب حوصلہ افزائی کرتے اور ان کے لکھنے پڑھنے کے ذوق و شوق کو مہمیز کرتے۔ جب یہاں اسکول میگزین کا اجرا ہوا تو اختر الایمان کو اس کا مدیر بنایا گیا۔ وہ مؤید الاسلام کے تعلیمی دور میں غزلیں بھی کہہ لیا کرتے تھے لیکن غزلوں سے فطری مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے غزل گوئی ترک کردی اور نظموں کی طرف توجہ کی چنانچہ اس زمانے میں 'گورغریباں' لکھی جو اسکول میگزین میں شائع ہوئی۔ اس کی پذیرائی بھی ہوئی۔

اختر الایمان نے یہیں سے غیر تدریسی کاموں کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد اینگلو عربک کالج میں داخلہ لیا اور بی اے کیا۔ ایم اے بھی کرنا چاہتے تھے لیکن غیر تدریسی سرگرمیوں کی وجہ سے ایم اے میں داخلہ نہ ہوسکا۔ چنانچہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد سپلائی ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت میں آئے۔ پھر ساغر نظامی کی میگزین 'ایشیا' کی ادارت کے سلسلے میں میرٹھ چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد دلّی ریڈیو اسٹیشن میں ملازمت اختیار کرلی۔ یہاں ان کے ساتھ میراجی، مختار صدیقی، کرشن چندر، منٹو، ن م راشد اور مجاز ملازمت کرتے تھے۔ چند دنوں بعد ایک معمولی سی بھول کی وجہ سے یہ نوکری بھی ان کے ہاتھوں سے جاتی رہی۔ لیکن اب وہ ملازمت کی بجائے مزید تعلیم کی طرف مائل ہوئے اور 1943 میں علی گڑھ چلے گئے۔ ایم اے کے سال اول میں داخلہ ہوا۔ وہ امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب بھی ہوئے لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے آگے پڑھنا ممکن نہ ہوسکا۔ خودداری نے کسی کے آگے منھ کھولنے یا دست سوال دراز کرنے سے روک دیا چنانچہ چپ چاپ کسی کو کچھ بتائے بغیر علی گڑھ سے چلے آئے۔

اختر الایمان علی گڑھ سے نکلے تو پونے پہنچ گئے۔ پونے میں ڈبلیو زیڈ احمد سے ملاقات ہوئی۔ انھی کے مشورے سے شالیمار اسٹوڈیو جوائن کیا اور فلم سے وابستہ ہوگئے۔ ان دنوں کرشن چندر اور راما نند ساگر بھی وہیں تھے۔ تین سال پونے میں رہنے کے بعد چند روز کی فرصت لے کر دلّی چلے آئے۔ یہاں کالج کے زمانے کے دوستوں سے ملاقات ہوئی جن میں رضی الدین، بشیر بٹ، اطہر اور جمیل الدین عالی بھی تھے جو اختر الایمان کے گہرے دوستوں میں تھے۔ جمیل الدین عالی کا گھر ہی ظاہری اور رسمی طور پر سلطانہ منصوری سے ان کی شادی کا سبب بنا جو 1947 کے ہولناک ماحول میں ہوئی اور سلطانہ منصوری سلطانہ

ایمان بن گئیں۔ اس سلسلے میں سلطانہ ایمان کا بیان دلچسپ بھی ہے اور لائق توجہ بھی۔ وہ لکھتی ہیں:

''یہ 1947 کی بات ہے جب میں عربک ہائی اسکول میں دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اینگلوعربک کالج کے مشاعرے میں گئی تھی۔ میرے بڑے بھائی نے اسی سال وہاں فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔ وہاں مجھے اپنی ہم سبق لڑکیاں بھی مل گئیں۔ ہم سب ہال کے اوپر کسی کمرے میں بیٹھے کلام سن رہے تھے کہ اخترالایمان کا نام اناؤنس کیا گیا، اچانک لڑکیوں کا ریلا ہمیں دھکیلتا ہوا گزرا اور ایک کے اوپر ایک لڑکی کھڑکی میں سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگی۔ میرا پیر کچل گیا تھا۔ اس لیے بہت غصہ آیا کہ بھئی ویسی بھی کیا چیز ہیں کہ سب دیکھنے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ اخترالایمان نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں نظم شروع کی۔ تھوڑی دیر بعد اپنے پیر کی چوٹ بھول کر کھڑکی سے جھانکنے والی لڑکیوں میں شامل ہوگئی۔ چند روز بعد اخترالایمان بھائی جان کے ساتھ ہمارے گھر آئے اور ہم سب سے ملوائے گئے۔۔۔۔ میرے بھائی ان کے بڑے مداح تھے۔ پھر وہ اکثر آنے لگے بلکہ تقریباً ہر شام ہی آتے تھے۔ میری عمر اس وقت چودہ پندرہ برس رہی ہوگی۔'' (زمستاں سرد مہری کا)

سلطانہ ایمان سلسلہ کلام کو طویل دیتے ہوئے مزید رقم طراز ہیں:

''میرے والد اور بڑے بھائی اگرچہ انجینئر تھے پھر بھی گھر کا ماحول ادبی تھا۔ سب کو ہی ادبی ذوق تھا۔ میں بھی میر، غالب، منٹو اور کرشن چندر کو پڑھا کرتی تھی۔ ان ہی دنوں اخترالایمان کی پہلی کتاب 'گرداب' شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے گرداب کی کاپی دی۔ مجھ سے باتیں بھی بہت کرتے تھے۔ کچھ تعریف بھی، کچھ نظمیں بھی میرے لیے کہی تھیں جن کا پتہ مجھے بعد میں چلا۔ کچھ دنوں بعد طیبہ بھابی (بیگم جمیل الدین عالی) مجھے دیکھنے اسکول آئیں اور پسند کرلیا۔ 3 مئی 1974 کے ہنگامی زمانے میں ہمارا نکاح ہوگیا۔ اخترالایمان واپس پونا چلے گئے اور دہلی میں ہمارا گھر بارلٹ گیا۔ مشکل سے نانی بچیں۔ میرے گھر والے پاکستان چلے گئے اور میں بغیر رخصتی کی رسم کے جیسے تیسے بمبئی آگئی۔''

اخترالایمان کی سلطانہ سے یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی والدین کی ضد پر کم عمری میں ہی ہوئی تھی جو نبھ نہ سکی اور طلاق ہوگئی۔ سلطانہ کے ساتھ اخترالایمان کا سفر حیات ایک نئے موڑ سے گزرا۔ کارزار حیات میں صحرانوردی کے دن اور چلچلاتی دھوپ میں سلطانہ شریک سفر ہوئیں تو ان کی شخصیت ایک شجر سایہ دار کی مانند نمودار ہوئی۔

سلطانہ منصوری مشہور قومی رہنما اور بیرسٹر آصف علی کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ متمول گھرانے سے تعلق تھا۔ نکاح کے بعد اخترالایمان بمبئی آگئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ بمبئی کے ابتدائی ایام میں انھیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ثابت قدمی سے نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور کامیاب ہوئے۔ انھوں نے فلموں میں کہانیاں، مکالمے اور اسکرین پلے لکھنے میں ایسی مہارت حاصل کرلی کہ چوٹی کے لکھنے والوں میں شمار ہونے لگے۔ فلمی مصروفیات کے باوجود ان کی

شاعری پر کوئی منفی اثر مرتب نہ ہوسکا اور دونوں دھارے الگ الگ بہتے رہے۔ ایک طرف فلمی دنیا کی پیشہ ورانہ مصروفیات اور دوسری طرف شعری اسالیب میں زندگی سے مکالمات۔ بیگم سلطانہ کی رفاقت نے انھیں ایک نئی توانائی بخشی تھی۔

بیگم سلطانہ سے شادی کے قبل ہی 1943 میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'گرداب' شائع ہوچکا تھا۔ مویدالاسلام کے تعلیمی دور میں وہ غزلیں کہہ لیتے تھے۔ فتح پوری مسلم ہائی اسکول کے تعلیمی دور سے نظمیں کہنے لگے تھے۔ جس زمانے میں نظم نگاری کا آغاز ہوا، اسی زمانے میں کمیونسٹ خیالات کے ترجمان اخبار سے بھی ان کا اس نوعیت کا تعلق رہا کہ وہ اس کے ممبروں کو اخبار پہنچایا کرتے تھے۔

دلی ریڈیو اسٹیشن سے وابستگی کے زمانے میں اخترالایمان کے وہاں ساتھی یا دوست تھے ان کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مجاز بھی ان دنوں وہاں تھے۔ ان کے شاعرانہ مزاج و مذاق کو ساغر نظامی 'ایشیا' کے حوالے سے مراسم و تعلقات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات سامنے آسکتی ہے کہ ترقی پسند تحریک یا جدیدیت سے متعلق شعرا سے اخترالایمان کے قریبی مراسم رہے۔ اس دور کی ترقی پسند شاعری یا جدیدیت پسند شاعری بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ تھی۔ لیکن ان کا انفرادی تخلیقی میلان کسی تحریک یا رجحان کے سانچے میں نہ ڈھل سکا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی نظموں پر بعض معاصرین کے افکار و تصورات کی ہلکی ہلکی سی چھوٹ پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن طرز احساس اور طرز اظہار سے وہ مرتبۂ امتیاز تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر حنیف کیفی کا یہ خیال قابل لحاظ ہے:

''جہاں تک انفرادیت کا تعلق ہے، تو ہر سچا فن کار منفرد ہوتا ہے۔ کوئی بھی فن کار جو فن کار کہلانے کا مستحق ہے، بنے بنائے راستوں سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیقی فطرت اسے ایسی نئی راہوں کی تلاش و تعمیر پر مجبور کردیتی ہے جو اس کی پہچان کا ذریعہ بن سکیں۔ لیکن اس انفرادیت کے حصول کے لیے مختلف فن کار مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ کوئی اس راستے کو جو پہلے سے موجود ہوتا ہے، قطعاً نظرانداز کردیتا ہے اور اس کی بجائے اپنے لیے ایک بالکل نیا راستہ بنالیتا ہے، تو کوئی اسی راستے کے متوازی ایک نئی راہ کی تشکیل کرتا ہے۔ کوئی اس راستے میں سے ایک نئی شاخ نکال لیتا ہے، کوئی اسی بنے بنائے راستے پر چلتے ہوئے اس میں ایسی چیزوں کا اضافہ کردیتا ہے یا اس میں ایسے نئے انداز پیدا کردیتا ہے کہ وہ پرانا ہوتے ہوئے بھی نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔ روایت سے بغاوت، روایت سے انقطاع، روایت سے انحراف اور روایت میں جدت، سب انفرادیت کے مختلف مظاہر ہیں۔'' (اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم)

اخترالایمان کے ذاتی درد و داغ اور کرب و اضطراب میں روح عصر کی بے چینیاں گھلتی ملتی گئیں، ان کی گھائل آواز، اس کا چٹیلاپن، تلخی اور تیز دھار، تیز تر ہوتی گئی۔ ان کی حساسیت اور جذباتیت نئے نئے رنگ و آہنگ اختیار کرتی گئی۔ احساسات و جذبات کی شدت سے

ترسیل کے سانچے اور اظہار کے پیرائے بھی متاثر ہوئے۔ تقریباً چھ دہائی پر مشتمل ان کے سرمایۂ سخن میں کئی نظمیں شاہکار بن گئیں۔ جن میں 'مسجد'، 'تنہائی'، 'تاریک سیارہ'، 'یادیں'، 'ایک لڑکا'، 'غلام روحوں کا کارواں'، 'بازآمد'، 'عہد وفا'، 'پیمبر گل'، 'شیشے کا آدمی'، 'یوں نہ کہو'، 'اندوختہ'، 'اذیت پرست'، 'کوزہ گر'، 'بنت لمحات'، 'راستہ کا سوال'، 'کارنامہ'، 'اپاہج گاڑی کا آدمی'، 'ارض ناکس'، اور 'زمستاں سرد مہری کا' وغیرہ شامل ہیں۔

اختر الایمان نے کئی جگہ اپنی شاعری کو ذات کا اظہار کہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ احوال عصر اور کائنات سے گریز کا رویہ ہے۔ ان کی پیدائش 12 نومبر 1915 اتر پردیش کے ضلع بجنور کے ایک گاؤں راؤکھیری میں ہوئی۔ بچپن کے کچھ دن سگھ کے جنگلی ماحول میں بسلسلۂ تعلیم بیتے جہاں والد مفلوک الحال مسجد اور ویران مدرسے کے امام و مدرس تھے۔ لیکن اس کے بعد دلّی، علی گڑھ، پونے اور بمبئی جیسے شہروں کی گہما گہمی میں زندگی گزارنے کے مواقع ملے۔ اس کے علاوہ ایشیائی ممالک، یوروپی اور امریکی ممالک کے اسفار کیے یعنی دنیا دیکھی۔ دنیا کی بے شمار رونقیں دیکھیں اور ان رونقوں میں بزم و رزم کی معرکہ آرائیوں کے آیات و آثار دیکھے۔ انسان اور انسانیت کی پامالی اور حال زار دیکھے۔ ان کے مشاہدات وتجربات نے انھیں جو کچھ دکھلایا، اس میں ان کی اپنی ذات وکائنات بھی شامل رہی۔ چنانچہ بیان کے اسالیب، اظہار کے پیرائے اور موضوعات کی رنگارنگی و بوقلمونی ان کی نظموں میں ابھرتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی، رومانی، تصوراتی اور وجودی نظریۂ حیات سے وابستہ ان کی شعری کائنات کے آفاق وجہات میں وسعت وتنوعات کی دھنک رنگیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا اسلوب، لب ولہجہ، لفظیاتی نظام فنکارانہ ذکاوت، ذہانت اور جدت وانفرادیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی آواز سب سے الگ معلوم ہوتی ہے۔ ایک نظم 'پرانی فصیل' کے یہ بند دیکھیں:

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے
مرے رخنوں میں ہے الجھا ہوا اوقات کا دامن
مرے سائے میں حال و ماضی رک کر سانس لیتے ہیں
زمانہ جب گزرتا ہے بدل لیتا ہے پیراہن
یہاں سرگوشیاں کرتی ہے ویرانی سے ویرانی
فسردہ شمع امید و تمنا تو نہیں دیتی
یہاں کی تیرہ بختی پر کوئی رونے نہیں آتا
یہاں جو چیز ہے ساکت کوئی کروٹ نہیں لیتی

اردو ادب میں 1947 سے 1957 تک کے دور کو عبوری دور مانا جاتا ہے۔ اس دور سے متعلق نظم نگاروں میں جنھیں مقبولیت خاص وعام وشہرت دوام حاصل ہوئی ان میں مجید امجد اور اختر الایمان سرفہرست ہیں۔ اختر الایمان کے شاعرانہ میلان میں تجربہ پسندی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نظر آتی ہے اور اس میں بے حد رنگارنگی اور بوقلمونی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے پابند، معریٰ، آزاد اور دوسری ہیئتوں کی نظمیں بھی کہی ہیں۔ انھوں نے قافیوں کے التزام میں، بحر ووزن کے التزام میں اور بعض دوسرے پہلوؤں سے بھی جدت طرازیاں

اختر الایمان نے کئی جگہ اپنی شاعری کو ذات کا اظہار کہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ احوال عصر اور کائنات سے گریز کا رویہ ہے۔ ان کی پیدائش 12 نومبر 1915 اترپردیش کے ضلع بجنور کے ایک گاؤں راؤکھیری میں ہوئی۔ بچپن کے کچھ دن سگھ کے جنگلی ماحول میں بسلسلۂ تعلیم بیتے جہاں والد مفلوک الحال مسجد اور ویران مدرسے کے امام و مدرس تھے۔ لیکن اس کے بعد دلّی، علی گڑھ، پونے اور بمبئی جیسے شہروں کی گھماگھمی میں زندگی گزارنے کے مواقع ملے۔ اس کے علاوہ ایشیائی ممالک، یوروپی اور امریکی ممالک کے اسفار کیے یعنی دنیا دیکھی۔ دنیا کی بے شمار رونقیں دیکھیں اور ان رونقوں میں بزم و رزم کی معرکہ آرائیوں کے آیات وآثار دیکھے۔

کی ہیں۔ مثلاً ہیئتی ترکیب میں ان کی نظم 'تنہائی' کو دیکھیں کہ انھوں نے اپنے میلان طبع کے مطابق ہر بند میں مصرعوں کی تعداد برابر نہیں رکھی ہے۔ مثلاً:

میرے شانوں پہ ترا سر تھا، نگاہیں غمناک
اب تو اک یاد سی باقی ہے سو وہ بھی کیا ہے؟

اس کے بعد پہلا بند چار مصرعوں پر، دوسرا دس مصرعوں پر اور تیسرا چھ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بند دیکھیں:

گھر گیا ذہن غمِ زیست کے اندازوں میں
سر ہتھیلی پہ دھرے سوچ رہا ہوں بیٹھا
کاش اس وقت کوئی پیر خمیدہ آکر
کسی آزردہ طبیعت کا فسانہ کہتا

اس بند کا دوسرا اور چوتھا مصرع مقفّیٰ ہے، جب کہ دوسرے بند میں، چوتھے، چھٹے، آٹھویں اور دسویں مصرعے میں قافیے کا التزام کیا گیا ہے اور آخری بند کے دوسرے، چوتھے اور چھٹے مصرعے میں قوافی پائے جاتے ہیں۔

اس میں انگریزی کے اسٹینزا اور اردو کے قطعہ کی ہیئتی ترکیب کی جھلک تو ملتی ہے لیکن ان دونوں سے انحراف کے آثار بھی روشن ہیں، اور ایک تیسری صورت بھی دکھائی دیتی ہے جو دونوں کے امتزاج پر مشتمل قرار دی جاسکتی ہے اور اسے اجتہاد کہہ کر تسلیم کیا جاسکتا ہے مگر کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس جدت طرازی سے تخلیق کار کا اختراعی میلان واضح ہوتا ہے۔

اختر الایمان کے سرمایۂ سخن میں معریٰ نظموں کے شمار واعداد سے بھی ان کا انفراد وامتیاز نمایاں ہوتا ہے۔ معریٰ نظم کا سیدھا سادہ مطلب ہے غیر مقفّیٰ یا قوافی سے عاری نظم۔ اختر الایمان نے ایسی نظموں میں بھی جدّت طراز تخلیقی میلان کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں نظم 'الٹے پاؤں والے لوگ' دیکھی جاسکتی ہے:

میں نے دیکھا سرِ شام کچھ مسخرے
ایک ٹیلے پہ بیٹھے ہوئے، زور سے
ایک نقارہ پیٹے چلے جارہے ہیں، مجھے
کچھ تعجب ہوا، سوچا شاید کسی
من چلے یار جانی کی بارات ہے
کچھ تو ہے ورنہ کیوں رقص نغمات ہے
میں نے آواز دی، 'دوستو'، 'بھائیو'
کچھ بتاؤ مجھے بھی تو کیا بات ہے
کوئی بولا نہیں میری آواز پر، پے بہ پے
اپنے ڈفلی پہ گاتے رہے مستقل
پاس جاکر کو دیکھا تو وہ لوگ تھے
جن کے سر پشت پر پاؤں تھے سامنے

اگر اس بارہ مصرعوں کی نظم کو چار چار مصرعوں میں تقسیم کردیں تو پہلے چار مصرعوں میں پہلے اور تیسرے مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ دوسرے چار مصرعوں میں پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہیں اور تیسرے مصرعوں میں پہلے اور تیسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ بحر اس کی متدارک مثمن سالم ہے۔ مصرعے وزن میں مساوی ہیں۔ لیکن خیال ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا دکھائی دیتا ہے یعنی ایک خیال ایک مصرع میں مکمل نہیں ہو پاتا تو ٹوٹ کر

دوسرے مصرع میں مل جاتا ہے۔ پہلے چار مصرعوں کی نثری ونحوی ترتیب سے ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

میں نے دیکھا سرِ شام کچھ مسخرے
ایک ٹیلے پہ بیٹھے ہوئے
زور سے
ایک نقارہ پیٹے چلے جارہے ہیں
مجھے کچھ تعجب ہوا
سوچا شاید کسی من چلے یار جانی کی بارات ہے

اس نظم کے ساتھ وضاحت طلب کچھ اور مسئلے بھی ہیں جو تفصیل طلب بھی ہیں اس لیے گریز لازم ہے۔

اختر الایمان کی بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو نہ تو پورے طور پر پابند ہیں نہ مقفی۔ لیکن ان کے تخلیقی رویے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے دانستہ طور پر بیچ کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش کو ناکام نہیں قرار دیا جاسکتا مثلاً ان کی نظم 'رام راج بجنور میں'۔

مثالیں اور بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا لہجہ آوازوں کی کثرت سے مرتب ہوا ہے اور یہ آوازیں بحروں کی جدت طراز تشکیل سے ابھری ہیں گویا کہ اختر الایمان کے عروضی نظام میں جدت وندرت کے ساتھ ساتھ کافی تنوعات بھی ہیں۔ لیکن اس کے شواہد بھی موجود ہیں کہ انھوں نے فارم یا نظموں کی صوری تشکیل یا ساختمانی اصول وطریق کار پر خیال کو ترجیح دی ہے۔

اختر الایمان نے منفرد رنگ اور ممتاز آہنگ کے ساتھ احوالِ عصر کا منظر تراشا ہے اور اس رنگ وآہنگ سے روح عصر کی بے چینیوں کی تجسیم وتشکیل کی ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں بھی ان کی نغمہ سرائی کا آہنگ بلند بانگ اور ایسا واشگاف نہ تھا جو بیشتر ہم عصر نغمہ نگاروں کا تھا۔ لیکن آزادی کے ساتھ تقسیم ملک کا جو سانحہ پیش آیا اور انسانیت سوز مظالم اور قتل وغارت گری کی واردات رونما ہوئی وہ ایک سیلِ بلا تھی جس میں ترقی پسند خیالات اور افکار وتصورات خس وخاشاک کی مانند بہہ گئے اور ترقی پسند شعور واذہان اور تخلیقی میلان پر تشنج کی کیفیت طاری ہوگئی۔ آزادی کے خوابوں کی جو تعبیریں نکلیں، وہ لہو رنگ تھیں۔ فیض نے اس شکستِ خواب کا جو منظر تراشا، اس کا یہ ٹکڑا آج بھی دیدۂ عبرت نگاہ کو تحریک نظر دیتا ہے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس آزادی کے لہو رنگ منظر میں غلامی کا جو آہنگ مضمر تھا، اسے جن شاعروں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا، وہ تو فیصلہ بھی نہیں کر پائے کہ یہ منظر کیا ہے؟

اختر الایمان کی نظم 'پندرہ اگست' کا پس منظر اور فکری تناظر بھی یہی ہے لیکن ان کی صدائے درد کا اسلوب، لہجہ اور آہنگ مختلف ہے:

یہی دن ہے جس کے لیے میں نے کاٹی تھیں آنکھوں میں راتیں
یہی سیل آبِ بقا چشمۂ نور ہے، جلوۂ طور ہے وہ؟
اسی کے لیے وہ سہانے مدھر رس بھرے گیت گائے تھے میں نے
یہی ماہ وش نشۂ حسن سے چور، بھرپور، مخمور ہے وہ؟
سنا تھا نگاہوں پہ وہ قید آدابِ محفل نہیں اب
وہ پابندیاں دیدہ و دل پہ تھیں جو اٹھی جارہی ہیں

اختر الایمان نے منفرد رنگ اور ممتاز آہنگ کے ساتھ احوال عصر کا منظر تراشا ہے اور اس رنگ و آہنگ سے روح عصر کی بے چینیوں کی تجسیم وتشکیل کی ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں بھی ان کی نغمہ سرائی کا آہنگ بلند بانگ اور ایسا واشگاف نہ تھا جو بیشتر ہم عصر نغمہ نگاروں کا تھا۔ لیکن آزادی کے ساتھ تقسیم ملک کا جو سانحہ پیش آیا اور انسانیت سوز مظالم اور قتل و غارت گری کی واردات رونما ہوئی وہ ایک سیلِ بلا تھی جس میں ترقی پسند خیالات اور افکار و تصورات خس وخاشاک کی مانند بہہ گئے اور ترقی پسند شعور و اذھان اور تخلیقی میلان پر تشنج کی کیفیت طاری ہوگئی۔ آزادی کے خوابوں کی جو تعبیریں نکلیں، وہ لہو رنگ تھیں۔

مجبوریاں اٹھ گئیں، ولولے راہ پانے لگے، مسکرانے لگے اب
محبت کٹھن راستوں سے گزر کر لہکتی مہکتی ہوئی آرہی ہے!
وہی کس مپرسی، وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ محنت کا حاصل نہیں ہے
ابھی تو وہی رنگ محفل، وہی جبر ہے، ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو یہ وادیِ رنگ بھی میری منزل نہیں ہے
شہیدوں کا خوں اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لیے جارہے ہو یہ شب کا جنازہ نہیں ہے

یاسیت اور حزن کے ساتھ ساتھ اختر الایمان کے جذبے میں رجائیت کی لہریں بھی اٹھتی رہیں۔ مختلف موضوعات پر مشتمل نظمیں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں:

آپ ہوں میں نہیں انساں سے مایوس ابھی
ابھی چھوٹے ہیں شگوفے ابھی کم سن ہے بہار
شبنمی سبز لبادوں سے مہک آتی ہے
خاک وخوں توڑ ہی دیں گے کبھی دیرینہ خمار

اختر الایمان کی رجائیت کا جواز یہ ہے کہ وہ تخریب میں بھی تعمیر کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ واقعات و واردات اور حقائق ومسلمات کو وہ ہمیشہ ایک ہی زاویے سے نہیں دیکھتے۔ زیر وزبر اور پیش وپس پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تصور انسان اور بالخصوص تصور عورت میں کوئی مثالیت پسندی نہیں ملتی بلکہ یہ کردار ان کی نظموں میں اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ جہاں خامیاں نظر آتی اور متاثر کرتی ہیں وہاں اختر الایمان کا اسلوب اور لہجہ قدرے تلخ اور طنز آمیز بھی ہوجاتا ہے۔

اختر الایمان 'ایشیا' کے آخری دور میں اس کے نائب مدیر کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے۔ ساغر کا ساتھ رہا لیکن ساغر کی طرح بوہیمین زندگی کے عادی نہ تھے اس لیے بہت حد تک لیے دیے رہے۔ فلمی دنیا میں بھی گئے تو قلندرانہ اور رندانہ زندگی اختیار نہ کی۔ نظم وضبط کے ساتھ زندگی بسر کی لیکن بقول پروفیسر محمد حسن' ہمیشہ یہی حال رہا':

ہونٹ تبسم کے عادی ہیں ورنہ روح میں زہر آگیں
کھبے ہوئے ہیں اتنے نشتر جن کی کوئی تعداد نہیں
کتنی بار ہوئی ہے ہم پر تنگ یہ پھیلی ہوئی زمیں
جس پر ناز ہے ہم کو اتنا جھکی ہے اکثر وہیں جبیں
کبھی کوئی سفلہ ہے آقا کبھی کوئی ابلہ فرزیں
بیچی لاج بھی اپنے ہنر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

(طرز خیال: اردو اکادمی، دہلی 2005)

اختر الایمان نے آباد خرابے میں جس طرح کی زندگی کو نظم وضبط کے ساتھ برتا، وہی برتاؤ اپنی شاعری کے ساتھ بھی کیا۔ ان کے جذبہ، طرزِ احساس اور طرزِ احساس میں روایت وجدت اور رومانیت واشتراکیت کا ایک خاص رچاؤ ہے جس سے ان کی شاعری کا منفرد رنگ اور ممتاز آہنگ مرتب ہوا ہے۔

■

Prof. Manzar Aijaz, Head, P.G Dept. of Urdu, A.N. College, Patna Boring Road, Patna - 800013 (Bihar), Mob.: 09431840245

کرشن بھاوک

اختر الایمان کا نظمیہ افق

ہندی فلموں میں اختر الایمان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے ہندی فلموں کو اپنے بیش قیمت مکالموں سے ہی نہیں نوازا، بلکہ اس کے علاوہ فلموں کی اعلیٰ درجے کی اسکرپٹ، دیگر تحریروں اور نظموں سے اپنے بلند بالا ادیب و شاعر ہونے کے جو ثبوت فراہم کیے ہیں، وہ حیرت انگیز ہیں۔ ان کی نظموں کے جو 9 مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے، ان کے نام اس طرح ہیں : گرداب (1943)، سب رنگ (1943)، تاریک سیّارہ (1952)، آب جو (1959)، یادیں (1961)، بنت لمحات (1969)، نیا آہنگ (1977)، سروسامان (1983) اور زمین زمین 1990۔ ان کے انتقال کے بعد 10واں مجموعہ 'زمستاں سردمہری کا' 1997 میں شائع ہوا تھا۔ اول الذکر نو مجموعے 'کلیاتِ اختر الایمان' (کل صفحات 568) میں شامل ہیں، جس کی اشاعت ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے پہلی بار سنہ 2000 میں کی تھی۔

اس مقالے میں اختر الایمان کی نظموں میں اعلیٰ ادبیت کی طرف چند اشارے پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔

1. **غزلیات کی بجائے نظموں میں رغبت**: مشفق خواجہ اپنے قلمی نام 'خامہ بگوش' سے طنزیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اختر الایمان کے ساتھ ایک انٹرویو ریکارڈ کیا تھا، جس میں صرف نظمیں لکھنے کے بارے میں بحث ہوئی تھی، اس میں اختر الایمان نے غزلوں کی بجائے فقط نظمیں لکھنے کی اصل وجہ بتاتے ہوئے " میں یہ بات دیانتداری سے سمجھتا ہوں کہ غزل اب اپنے Saturation Point پر پہنچ چکی ہے۔ آپ کہتے ہیں، کہیے۔ یہ بھی ایک صنفِ سخن ہے۔ لیکن آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ شاعری میں پھیلاؤ آئے، اس میں نئے نئے تجربات ہوں، تو آپ کو نظم کی طرف توجہ دینی پڑے گی۔ یہی بات (کراچی جانے پر غزل اور نظم کے بارے میں گفتگو ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کچھ احباب کے ساتھ ہو رہی تھی، جو ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ میرا اس میں کہنا یہ تھا کہ نظم کا میدان زیادہ بڑا ہے، جب کہ غزل کی زمین ایک حد تک محدود ہے۔ اسی تعلق سے میں نے غالب کے شعر کا حوالہ دیا تھا کہ غالب اتنے بڑے اور اچھے شعر کے موضوع کو لے کر نظم کہتا، تو کتنی بڑی نظم ہوتی ہے۔"[1]

اس سے قبل انھوں نے اس شعر کا حوالہ دیا تھا۔ " ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب / ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا۔" غالب کے اس شعر کو ہی اختر الایمان کے اس شعر کا محرک مانا جا سکتا ہے۔ " دور اس پرندے نے اپنا گیت دہرایا، آج ہم نے اپنا دل / خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا۔[2]

بیدار بخت نے اختر الایمان کے شعر کی بنیاد غالب کے متذکرہ شعر کو بتایا تھا۔ "غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل / خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا"[3]

اختر الایمان تا عمر مکالمہ نویسی کے علاوہ نظم نگاری کے مرید رہے تھے۔

2. **شاعری کی شروعات**: مجموعہ 'یادیں' کے دیباچے میں اختر صاحب نے بتایا تھا کہ "ان صفحات میں میری کم و بیش تیس برس کی شاعری ہے۔ اس شاعری کا محرک اشفاق نام کا ایک آدمی تھا، جس کے سر اور داڑھی کے بال سرخ تھے۔ رنگ بہت گورا تھا آواز جھوجری تھی اور دلی کے گلی کوچوں میں اپنی شاعری گا گا کر چار صفحات کی کتاب کی شکل میں بیچا کرتا تھا۔ 'ایسا شعر تو میں بھی کہہ سکتا ہوں'۔ یہ خیال ایک بار میرے دل میں گزرا اور میں نے غزلیں کہنی شروع کر دیں۔ ان دنوں میں دلی کے ایک یتیم خانے موید الاسلام میں رہتا تھا اور چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔"[4]

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اختر الایمان نے اینگلو عربک کالج میں داخلہ لے لیا اور کچھ عرصے تک شاعری کرنے کے بعد ترک بھی کر دی۔ اس کی جگہ اب وہ افسانے تخلیق کرنے لگے تھے، جو کہ بلند پایہ ہونے کے موجب اپنے وقت کے مشہور و مقبول 'ساقی'، 'ادبِ لطیف' اور 'نیا ادب' جیسے جرائد میں شائع بھی ہونے لگے تھے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے افسانہ نگاری بھی ترک کر دی اور شاعری بھی، کیونکہ شاعری تو ان کے ہی الفاظ میں بے رس، بے نمک اور فرضی محسوس ہونے لگی تھی۔ دوسری جانب اپنے تحریر کیے افسانے بھی انھیں اس وقت 'بہت معمولی' محسوس ہوئے تھے۔ آگے چل کر اسی دیباچے میں کہتے ہیں کہ " لکھنے لکھانے اور شعر گوئی کے سلسلے میں مشورہ کبھی کسی سے کیا نہیں۔ وحشت اس درجہ بڑھی، سر منڈوا دیا۔ جب پڑھنے سے جی اچاٹ ہوتا، ورزش کرتا۔ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا، میلوں ننگے پاؤں گھاس پر دوڑتا۔ کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر خطابت کی مشق کرتا اور دن بھر اور رات بھر دلی کی سڑکوں پر بھٹکتا پھرتا۔ پھر ایک دن ایک نظم کہی، عنوان تھا 'نقشِ پا'۔ اس نظم کا محرک تھے فیروز شاہ کے کوٹلے کے کھنڈر: یہاں اسی نظم سے یہ سطور انھوں

نے دی ہیں، جس سے اس عمر میں بھی ان کے ادراک، لیاقت، بصیرت واستعداد وغیرہ کی خط کشی کی جاسکتی ہے:

''یہ نیم خواب گھاس پر اداس اداس نقشِ پا رکچل رہا ہے شبنمی لباس کی حیات کو، وہ موتیوں کی بارشیں ہوا میں جذب ہوگئیں رجو خاکدانِ تیرہ پر برس رہی تھیں رات کو۔''

ان دنوں وہ روایتی اسلوب کی شاعری بھی کیا کرتے تھے۔

''پہنچے جو رات خواب میں ان کے مکان پر رسوئے زمیں پہ، آنکھ کھلی آسمان پر۔''[5]

3. **رومانی شاعری سے نفرت:** اپنے خیالات میں پختگی آنے پر انھوں نے طنزیہ لہجے میں لکھا ہے کہ ''استاد حیدر دہلوی، پنڈت امرناتھ سحر، نواب سائل دہلوی اور استاد بیخود کے شاگردوں کی ٹولیاں کہیں جامع مسجد کے چوک اور کہیں ایڈورڈ پارک میں بیٹھی ادبی رسہ کشی میں مصروف نظر آتی تھیں۔ مصرعوں پر تابڑ توڑ گرہ لگانا اور فی البدیہہ شعر کہنا ہی شاعری کی معراج سمجھی جاتی تھی اور شاعری کا موضوع وہی تھا، زلف ورخ کی داستان، ہجر اور وصال کے قصے، عاشق اور رقیب کی کشمکش، محبوب کے جور و جفا کا رونا، غرض کہ وہی مساکیت، جو اردو شاعروں اور شاعری کا ورثہ ہے اور سب کے حصے میں آئی تھی اور سب اسی سالخوردہ محبوب کی لاش سے لپٹے ہوئے تھے، جس کے خط وخال تو کیا، استخواں بھی باقی نہیں رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان شعرا کی محبت ہوا میں معلق ہے، جس پر زمانے کے گرم و سرد کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان شاعروں کا اپنے معاشرے سے کوئی واسطہ نہیں اور اپنے دور کے معاشی اور سیاسی حالات سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی شاعری اور شعر کی طرف اس زاویے کا مجھ پر یقینا ردِ عمل ہوا، اگرچہ یہ ردِ عمل شعوری نہیں تھا۔ میری نظموں میں محبت کی طرف اس طرح کا رویہ اس کی دلالت کرتا ہے: ''اور یہ میری محبت بھی جو ہے عزیز رکل یہ ماضی کے گھنے بوجھ میں دب جائے گی۔'' (نظم 'موت')[6]

اسی نوعیت کی ایک اور مثال قابلِ غور ہے۔ ''تیرے آنسو مرے داغوں کو نہیں دھو سکتے رتیرے پھولوں کی بہاروں سے مجھے کیا لینا۔'' (نظم 'محرومی')[7]

اختر الایمان غزلوں کی بجائے نظموں اور ان میں بھی رو مانیت کی جگہ حقیقت اور سماجی سروکاروں کو نام زد کرنا اپنی شاعری کا نصب العین بنا چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک دم نئے استعارات، علامات وکنایوں میں نادر نظمیں تخلیق کرنا ہی انھیں اب راس آنے لگا تھا، جو کہ ان کی اعلیٰ شاعری کا ایک حاصل بھی ہے اور عوام کے لیے ان کی فکر انگیزی و دقیق خیالی تک نا رسائی چند نقادوں کی غیر واجب تنقیدوں کی بنیاد رہی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''ہماری تشبیہیں، استعارے، تلمیحات اور شعری لوازمات وہی ہیں۔ ہم شاعری کو ابھی تک محفل کی چیز سمجھتے ہیں اور اس کی اچھائی کا اندازہ صرف سن کر لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب خریدنے کی عادت نہیں، کتاب خرید کر پڑھنا ہمارا قومی مزاج اور کردار نہیں بنا۔ کم از کم اردو کی صورتِ حال یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری کے مزاج میں ابھی تک علمی سنجیدگی نہیں آئی ہے اور اس کا اظہار ابھی تک رومانی ہے۔ ہمارے بڑے سے بڑے شاعر کی کوشش یہ ہے، جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دے۔ بات چاہے جہاں سے نکلے، اس کی جوانی تک پہنچ جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پوری شاعری ابھی دل لگی بازی کی نذر ہو رہی ہے۔ یار لوگ بیٹھتے ہیں، معشوق کے قصے سنتے ہیں اور گھر چلے جاتے ہیں۔ نہ کچھ سنجیدہ بات سننے آتے ہیں، نہ کچھ گرہ میں لے کر جاتے ہیں۔ یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آتی۔ ہماری

اختر الا یمان غزلوں کی بجائے نظموں اور ان میں بھی رو مانیت کی جگہ حقیقت اور سماجی سروکاروں کو نام زد کرنا اپنی شاعری کا نصب العین بنا چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک دم نئے استعارات، علامات و کنایوں میں نادر نظمیں تخلیق کرنا ہی انہیں اب راس آنے لگا تھا، جو کہ ان کی اعلیٰ شاعری کا ایک حاصل بھی ہے اور عوام کے لیے ان کی فکر انگیزی ودقیق خیالی تک نا رسائی چند نقادوں کی غیر واجب تنقیدوں کی بنیاد رہی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''ہماری تشبیہیں، استعارے، تلمیحات اور شعری لوازمات وہی ہیں۔ ہم شاعری کو ابھی تک محفل کی چیز سمجھتے ہیں اور اس کی اچھائی کا اندازہ صرف سن کر لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

شاعری کا ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے کوئی دور کا واسطہ بھی ہے، جو کچھ بھی ہے ابھی تک حسن و عشق کا نعرہ ہے۔ میں نے اس بدعت سے بچنے کی کوشش کی ہے اور اظہار کو اکثر جگہ نارومانی اور کھردرا رکھا ہے۔''[8]

ان کی کئی نظمیں دوسری جنگِ عظیم کا ردِ عمل تھیں 'قلوپطرہ'، خاک وخون'، 'ریت کے محل'، 'ایک سوال' (نظم) کا پس منظر بنگال کا قحط ہے۔ نظم 'آزادی کے بعد' اور 'پندرہ اگست' تقسیمِ ملک کی پیداوار ہیں۔''[9] اس کے علاوہ متعدد نظمیں ذاتی حالات سے تعلق رکھتی ہیں۔

4. **علامات و مظاہر اور قارئین سے بے اطمینانی:** اختر الایمان نے بذاتِ خود یہ اعتراف کیا ہے کہ ''میری نظموں کا بیشتر حصہ علامتی شاعری پر مشتمل ہے۔...... اعلامیہ شاعری سیدھی سادی شاعری سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اعلامیہ کا استعمال کرتے وقت شاعر کا رویہ بالکل آمرانہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی اعلامیہ کو کبھی ایک ہی نظم میں ایک سے زیادہ معانی میں استعمال کر جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ کے بظاہر جو معنی ہوتے ہیں، وہ اعلامیہ کی شاعری میں بدل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری نظم 'قلوپطرہ' کا پس منظر دوسری جنگِ عظیم ہے۔ لفظ 'قلوپطرہ' میں نے نہ اس کے تاریخی پس منظر میں استعمال کیا ہے، نہ اس کے اپنے معنوں میں۔ 'قلوپطرہ' کے نام سے جو اخلاقی پستی وابستہ ہے، یہاں اس تصور سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔''[10]

اکثر اختر الاایمان کو یہ گلہ رہا ہے کہ نقادوں نے ان کی شاعری کو، بالخصوص اس کی علامتوں اور استعاروں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کا یہ بیان قابلِ غور ہے۔ ''انھیں سمجھنے کے لیے زیادہ کاوش کی ضرورت ہے۔ کاوش سے میری یہ مراد نہیں کہ یہ نظمیں آپ کے ذہن کی رسائی سے باہر ہیں یا آپ کے فکری معیار سے بلند ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ احباب جو اس شاعری کو رواداری میں پڑھنا چاہتے ہیں اور اس سے وہ لطف لینا چاہتے ہیں، جو قوالی یا سوز خوانی سے میسر آتا ہے، تو مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ یہ شاعری ان کی خواہش کو پورا نہیں کر سکے گی۔ میرے اس بیان سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیے کہ میں اپنی شاعری کو وحی یا عجائبِ روزگار کا درجہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ میرا خونِ جگر ہے۔ اس پر کوئی ایسا حکم نہ لگائیے کہ جو آپ کی غیر ذمہ داری پر دلالت کرتا ہو۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے ایک دو تین بار پڑھیے۔ اپنے آپ کو غزل کی فضا سے نکال کر پڑھیے۔ یہ سوچ کر پڑھیے کہ یہ شاعری مشین میں نہیں ڈھلی۔ ایک ایسے انسانی ذہن کی تخلیق ہے جو دن رات بدلتی ہوئی سیاسی، معاشی اور اخلاقی قدروں سے دوچار ہوتا ہے۔ جو اس معاشرے اور سماج میں زندہ ہے، جسے آئیڈیل نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں عملی زندگی اور اخلاقی قدروں میں ٹکراؤ ہے، تضاد ہے۔ جہاں انسان کا ضمیر اس لیے قدم قدم پر ساتھ نہیں دے سکتا، کہ زندگی ایک سمجھوتے کا نام ہے اور سماج کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی قدریں نہیں، مصلحت ہے اور ضمیر کو چھوڑا اس لیے نہیں جا سکتا کہ اگر انسان محض حیوان ہو کر رہ گیا ہو، تو ہر اعلیٰ قدر کی نفی ہو جائے گی۔''[11]

اس طرح اسلوب کے زاویے سے ان کی بیشتر نظمیں اعلامیہ ہی رہی ہیں۔

5. **نظم 'ایک لڑکا' کا علامتی تجزیہ:** ان کی مقبولِ عام نظم 'ایک لڑکا' انھیں کے بموجب 20-18 سال میں

ہی پوری کی جا سکی تھی۔ اسی نظم کے ضمن میں یہ اپنی نظم ’یادیں‘ کے مرکزی مفہوم کو منسلک کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس نظم کی کچھ سطریں ’ایسی ہی کشمکش اور اخلاقی قدروں میں ٹکراؤ کا نتیجہ ہیں‘‘۔ آگے ان سطور کا حوالہ دیتے ہیں۔...... ’’وہ بالک ہے آج بھی حیراں، میلہ جوں کا توں ہے لگا/ حیراں ہے بازار میں چپ چپ کیا کیا بکتا ہے سودا/ کہیں شرافت، کہیں نجابت، کہیں محبت، کہیں وفا/ آل اولاد کہیں بکتی ہے، کہیں بزرگ اور کہیں خدا/ ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں/ دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں!‘‘[12]

اختر صاحب نے نظم ’ایک لڑکا‘ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ’’نظم ’ایک لڑکا‘ پہلی بار میں نے موضوع کے طور پر محسوس نہیں کی تھی، تصویر کی شکل میں دیکھی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہا ہے اور یہ واقعہ ہی اس نظم کا محرک ہے۔ ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ اس وقت میری عمر تین چار سال کی ہوگی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی میں لادا جا رہا تھا اور میں گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی۔ اس لیے کہ میں اس گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھتا تھا۔ اب سمجھتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے، باغوں میں کھلیان پڑتے تھے، کوئلیں کوکتی تھیں، پپیہے بولتے تھے۔ وہاں جوہڑ تھے، جوہڑ میں نیلوفر کے پھول کھلتے تھے۔ وہاں کھیتوں میں ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی نظر آتی تھیں۔ وہاں وہ سب تھا، جو ذہنی طور پر مجھے پسند ہے۔ مگر وہ معصوم لڑکا اس گاڑی کو روک نہیں سکا۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلا گیا، مگر وہ لڑکا وہیں کھڑا رہ گیا۔‘‘

شاعر نے یہاں ایک لڑکے کے مظہر و دور بینی سے اپنے ہی تشخص کو بیان کیا ہے۔ اس نے آگے چل کر یہ بھی قبول کیا ہے کہ ’’میں نے اس لڑکے کی شخصیت کو روشن کرنا چاہا اور ’ایک لڑکا‘ ضمیرِ انسانیت کا اعلامیہ بن گیا۔۔۔ ایک سال گزر گیا، دو سال، تین سال، چار سال۔۔۔ پھر ایک دن رات کے ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ ذہن میں ایک مصرع گونج رہا تھا۔ یہ لڑکا پوچھتا ہے، ’’اختر الایمان تم ہی ہو؟‘‘۔۔۔ ’’اختر الایمان کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک یہ لڑکا، جو معصوم تھا، دوسرا وہ، جس نے دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ میں نے نظم کا پہلا بند لکھا اور سو گیا۔‘‘[13]

شاعر کی ادب شناس شریکِ حیات سلطانہ ایمان نے ’کلیاتِ اختر الایمان‘ کے ’پیش لفظ‘ میں لکھا ہے کہ ’’مشہورِ زمانہ مصور جناب مقبول فدا حسین نے از راہِ کرم اپنے ہم عصر اختر الایمان کے آخری مجموعے ’زمستاں سرد مہری کا‘ کے گرد پوش (سرورق، Title) کے لیے ایک نہایت خوبصورت تصویر بنائی تھی۔ اس تصویر کو ہم نے ’کلیات‘ کے گرد پوش کے لیے بھی چنا ہے۔ غور سے دیکھنے پر ایسا لگتا ہے کہ یہ تصویر نہ صرف اختر الایمان کی نظم ’ایک لڑکا‘ کی عکاسی کرتی ہے، بلکہ ان کی نظموں کی طرح علامتی بھی ہے۔ مثلاً تصویر میں سرخ رنگ خون کے رنگ کی مناسبت سے ہمیں زندگی کی علامت دکھائی دیتا ہے اور سیاہ ٹکڑا ہمارے قلب کی سیاہی کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے، جس کی نفی ہمارا ضمیر کرتا رہتا ہے۔‘‘[14]

6. **نظموں میں حقیقت نگاری**: اختر الایمان نے خود اپنی چند مخصوص نظموں کی تشریح کی ہے۔ مثلاً وہ نظم ’رویائے صادقہ‘ کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ’’مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے آدمی زمین پر رہتا ہی نہیں، کرم یا عمل کرتا ہے زمین پر رہ کر اور اس کا پھل ڈھونڈھتا ہے آسمانوں میں، سورگ اور جنت کی شکل میں۔ اس لیے اس کا زمین سے صحیح رابطہ پیدا ہی نہیں ہوا اور ’رویائے صادقہ‘ اسی فکر اور جذبے کا نتیجہ ہے۔‘‘

> **نظم ’پندرہ اگست‘ میں اختر الایمان نے ہندوستان میں لوگوں کے خوابوں کے ٹوٹنے کی داستان کو قلم بند کرنے کی ایک کامیاب سعی کی ہے۔ ان کے الفاظ پر ساحر لدھیانوی اور فیض احمد فیض جیسے چند ایک شعرا کے طنز آمیز اندازِ بیاں کا اثر لائقِ تحسین کہا جاسکتا ہے۔ کچھ قابل غور سطور یہ ہیں۔ ’’یہی دن ہے جس کے لیے میں نے کاٹی تھیں آنکھوں میں راتیں/ یہی سیلِ آب بقا، چشمۂ نور ہے، جلوۂ طور ہے وہ؟/ اسی کے لیے وہ سہانے مدھر رس بھرے گیت گائے تھے میں نے یہی ماہ وش نشۂ حسن سے چور، بھر پور، مخمور ہے وہ...... وہی کسمپرسی، وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری/ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے۔**

’’نظم ’کارنامہ‘ آدمی کے منفی عمل کے مظاہرے کی انتہا ہے۔ اپنی شکست اور نارسائی کا حیوانی ردِ عمل، موضوع کے ساتھ زبان کا صحیح استعمال نہ ہو تو اس کی شدت اور شعری حسیت میں کمی آ جاتی ہے۔ ’کارنامہ‘ اور ’خمیر‘ میں اسی بات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔...... شاعری کے ساتھ بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ وہ ابھی تک غزل کی فضا سے نہیں نکلی۔ یہ بات اس لیے دہرانی پڑ رہی ہے کہ کچھ دوستوں کو جب ’خمیر‘ اور ’کارنامہ‘ سنائی تو ردِ عمل تھا زبان ویسی ہے۔ ویسی کا مطلب تو میں سمجھ گیا، مگر ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ ان کے ذہن میں غزل کی غنائیت تھی۔‘‘ اس سے آگے وہ ایک اور قابلِ غور بات یہ کہتے ہیں کہ ’’میں نے کچھ نظموں کی وجہِ تخلیق کی نشان دہی کی ہے، مگر وضاحت طلب کچھ اور بھی نظمیں ہیں: ’نہ مرنے والا آدمی‘، ’خمیر‘، ’تسلسل‘، ’ارضِ ناکس‘، وغیرہ۔ مگر شاعری سمجھنے کی چیز نہیں۔ زیادہ سے زیادہ لفظوں کے معنی بتائے جا سکتے ہیں، وہ تو لغت میں بھی مل جائیں گے، مگر نظم لفظوں تک محدود نہیں ہوتی، اس سے کہیں آگے تک ہوتی ہے۔ لغوی اور اصطلاحی معنوں کے علاوہ لفظوں کی تہہ داری ایسا پھیلا ہوا عمل ہے۔ اس کی وضاحت کرو تو بچکانا پن محسوس ہونے لگتا ہے اور پڑھنے والے کا ذہن وہاں تک نہ پہنچے، تو نظم اپنا بھر پور مفہوم گنوا دیتی ہے۔ ایمائیت، اعلامیہ لفظی تصویر میں داستانوں سے ربط اور پھر ان داستانوں کا پھیلاؤ۔ ہفت خواں طے کرنے والی بات ہو جاتی ہے۔‘‘[15]

اسی طرح نظم ’پندرہ اگست‘ میں اختر الایمان نے ہندوستان میں لوگوں کے خوابوں کے ٹوٹنے کی داستان کو قلم بند کرنے کی ایک کامیاب سعی کی ہے۔ ان کے الفاظ پر ساحر لدھیانوی اور فیض احمد فیض جیسے چند ایک شعرا کے طنز آمیز اندازِ بیاں کا اثر لائقِ تحسین کہا جا سکتا ہے۔ کچھ قابل غور سطور یہ ہیں۔ ’’یہی دن ہے جس کے لیے میں نے کاٹی تھیں آنکھوں میں راتیں/ یہی سیلِ آبِ بقا، چشمۂ نور ہے، جلوۂ طور ہے وہ؟/ اسی کے لیے وہ سہانے مدھر رس بھرے گیت گائے تھے میں نے یہی ماہ وش نشۂ حسن سے چور، بھر پور، مخمور ہے وہ...... وہی کسمپرسی، وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری/ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے۔/ ابھی تو وہی رنگِ محفل، وہی جبر ہے ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں/ جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو، یہ وادیِ رنگ بھی میری منزل نہیں ہے/ شہیدوں کا خوں اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے/ جسے تم اٹھائے لیے جا رہے ہو‘‘ یہ شب کا جنازہ نہیں ہے۔‘‘[16]

ان کی نظموں میں دورِ حاضر کے مسائل کی عکاسی جابہ جا ملتی ہے۔ مثلاً آج کا صاحبِ مقدور شخص اپنے کو کسی خدا سے کم سمجھتا! اسی ذہنیت پر گہرا طنز کرتے ہوئے وہ جو کہتے ہیں، اس سے سنسکرت زبان کے شاستروں میں کہا ہوا یاد آتا ہے کہ آج کل مذاہب بھی اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ ایک عام آدمی تو بوکھلا کر ہی رہ گیا ہے کہ وہ کس مذہب یا کس دیوتا کی عبادت کرے اور کس کی نہ کرے؟ سنسکرت کے شلوک کی لائن دیکھیں: ’’کسمعی دیوائے ہِوشا وِدھیم؟‘‘ معنیٰ یہ کہ ہم اپنے جگ کے ہون میں کس دیوتا کے لیے آہوتی ڈالیں؟‘‘ آج کی زبان میں طنز کا مدعا یہ ہے کہ ہم کس مذہب کو تسلیم کریں یا پھر کس

صاحب کو سلام کیا کریں؟

اپنی نظم 'تنہائی میں' شاعر تذبذب کی حالت میں کہتا ہے کہ :''یا کہیں گوشۂ اہرام کے سناٹے میں/ جا کے خوابیدہ فراعین سے اتنا پوچھوں/ ہر زمانے میں کئی تھے کہ خدا ایک ہی تھا/ اب تو اتنے ہیں کہ حیران ہوں کس کو پوجوں؟''[17]

اسی طرح 'پگڈنڈی' عنوان والی نظم سے یہ اقتباس قابلِ غور ہے: ''غم دیدہ پسماندہ راہی تاریکی میں کھو جاتے ہیں/ پاؤں راہ کے رخساروں پر دھندلے نقش بنا دیتے ہیں/ آنے والے اور مسافر پہلے نقش مٹا دیتے ہیں/ وقت کی گرد میں دبتے دبتے ایک فسانہ ہو جاتے ہیں۔'' اس سے آگے شاعر اختر انسان کی حد درجے کی بے بسی اور کسمپرسی کا اظہار کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں سوال پر سوال کیے جاتے ہیں: ''یہ سورج چاند ستارے راہیں روشن کر سکتے ہیں؟/ تاریکی آغازِ سحر ہے تاریکی انجام نہیں ہے؟/ آنے والوں کی راہوں میں کوئی نور آشام نہیں ہے/ ہم سے اتنا بن پڑتا ہے، جی سکتے ہیں مر سکتے ہیں؟''[18]

اختر الایمان کے سنہ 1942 میں شائع ایک افسانے (جو غالباً نظم کی تصنیف سے قبل ہی شائع ہوا تھا) کا عنوان ہی ہے 'پگڈنڈی'، افسانے کے اس اقتباس سے اس نظم کے اصل محرک کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے:- ''پگڈنڈیاں لجاتی، ان دیکھی وادیوں سے کتراتی چلی جاتی ہیں، دور بہت دور تک اور بڑھتے بڑھتے آسمان سے جا ملتی ہیں۔ چلنے والے ان پگڈنڈیوں اور آسمان کے درمیان کہیں کھو جاتے ہیں، اس طرح کہ نقش قدم تک بھی نہیں چھوڑتے''...... ''آدمی کا جسم بھی ایک پگڈنڈی ہے، جس پر سے مختلف دور گزر جاتے ہیں، بچپن، جوانی۔ بڑھاپا اور جھریوں کی شکل میں اپنا راستہ چہرے پر چھوڑ جاتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے، سب کھو جاتے ہیں، اس زمین اور آسمان کے درمیانی خلا میں، ہوا کے ایک لطیف کرہ میں۔''[19]

آدمی کے جسم کو ایک 'پگڈنڈی' سے تشبیہ دینا اختر الایمان کا ہی شاعرانہ تخیل اور حصہ ہو سکتا ہے۔

7. **خودغرض فطرت پر طنز** : چند ایک کو چھوڑ کر ہر شخص کم و بیش خودغرض ہوا کرتا ہے، لیکن کئی بار یہ خود غرض اشخاص عام انسانیت کی حدود پار کر کے حیوانیت کے علاقے میں دخل دینے کے موجب ہماری ہمدردی سے بھی محروم ہو کر رہ جایا کرتے ہیں۔ شاعر اختر الایمان ایک حساس فطرت وطبیعت کے مالک ہونے کی وجہ سے چھوٹی سی چھوٹی حرکت سے اپنے دل و دماغ پر ایک ضرب محسوس کیا کرتے تھے اور قارئین کی سرد مہری سے حیران و پریشان رہا کرتے تھے، اسی طرح لوگوں کی حد درجے کی خودغرض فطرت سے بھی نالاں رہا کرتے تھے۔ دو مخصوص نظارے انھیں برسوں 'ہانٹ (Haunt)' کرتے رہے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے ''میں نے ایک زمانہ ہوا، ایک فلم دیکھی تھی۔ جب مردے کی چِتا کو آگ دی گئی، جنازے میں شریک ہونے والوں میں سے ایک اسی آگ پر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ یہ منظر میں نے اس وقت دیکھا جب امجد خان (اختر الایمان کا جواں سال داماد و مشہور اداکار) کا اچانک انتقال ہوا۔ جنازہ اٹھانے کے وقت ہر ایکٹر کی کوشش تھی کہ وہ پہلے جنازے کو کاندھا دے، اس لیے کہ چاروں طرف کیمرے لگے ہوئے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ ہر ایکٹر تصویر کھنچوانے کا خواہشمند تھا۔''[20]

8. **زبردست یادداشت** : اختر الایمان حیرت انگیز یاد

اختر الایمان کے سنہ 1942 میں شائع ایک افسانے (جو غالباً نظم کی تصنیف سے قبل ہی شائع ہوا تھا) کا عنوان ہی ہے 'پگڈنڈی'، افسانے کے اس اقتباس سے اس نظم کے اصل محرک کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے:- ''پگڈنڈیاں لجاتی، ان دیکھی وادیوں سے کتراتی چلی جاتی ہیں، دور بہت دور تک اور بڑھتے بڑھتے آسمان سے جا ملتی ہیں۔ چلنے والے ان پگڈنڈیوں اور آسمان کے درمیان کہیں کھو جاتے ہیں، اس طرح کہ نقش قدم تک بھی نہیں چھوڑتے'' ...... ''آدمی کا جسم بھی ایک پگڈنڈی ہے، جس پر سے مختلف دور گزر جاتے ہیں، بچپن، جوانی- بڑھاپا اور جھریوں کی شکل میں اپنا راستہ چہرے پر چھوڑ جاتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے، سب کھو جاتے ہیں، اس زمین اور آسمان کے درمیانی خلا میں، ہوا کے ایک لطیف کرہ میں۔

داشت کے مالک تھے۔ ان کی ایک نظم 'تشخیص' میں لفظ 'مرض' کا استعمال ہوا ہے۔ بیدار بخت ان کی بابت اپنے مقالے 'کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ' میں ان کی کمال کی یادداشت کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''صبح ڈائی اے لی سس کے لیے گئے۔ دوپہر کے قریب واپس آ کر سو گئے...... تھوڑی دیر بعد میں نے وہ نظم سنائی، جو ابھی اتاری تھی، اس کا عنوان ایک بیاض میں 'مریض' تھا اور دوسری میں 'تشخیص' اور تیسری میں اس کے کئی مسودے تھے، جن کا عنوان صرف ایک نظم لکھا ہوا تھا۔ ایسی ذہنی کیفیت کے باوجود کہ جس میں صبح شام میں فرق کرنا مشکل ہو، انھیں یہ یقین کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ نظم کا آخری مسودہ وہ تھا، جس کا عنوان 'تشخیص' تھا۔ اس نظم میں ایک مصرع ہے :-''میرا مرض نہیں پہچانتا یہاں کوئی۔''......''میں (بیدار بخت) اپنے نیم خواندہ ہم عصروں کی طرح لفظ 'مرض' کو بروزن 'فرض' جانتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ''اختر بھائی، مرَض؟'' تو فوراً حافظ کا ایک شعر سند میں سنایا کہ لفظ کا تلفظ وہی تھا، جو انھوں نے باندھا تھا۔ میری حیرانی بڑھ گئی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی کو ایسی بحرانی ذہنی کیفیت کے باوجود حافظ کا شعر یاد رہے۔ اس سے الفاظ کے صحیح تصرف کے تئیں شاعر کی سنجیدگی و احتیاط کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔ نظم 'تشخیص' کا ایک مسودہ، جس کا عنوان 'ایک نظم' ہے، اس کا ایک اقتباس پیشِ نظر ہے:'' مجھے یہ کون سے دارالشفا میں لائے ہو/ یہاں تو بھیڑ ہے اک زرگزیدہ لوگوں کی/ جو اپنے زخم کے مرہم کی جستجو میں ہیں/ علاج اس کا تو ممکن نہیں زمیں پہ ابھی/ یہ زرگزیدگی ایسا مرض ہے جس کے سبب/ بہت سے اور مرض جسم میں ابھرتے ہیں/ ہر ایک موڑ پہ، راہوں میں کتنے جاں بلب/ پڑے کراہتے ہیں لا دوائی کے ہاتھوں/ بشر گزیدہ ہوں میں لے چلو یہاں سے مجھے/ مرا مرض نہیں پہچانتا یہاں کوئی۔'' (تخلیق کی تاریخ ہے 12 مارچ 1994)۔[21]

'کلیاتِ اختر الایمان' میں آخری سطور میں کچھ تبدیلی نظر آتی ہے:- ''یہ زرگزیدہ ہیں کچھ طالبِ ہوا و ہوس/ مریض جو نظر آتے ہیں آس پاس مرے/ گراں گزرنے لگا ہے مجھے ہر ایک نفس/ سب اپنے درد کے درماں کی جستجو میں ہیں/ کسی اک ایسی جگہ دن لگے نہ ایک برس/ وہاں چلو کہ طبیعت کو کچھ قرار آئے/ ہر ایک ڈوبتے منظر پہ کچھ نکھار آئے/ کوئی بھی آرزو پلٹے نہ سوگوار آئے/ مرا مرض نہیں پہچانتا یہاں کوئی۔''[22]

اس طرح اس شاعر نے الفاظ کے تصرف اور تلفظ پر خاص توجہ دی ہے اور اپنی قوت یا دداشت کے پختہ ثبوت بھی فراہم کیے ہیں۔

9. **شخصیت کے دیگر پہلو** : اختر الایمان کی شخصیت میں جہاں ایک جانب انسان اور انسانیت کے تئیں از حد احترام کا جذبہ تھا، وہاں فیض احمد فیض کی مانند چند غیر معمولی عادات بھی تھیں جن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان کی شریکِ حیات سلطانہ ایمان نے 'کلیاتِ اختر الایمان' کے 'پیش لفظ' میں یہ درج کیا ہے کہ ''شادی کے بعد مجھے ان کی چند عجیب عادتوں کا پتہ چلا۔ رات گئے کبھی میری آنکھ کھل جاتی، تو برابر کے پلنگ پر ان کو نہ پا کر پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ پھر ایک دن اٹھ کر دیکھا، باہر کے کمرے میں بیٹھے نظم لکھ رہے تھے۔ میں دبے قدموں ان کے پاس گئی اور آہستہ سے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک گئے اور لکھنا بند کر دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے انھیں 'ڈسٹرب' کر دیا۔ چنانچہ واپس اپنے کمرے میں آ کر سو گئی۔ صبح کو انھوں نے اپنی نظم

مکمل کرنے کو پنسل مانگی۔ میں نے میز پر پڑی ہوئی پنسلوں میں سے ایک اٹھا کر دے دی، مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب انھوں نے کہا، رات والی پنسل تلاش کر کے دوں، جو کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی تھی جس پنسل سے نظم شروع کی تھی، اسی سے ختم ہو سکتی تھی'۔

آگے بھی لکھتی ہیں کہ "طالب علمی کے زمانے سے اختر الایمان سگریٹ بہت پیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک ہونٹوں میں سگریٹ نہ دبی ہو اور اس کا دھواں آنکھوں میں نہ جاتا رہے، نظم نہیں کہہ سکیں گے۔ ان ساری عادتوں کے ساتھ ان میں ایک بہت اچھی عادت تھی کہ جب انھیں احساس ہونے لگتا کہ کسی چیز کے عادی ہو رہے ہیں، تو اسے چھوڑنے کی شعوری کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ جب انھیں احساس ہونے لگا کہ شاعری ٹوٹکوں سے نہیں، دل و دماغ اور احساس سے کی جاتی ہے، تو انھوں نے وہ عادتیں چھوڑ دیں، جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ سگریٹ چھوڑ دی اور پنسل کی جگہ فاؤنٹین پین نے لے لی۔ مجھے بھی پنسل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سنبھال سنبھال کر رکھنے کی پریشانی سے نجات مل گئی۔"23

وقتاً فوقتاً اختر الایمان کو تنگ دستی کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ انھیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی نے یہ امر بھی واضح کیا ہے۔ "ہماری زندگی اور بہت لوگوں کی طرح اچھے برے سب مقامات سے گزری۔ کبھی یہ پریشانی تھی کہ اگلے وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا۔ کبھی ایسی آسودگی بھی آئی کہ چیز خریدتے وقت یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ مہنگی ہے یا سستی۔ کبھی اختر الایمان کی صحت قابلِ رشک تھی، تو کبھی ہفتوں ہسپتال میں رہے۔ مگر ان سب حالات میں ایک چیز مشترک تھی ان کی شاعری۔ حالات کیسے بھی ہوں، مگر اختر الایمان نے شاعری کبھی نہیں چھوڑی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ ان کے زندہ رہنے کا مقصد صرف شاعری تھا۔"

اس شاعر نے شاعری سے اپنے شدید لگاؤ کے ہی سبب اپنی بیٹی رخشندہ کے نام سے ایک پبلشنگ ہاؤس بھی قائم کیا تھا اور اپنی چند کتابیں بھی شائع کی تھیں۔ سلطانہ نے اول الذکر دیباچہ کے تحت کہا ہے کہ "اختر الایمان دوسرے شاعروں کی طرح شعر کہہ کر سنانے کے لیے بے چین نہیں ہوتے تھے، مگر انھیں اس بات کا خیال ضرور رہا کہ ان کی تخلیق کتابی شکل میں دستیاب رہے۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے 1961 میں خود اپنا اشاعتی ادارہ رخشندہ کتاب گھر قائم کیا، جس نے ان کے شعری مجموعے یادیں، بنت لمحات، نیا آہنگ، سرو ساماں اور 'زمین زمین' شائع کیے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس اشاعتی ادارے کا مقصد کاروباری نہیں تھا۔ میرے خیال سے اس کا محرک ایک فرض کا احساس تھا کہ ان کی کتابیں چھپتی رہیں اور سلیقے سے چھپیں...... وفات سے ایک دو سال پہلے انھوں نے مجھ سے اور بیدار بخت سے خواہش ظاہر کی کہ ایسا ٹرسٹ قائم کیا جائے، جو ان کی کتابیں چھاپتا رہے۔ بیدار سے کہا کہ "چھاپنے کا بندوبست تم کرنا"، میری لڑکیاں اور لڑکا مل کر چھاپنے کے پیسے دیں گے" بوجوہ ٹرسٹ تو قائم نہ ہو سکا، مگر خدا کا شکر ہے کہ اختر الایمان کی کتابیں برابر چھپ رہی ہیں۔"24

10. **ایک نامکمل عشق**: اختر الایمان کو زندگی میں کسی لڑکی سے باقاعدہ عشق تو کبھی نہ ہوا تھا، لیکن شفقی موسومہ ایک حسینہ کے تئیں خاص رغبت کے اشارے ضرور مل جاتے ہیں۔ اس حسینہ کی بابت اختر الایمان نے خود اعتراف کیا ہے۔ "شفقی قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے رویہ میں وہ دبا دبا پن یا کھنچاؤ نہیں تھا، جو عام طور پر درمیانے طبقے کی لڑکیوں میں ہوتا ہے، جو بات کرتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے سر پر کوئی بوجھ

وقتاً فوقتاً اختر الایمان کو تنگ دستی کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ انھیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی نے یہ امر بھی واضح کیا ہے۔ "ہماری زندگی اور بہت لوگوں کی طرح اچھے برے سب مقامات سے گزری۔ کبھی یہ پریشانی تھی کہ اگلے وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا۔ کبھی ایسی آسودگی بھی آئی کہ چیز خریدتے وقت یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ مہنگی ہے یا سستی۔ کبھی اختر الایمان کی صحت قابلِ رشک تھی، تو کبھی ہفتوں ہسپتال میں رہے۔

رکھا ہے۔ 'من لبھائے منڈیا ہلائے'۔ شفقی آرام سے باتیں کرتی تھی۔ ہم دوست ہو گئے۔ بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ وہ مجھے اچھی بھی لگتی تھی۔ آنکھوں میں تھوڑا سا نیلا پن تھا۔ مسکراتی تھی، تو بہت بھلی لگتی تھی۔ 25

نظم 'شفقی' کے آخری دو مصرعے اس طرح ہیں: "آگ ہے میرے پاؤں کے نیچے، دُکھ سے چور مری سانس سانس ہے/ ایک دفعہ دیکھا ہے اس کو، ایک دفعہ کی اور ہوس ہے۔"26

اصل میں اختر الایمان دورِ حاضر کے ایک مقبول ترین شاعر اور مکالمہ نگار رہے ہیں۔ ان میں غضب کی استعداد و قابلیت ہونے پر بھی فلمی صنعت میں اپنا کوئی خاص گروہ نہ ہونے کے موجب اتنی مقبولیت نہ مل پائی جس کے وہ مستحق تھے۔ انھوں نے نثر نگاری میں بھی علم بلند کیے بطور نمونہ ایک مختصر ٹکڑا پیش کیا جا رہا ہے، جس سے ان کی نثر نگاری کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ ان کے ذاتی خیالات کی بھی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں "میں ایک مدت سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسائل جوں کے توں رہتے ہیں۔ آدمی مرتا کھپتا رہتا ہے۔ وقتی طور پر ان مسائل کا کوئی حل نکل آتا ہے، مگر اس حل سے کچھ اور نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔"

انگریزی ڈراما نگار جارج برنارڈ شاہ نے بھی کہیں لکھا ہے کہ "ہم زندگی کا کوئی بھی مسئلہ دس نئے مسئلے پیدا کیے بنا حل نہیں کر سکتے ہیں۔"

اختر الایمان آگے فرماتے ہیں کہ "زندگی کا کوئی بڑا مقصد نہیں۔ یہ زمین پر محض اتفاقی اور حادثاتی ہے۔ اس زمین پر خیالات کا اور تصورات کا جو بھی منصوبہ ہے، وہ انسان کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کو ایک مقصد دینا چاہتا ہے۔ اس لیے مسلسل ادھیڑ بن میں مصروف رہتا ہے۔ روٹی کی تلاش اور جنس کی لذت کے حصول کے بعد اس کے پاس اور کچھ نہیں بچتا۔ اس لیے وہ روز نئے مسائل اٹھاتا رہتا ہے اور خوش ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد پورا کر رہا ہے۔"27

یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ علما و فضلا کسی ذاتی و مادی مفاد کے بغیر رات دن تن دہی سے ادب و شاعری کی خدمت کیے جاتے ہیں۔

اس پورے منظر میں اختر الایمان کے شہرۂ آفاق دستخط بھی نمایاں ہیں۔

حواشی

1. کتاب 'ہندوستانی فلمیں اور اردو' (ادبی زاویے)، ص تمثیل نو پبلیکیشن، گنگوارہ پوسٹ، سارا موہن پور، ضلع دربھنگہ، 846007، اشاعت اول، سنہ 2012، ص 184 2. کلیاتِ اختر الایمان'، مرتبہ سلطانہ ایمان و بیدار بخت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6 سنہ اشاعت 2000 ص 565)، 3. ایضاً ص 420، سنہ 1979 میں تخلیق کی گئی نظم 'ڈاسنہ سٹیشن کا مسافر'۔ 4. ایضاً ص 565-566، 5. ایضاً ص 25، 6. ایضاً ص 25-26، 7. ایضاً ص 66، 8. ایضاً ص 69، 9. ایضاً ص 31، 10. ایضاً ص 27، 11. ایضاً ص 27-28، 12. ایضاً ص 22-23، 13. ایضاً نظم، ص 23، 14. ایضاً ص 28-29 حوالہ 'یادیں' مجموعہ کا دیباچہ۔ 15. ایضاً ص، پیش لفظ 17، 16. ایضاً حوالہ مجموعہ 'زمین زمین'، اشاعت سنہ 1990، ص 40، 17. ایضاً نظم 'پندرہ اگست'، ص 211، 18. ایضاً ص 21، نظم 'تنہائی میں'، حوالہ، مجموعہ 'آب جو' کا دیباچہ، 19. ایضاً نظم 'پگڈنڈی' ص 97، 20. ایضاً فٹ نوٹ (حواشی)، ص 22، 21. ایضاً ص 51، حوالہ، مجموعہ 'اس آباد خرابے میں' ص 235-236، 22. ایضاً نظم 'تشخیص'، ص 519، 23. ایضاً ص، 43، بیدار بخت کا مقالہ 'کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ؟" ص 543، 24. ایضاً، سلطانہ ایمان، 'پیش لفظ' ص 15-16، 25. ایضاً ص 16، 26. ایضاً ص 45، حوالہ مجموعہ 'اس آباد خرابے میں'، سنہ 1996 ص 76، 27. ایضاً، مجموعہ 'یادیں'، نظم 'شفقی'، ص 244، 28. ایضاً ص 49 حوالہ، مجموعہ "اس آباد خرابے میں" ص 175

■

Dr. Krishan Bhavuk, 201-A. GuruNanak Nagar, Street No.18-K, Patiala-147003 (Punjab)

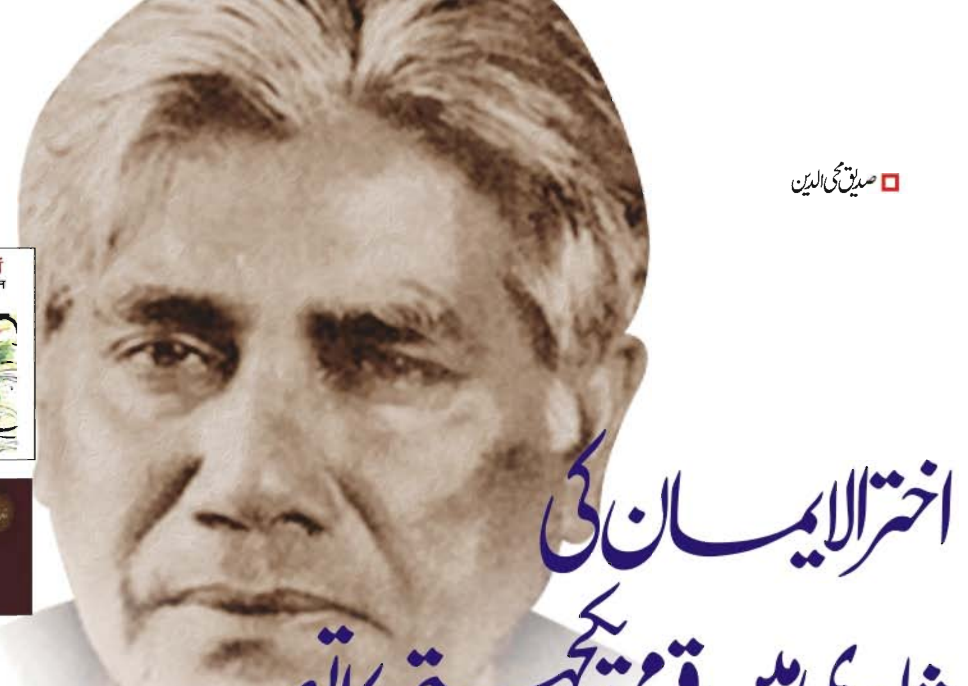

صدیق محی الدین

اخترالایمان کی شاعری میں قومی یکجہتی کا تصور

اخترالایمان بیسویں صدی کی اُردو شاعری میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ جس دور میں انھوں نے شاعری شروع کی، ہندوستانی سماج میں انگریزی سامراجیت کے خلاف تحریکِ آزادی کی جدوجہد شدید ہوچکی تھی۔ اگرچہ اُن سے پہلے اقبال، چکبست، جوش، تلوک چند محروم وغیرہ نے ہندوستان کی آزادی اور قومی یکجہتی کے تصور کو اپنے مخصوص انداز میں عام کیا تھا۔ بعد کے شعرا میں بھی قومی یکجہتی کا یہ تصور بدلے ہوئے سماجی اور سیاسی پس منظر میں قائم رہا، یہاں تک کہ حصولِ آزادی اور اس کے بعد بھی اُردو شاعری میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اخترالایمان کی شاعری کا مطالعہ کریں تو اُن کی شاعری میں بھی قومی یکجہتی کے تصورات شدید طور پر پائے جاتے ہیں۔ اخترالایمان کی شاعری کا آغاز یوں تو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی ہوتا ہے، لیکن وہ اس تحریک سے عملی یا تنظیمی طور پر وابستہ نہیں رہے۔ اگرچہ اس دور کے مسائل، موضوعات و رجحانات سب کے لیے مشترک تھے۔ لیکن ہر شاعر کا اندازِ نظر اور طرزِ اظہار جُداگانہ تھا۔ حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ شعرا نے بھی اپنے دور کے مسائل و تقاضوں سے یکسر چشم پوشی نہیں کی۔ مگر اخترالایمان اس حلقے میں بھی شامل نہیں رہے۔

اخترالایمان کی شاعری کا آغاز رومانوی افسردگی، ناکامی اور حرماں نصیبی کی کیفیات وجذبات سے ہوا، اور یوں اس میں غم ذات کا پرتو زیادہ نظر آتا ہے۔ اُن کے پہلے مجموعے ’گرداب‘ کی نظموں سے یہی تاثر قائم ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس مجموعے کی نظمیں ’مسجد‘، ’پرانی فصیل‘، اور ’قلوپطرہ‘ اُن کے سماجی اور قومی شعور کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ نظمیں اُن کی قومی اخوت، انسان دوستی اور انسانی دردمندی کی ترجمان ہیں۔

شاعر عصری معاشرے کے تضادات، مادہ پرستی، غربت اور معاشی پسماندگی وعدم مساوات کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ مسجد مذہبی اقدار کے معدوم ہونے کی علامت ہے۔ آج کا انسان مادہ پرستی اور حصولِ زر کے پیچھے دیوانہ ہے۔ مذہبی و اخلاقی اور اعلیٰ انسانی اقدار بے معنیٰ اور غیر اہم ہوکر رہ گئے ہیں۔ نظم مسجد کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

آچکے صاحبِ افلاک کے پیغام و سلام
کوہ و در اب نہ سنیں گے وہ صدائے جبریل
اب کسی کعبے کی شاید نہ پڑے گی بنیاد
کھو گئی دشت فراموشی میں آوازِ خلیل

نظم ’پرانی فصیل‘ عصری معاشرے کے تضادات کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ تضادات مختلف صورتوں میں سامنے آتے ہیں۔ بے روزگاری غربت معاشی بدحالی جہالت، بڑھتی آبادی اور شہری زندگی کے مسائل سے معاشرہ بھی تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے۔ معاشرے کی ایک تصویر ملاحظہ کیجیے:

وہاں سہمی ہوئی ٹھٹھری ہوئی راتوں نے دیکھے ہیں
دریدہ پیرہن عصمت نگوں سر، بال آوارہ
گریباں چاک، سینہ وا، بدن لرزاں، نظر خیرہ
خمِ ابرو میں درماندہ جوانی محوِ نظارہ

غربت، معاشی پسماندگی اور بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ بے روزگاری عصری معاشرے کے سنگین مسائل ہیں، شاعر کی یہ انسانی ہمدردی اور غمخواری ہے کہ یہ مناظر دیکھ کر وہ رقت آمیز انداز میں اُن کا اظہار کرتا ہے۔ اس بدحالی کو خوش حالی میں بدلنے کی شاعر کی شدید خواہش ہے۔ یہ قومی دردمندی اور اہلِ وطن سے محبت ہی ہے جس کا اظہار شاعر نے اس طرح کیا ہے:

کہیں روتے بھٹکتے پھر رہے ہیں، ہر طرف ہر سُو
غلاظت آشنا، جھلسے ہوئے انسان کے پلّے
یہ وہ ہیں جو نہ ہوتے تو کوکھ پھٹ جاتی مشیت کی
تمناؤں میں اُن کی رات دن کھینچے گئے چلّے
غرض اک دور آتا ہے کبھی اک دور جاتا ہے
مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں

’گرداب‘ کے بعد اخترالایمان کے شعری رویے اور فکر میں نمایاں تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے۔ انفرادی محرومی، شکستگی اور رومانی فکر سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اب وہ سماجی اور عصری زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرتے ہیں۔ اُن کے مجموعے ’تاریک سیارہ‘ میں شامل بہت سی نظمیں عصری شعور معاشرے کے عصری مسائل کی ترجمان نظر آتی ہیں۔ تاریک سیارہ کی اشاعت 1952 میں عمل میں آئی۔ ظاہر ہے اس میں آزادی سے پہلے اور بعد کا کلام بھی ہے۔ اس دور میں ملکی اور عالمی طور پر غیر معمولی تغیرات رونما ہوئے ہیں۔ ملکی سطح پر جہاں تحریکِ آزادی کی شدت، سول نافرمانی، 1942 کی بھارت چھوڑو تحریک، اور پھر ملکی آزادی کا حصول اور اس کے ساتھ ہی تقسیمِ ملک کا سانحہ، اور پھر برصغیر ہندو پاک میں فسادات اور قتل و غارت گری، ہجرت جیسے سنگین مسائل پیدا ہوئے۔ 1857 کے بعد ایسا غیر معمولی تغیر ہندوستان میں آزادی کے بعد ہی رونما ہوا۔ غدر کا ہنگامہ ایک غیر ملکی سامراجی طاقت کے خلاف تھا، جس کے نتیجے میں ہندوستانی عوام ہی تباہ و برباد ہوئے۔ لیکن تقسیمِ وطن کے بعد ہندو مسلم ہی ایک دوسرے کو ختم کررہے تھے۔ جنھوں نے ایک ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑی تھی، اب ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ ہجرت کی وجہ سے لاکھوں لوگ اپنے وطنِ عزیز سے جدا ہو رہے تھے۔

عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات میں دوسری جنگِ عظیم کی ہولناکی سامنے آچکی تھی۔ اختر الایمان نے ایک حساس انسان کی طرح ان تمام واقعات کو محسوس کیا، اور مختلف انداز میں انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ بطورِ خاص برصغیر ہندو پاک کے حالات تقسیم کے بعد کافی بحرانی اور غیر یقینی ہو گئے تھے۔ اختر الایمان نے ان سب واقعات کو انسانی دردمندی اور خیر خواہی کے حوالے سے دیکھا، ایک سچے قوم پرست اور انسان دوست فنکار کی طرح اپنی شاعری میں اُن کی ترجمانی کی۔

نظم 'تاریک سیارہ' میں اختر الایمان نے اپنے عہد کی اسی بد حالی اور بنی نوع انسان کے درد و کرب کو پیش کیا ہے۔ آزادی کے پہلے جو حسین خواب اس ملک کے لوگوں نے دیکھے تھے وہ اچانک خاک و خون میں ڈوب گئے، لوگوں کو اپنی جان کا تحفظ غیر یقینی معلوم ہونے لگا۔ بقول شاعر:

ہر نفس خواب ہے ہر خواب حقیقت کا فریب
اک تماشا ہے نگاہوں کا، نہ ماضی ہے نہ حال
آج ماضی ہے وہی دور، جو فردا تھا کبھی
موت ملتی ہے تمناؤں کے چہرے پہ گلال!''

''جو سمجھتے ہیں حقیقت کو فقط نقشِ خیال
تم بھی ہو، اور بھی ہیں، ایک ہے انبوہِ کثیر
جو ابھی تک ہے پسِ پردۂ تاریکی شب
جو ابھی تک ہے زمیں چھوڑ کے تاروں کا اسیر!''

لیکن اختر الایمان ایک عظیم تخلیق کار ہیں، اُن کے تخلیقی عمل میں ایک نوع کا رجائی پہلو واضح ہو جاتا ہے، وہ قاری کو مایوس اور افسردہ نہیں کرتے، بلکہ خوش آئند مستقبل کی نوید سناتے ہیں۔ اگرچہ اس زمین کو انسان نے تیرہ و تار کر دیا ہے، لیکن ظلمتِ شب سے سحر کے آثار نمایاں ہیں۔ اب یہ انسانیت کے خیر خواہوں کا فریضہ ہے کہ انسان اور انسانیت کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، قومی اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دیں، انسانوں سے نفرت اور عداوت کی بجائے محبت اور مذہبی رواداری کو عام کریں۔ نظم کے اس آخری حصے میں شاعر نے قومی اخوت کا پیغام دیا ہے:

ظلمتِ خاک میں پوشیدہ ہے آبِ حیواں
قسمتِ سوختہ ساماں ہے بدلنے ہی کو رنگ
اور کچھ دیر لہو ہولے دلِ خانہ خراب
محفل درد سے اٹھنے ہی کو ہے نغمۂ چنگ
پھر تصور نے تراشی ہے پنہ گاہ نئی
تودۂ خاک ہے کیا سامنے سیاروں کے
زندگی اب تو حنائے سرِ ناخن بھی نہیں
موت لو دینے لگی چہرے پہ بیماروں کے

'' آسماں دور ہے اب خواب گراں سے اٹھیے
ظلمتِ شب سے ہویدا ہیں سحر کے آثار
ایک سیارہ ہے یہ اپنی زمیں بھی لیکن
اس کو انسان نے کر رکھا ہے خود تیرہ و تار''

'تاریک سیارہ' اس مجموعے کی ایک اور نظم 'پندرہ اگست' ظاہر ہے آزادیِ وطن کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ہندوستان کی آزادی اس ملک کے عوام کی طویل جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ ملک کے سب ہی فرقوں نے حصولِ آزادی کی خاطر برطانوی سامراج سے ٹکر لی تھی۔ سب نے حسین خواب دیکھے تھے کہ آزادی کے بعد برطانوی سامراج کے ظلم و ستم سے نجات مل جائے گی اور ہندوستان میں خوشحالی اور ترقی کا دور شروع ہوگا۔ سب امن و امان اور سکون سے رہیں گے۔ لیکن یہ سب خواب معاً ٹوٹ گئے اور آزادی ملتے ہی تقسیم وطن کے نتیجے میں ہر طرف انسانیت کش فسادات کا سلسلہ شروع ہوا، اس ناگہانی انسانی المیے سے متاثر ہو کر نظم 'پندرہ اگست' میں اختر الایمان کہتے ہیں:

وہی کسمپرسی وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے
ابھی تو وہی رنگِ محفل، وہی جبر ہے ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو یہ وادیِ رنگ بھی میری منزل نہیں ہے
شہیدوں کا خوں اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لیے جا رہے ہو یہ شب کا جنازہ نہیں ہے

غرض آزادی خاک و خون میں ڈوبی ہوئی آئی، اور یہ اس ملک کے عوام کے لیے سخت تکلیف اور اذیت کا باعث ہوا۔ انسانیت آج بھی زخم خوردہ ہے۔

اس مجموعے کی نظم '' آزادی کے بعد'' اسی درد و غم اور انسانیت کش فسادات کی تصویر کشی کرتی ہے۔ آزادی کے بعد رونما ہونے والے یہ فسادات، غارت گری، بے روزگاری، ہجرت اور متعدد مسائل کئی نسلوں کے لیے المناک صورتِ حال کو پیش کرتے ہیں۔ اس منظر و ماحول کی عکاسی شاعر نے اس طرح کی ہے:

سوا نیزے پر آ گیا سورج
لیے بائیں ہاتھوں میں اعمال نامے
گنہ گار حیران و ششدر کھڑے ہیں
کہ اندھے ہیں سب، کون گرتوں کو تھامے
عجب نفسی نفسی ہے پیشانیوں میں
ہیں پیوست آنکھیں، سب اپنے پرائے
اجالے کی تاریکیوں سے ہیں نالاں
مگر کون، کس کو، غمِ دل سنائے

شاعر وطن دوستی، قومی اخوت کے جذبات سے سرشار ہے۔ یہ دراصل ایک دردمند دِل کی آواز ہے جو بلا امتیاز مذہب و ملت انسانیت کے دکھ سے غمگین ہے، آزادی کے بعد فساد کا سلسلہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے، یہ مورخ کے سامنے جواب دہ ہے، نہ جانے کیسے کیسے لوگ خاک میں مل گئے، دردمند شاعر کی آواز نظم کے آخر میں اس طرح اُبھرتی ہے:

گلوں سے الجھتی ہوئی شوخ کرنو
نئے نرم پودوں کی معصوم روحو!
یہاں سے ذرا اور آہستہ گزرو
وہ درماندہ شاعر جسے آدمی نے
کئی بار چاہا کہ مایوس کردے
تمھارے لیے ہی جو تڑپا ہے برسوں
تمھاری اسی روز کی رہگذر میں
اسی دامنِ خاک میں سو رہا ہے

اختر الایمان کے مجموعے 'یادیں' میں شامل اُن کی نظم 'ایک لڑکا' اُن کی معروف اور بے حد اہم شعری تخلیق ہے، یہ نظم اُس دور کی اہم نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ یوں تو یہ نظم شاعر کی اپنی ذاتی اور شخصی زندگی کے پس منظر سے شروع ہوتی ہے۔ نظم میں شاعر کا ہمزاد 'ایک لڑکا' اپنی گزشتہ زندگی کی روداد بیان کرتا ہے، اور وہ شاعر سے سوال کرتا ہے کہ کیا وہ اختر الایمان تم ہی ہو؟ ملاحظہ کیجیے:

مجھے اِک لڑکا، آوارہ منش، آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

نظم کے اگلے حصے میں شاعر خدائے بزرگ و برتر کی تمام نعمتوں اور بخششوں کا اعتراف کرتا ہے، اور اس کی یہ بخششیں سب انسانوں کے لیے عام ہیں۔ لیکن ایک بے نوا اور مجبور شاعر جب کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے تو اس کا ہمزاد یہ سوال کرتا ہے کہ اختر الایمان تم ہی ہو؟ دراصل اس نظم کے سماجی اور قومی سروکار یہ ہیں کہ یہ نظم سماج کے اور انسانوں کے بنیادی مسائل کی ترجمانی کرتی ہے۔ سماج میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم، بے روزگاری، بدعنوانی اور غربت و افلاس جیسے مسائل سے لوگوں کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ سیاست دانوں کی فریب کاری اور خود غرضانہ حکمتِ عملی کے سبب بہت سے سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں، جو عوام الناس کے لیے تکلیف کا سبب بنتے ہیں۔ بقول شاعر:

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضے میں
جز اک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں، پھر بھی مگر مجھ کو
خروش عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے
عناصر منتشر ہوجانے، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہویا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ اُن کا کہہ کر مسکرانا ہے

غرض یہ نظم بھی شاعر کی انسان دوستی اور قومی اخوت کی ترجمانی کرتی ہے۔جس سماج میں عدم مساوات، دولت کی غلط تقسیم،معاشی بدعنوانی اور سیاسی خودغرضی اور موقع پرستی جیسے رجحانات ہوں وہ معاشرہ ترقی یافتہ اور خوشحال نہیں ہوسکتا۔ اختر الایمان کی اس نظم کا بنیادی سروکار یہی انسانی ہمدردی ہے، اس لیے یہ نظم وطنی اور قومی مسائل کی ترجمان ہے۔

کچھ اسی قسم کی نظم 'یادیں' بھی ہے۔ یہ نظم نسبتاً طویل ہے۔اس نظم میں بھی بنیادی طور پر معاشرے کے تضادات ،عدم مساوات،غربت،استحصال اور انسان کی خودغرضی کے رویوں کو پیش کیا گیا ہے۔نظم کی ابتدا میں ایک میلے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔جس میں ہر چیز بکتی ہے،ایک بالک اپنے باپ کی انگلی سے چھوٹ گیا ہے اور وہ میلے کو حیرت و استعجاب سے دیکھتا ہے:

وہ بالک ہے آج بھی حیراں میلہ جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چپ چپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت، کہیں نجابت، کہیں محبت، کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے، کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

دراصل یہ نظم انسان دوستی،قومی اخوت، کے عظیم افکار پر مبنی ہے۔'بالک' کے روپ میں شاعر کا ہمزاد اس نظم میں بھی اُبھرتا ہے۔شاعر اپنے عہد کی تمام سماجی معاشرتی، سیاسی صورتِ حال کو پیش کرتا ہے۔غربت اور بدحالی اب بھی عام ہے۔معاشرہ خوشحال اور ترقی یافتہ اسی وقت ہو سکے گا جب سب کے ساتھ مساویانہ اور عدل وانصاف کا معاملہ ہوگا۔ بدعنوانی، رشوت ستانی، اور خودغرضی پر مبنی معاشرے میں قومی اخوت اور یکجہتی جیسے تصورات کوئی معنی نہیں رکھتے۔اس لیے شاعر کہتا ہے:

زیست خدا جانے ہے کیا شے، بھوک، تجسس، اشک، فرار
پھول سے بچے زہرہ جبینیں، مرد مجسم باغ و بہار
مرجھا جاتے ہیں اکثر کیوں، کون ہے وہ جس نے بیمار
کیا ہے روحِ ارض کو آخر اور یہ زہریلے افکار
کس مٹی سے اُگتے ہیں سب، جینا کیوں ہے اک بے گار
ان باتوں سے قطع نظر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

نظم 'راہِ فرار' عصری معاشرے کی کشاکش، کے ساتھ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں برپا فسادات کے ماحول کو پیش کرتی ہے۔ یہ شاعر کی انسان دوستی اور قومی یکجہتی کے جذبات کا ہی اظہار ہے کہ آج کے معاشرے میں بھی یہ بے چینی اور کشاکش پائی جاتی ہے، ظاہر ہے اس کے لیے خودغرضانہ سیاست اور فرقہ پرستی کے رجحانات ذمے دار ہیں۔ تقسیم کے وقت کے فسادات کی ترجمانی نظم میں اس طرح کی گئی ہے:

فسادات دیکھے تھے تقسیم کے وقت تم نے
ہوا میں اچھلتے ہوئے ڈنٹھلوں کی طرح شیر خواروں کو دیکھا تھا کٹتے
اور پستاں بریدہ جواں لڑکیاں تم نے دیکھی تھیں کیا بین کرتے؟
نہیں یہ تو نشہ نہیں، تجربہ بھی نہیں ہے ایسا کوئی
یہ اک سانحہ ہے
فراموشگاری کا احسان مانو
یہ سب کل کی باتیں ہیں، بوسیدہ باتیں
جنھیں بھول جانا ہے بہتر
فراموشگاری بھی
اک نعمت بے بہا ہے

بہر حال شاعر ماضی کی ان باتوں کو بھول کر رجائی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے خوش آئند مستقبل کی بشارت دیتا ہے۔ شاید دوبارہ پھر یہ ملک امن وامان اور یکجہتی کا گہوارہ بنے گا، نظم کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

کوئی ایسی صورت نکالو
یہ سب آفتیں اپنا دامن نہ پکڑیں
کوئی اور راہِ فرار ایسی ڈھونڈو
کہ ہم زندگی کے جہنم کو جنت سمجھ لیں!

نظم 'گونگی عورت' بھی اسی انداز سے عصری معاشرے کی حشر سامانیوں و بحرانی کیفیت کو پیش کرتی ہے، اس نظم میں عالمی طور پر بھی بے چینی، تناؤ، مختلف ملکوں کے مابین جنگی اسلحے کے حصول کی دوڑ جاری ہے۔ شاعر کے پیشِ نظر اس کے خلاف کوئی آواز اُٹھانے والا نہیں ہے، شاید عورت کو زبان اور گویائی نصیب ہوتی تو وہ اس کے خلاف خوب احتجاج کرتی، فاشزم اور تعصب کے خلاف واویلا کیا جاتا ہے، حب الوطنی کے نام پر خوں ریزی کی جاتی ہے، مذہب اور ثقافت کے نام پر لوگ ماضی پرست ہوجاتے ہیں۔شاعر کے الفاظ میں اس صورتِ حال کو ملاحظہ کیجیے:

تو اس چاروں طرف پھیلی ہتھیاروں کی دُنیا
سینے دہلا دینے والے طیاروں کی انساں کش آوازیں
آوازیں جن میں انساں کی روح شبانہ روز دبی جاتی ہیں
محشر خیز آوازیں کل پرزوں کی جن سے نفسی نفسی کا عالم پیدا ہو کر
دن پر دن عفریت کی صورت میں بڑھتا جاتا ہے
ان آوازوں کی ہیبت ناکی پر واویلا کرتی
تو آواز اٹھاتی اس فاشی اور تعصب پھیلانے والے عنصر کو بڑھتا پا کر
جب حب الوطنی کے نام پہ انساں کش ہوتا جاتا ہے
تو ان رجحانات کی خوب مذمت کرتی
ان سے لڑتی جو اس دُنیا کو پیچھے لے جانے میں کوشاں ہیں
'مذہب اور تہذیب'
ثقافت، اور ترقی، کہہ کر رجعت پرور ہوجاتے ہیں

مذکورہ اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر قومی جذبات اور حب الوطنی کے خیالات کی ترجمان ہے۔ وہ انسان دوستی کے ماحول کو عام کرنا چاہتا ہے، لیکن سماج دشمن عناصر اپنی خودغرضی اور فرقہ پرستی کی خاطر انتشار پیدا کرتے ہیں۔ شاعر کے پیشِ نظر وہ اس کے خلاف احتجاج کرنے میں ناکام رہا ہے، اور اس کی گویائی اس کے کچھ کام نہیں آئی، اسی لیے وہ اپنی گویائی 'گونگی عورت' کو دینا چاہتا ہے، ممکن ہے وہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے:

لے میں تجھ کو اپنی گویائی دیتا ہوں!
یہ میرے کام نہیں آئی کچھ

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اختر الایمان نے اپنی مختلف نظموں میں قومی یکجہتی، اتحاد اور انسان دوستی کے رجحانات کو فروغ دیا ہے۔ جس ماحول اور زمانے میں انھوں نے شاعری کی، وہ خود بحران، خلفشار اور مختلف النوع سماجی مسائل سے دوچار تھا۔ آزادی سے قبل تحریک آزادی کی جدوجہد، آزادی کے بعد تقسیمِ ملک، فسادات، نقل مکانی، ہجرت، بے روزگاری، غربت جیسے مسائل بھیانک صورت اختیار کر گئے۔ اگر چہ آزادی کے بعد ہندوستان نے جمہوری نظام کو اختیار کیا، لیکن ہندوستان میں فرقہ پرستی، خودغرضانہ سیاست، اقتدار کی ہوس اور بدعنوانی جیسے مسائل نے یہاں کے جمہوری نظام کو عوام کے لیے ناکارہ اور بے فیض بنادیا ہے۔ ٹیکس، مہنگائی اور رشوت ستانی جیسے مسائل سے ملک کے عوام کی زندگی بے حد مصائب کا شکار ہوگئی ہے۔ سماج کے ان سنگین مسائل کو شعری تخلیقی اظہار عطا کرنا اختر الایمان کا اہم کارنامہ ہے۔ اس لحاظ سے اُن کو ایک عظیم انسان دوست اور ملک و وطن کا ہمدرد کہنا چاہیے۔

■

Dr. Siddiq Mohiudin, Associate Prof. Dept of urdu, Dr Babasaheb Ambedkar Marathawada University, Aurangabad - 431001 (MS)

اختر الایمان رومانیت سے آگے کا سفر

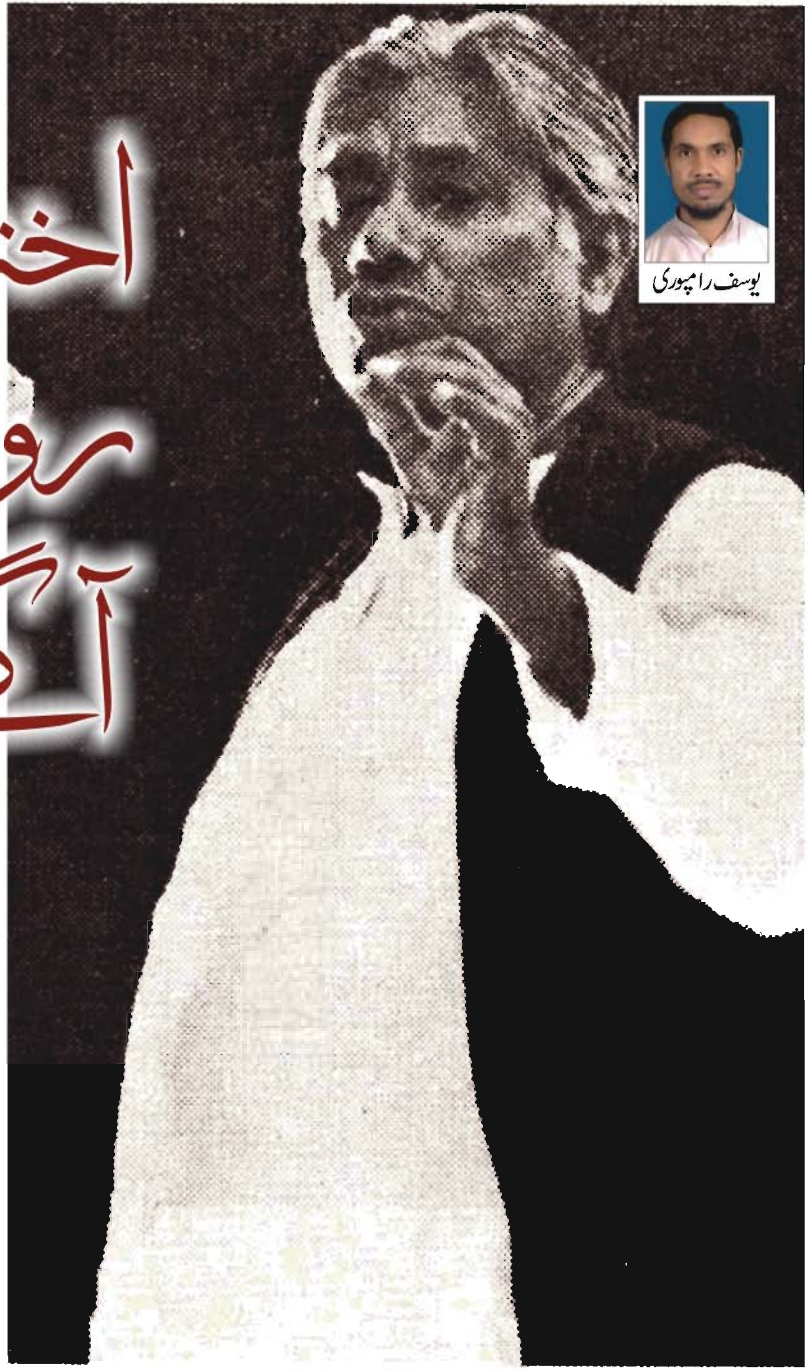

یوسف رامپوری

اختر الایمان جدید شاعری کا وہ نام ہے جس پر کوئی مخصوص لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بیک وقت اقدار و روایات، مشاہدات وتجربات اور مختلف النوع مسائل وموضوعات کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں رومانیت کے میدان کی وسعتوں کی پیمائش بھی ہے اور رومانیت سے آگے کا سفر بھی۔ اختر الایمان نے قدما کی روایات کو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ برتا ہے اور شاعری میں نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ جس زمانے میں اختر الایمان شاعری کی منزلیں طے کرر ہے تھے، اس وقت نامور شعرا کی کمی نہ تھی، ترقی پسندوں کی ایک پوری جماعت تھی اور جدیدیت کے علمبرداروں کا بھی گروہ موجود تھا مگر ان کی پیروی کیے بغیر اختر الایمان نے اپنی الگ راہ ہموار کی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اختر الایمان نے ان حقائق سے چشم پوشی کی جن کو دوسرے شعرا نے پیش کیا تھا، لیکن انھوں نے جو کچھ بھی کہا جداگانہ اور نرالے انداز میں کہا جس کے باعث انھیں نئی شناخت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

اختر الایمان کی شاعری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فطرت اور مقصدیت سے ہم آہنگ اور قلب وضمیر کی آواز ہے۔ دراصل اختر الایمان نے شاعری کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ وہ اسے مذہب وایمان کا درجہ دیتے، محض تفنن طبع کی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

''شاعری میرے نزدیک کیا ہے۔ اگر میں اس بات کو ایک لفظ میں واضح کرنا چاہوں تو 'مذہب' کا لفظ استعمال کروں گا۔ میں نے اپنی شاعری کو مذہب اور ایمان سمجھنے میں کوتاہی نہیں کی۔ میں نے آج تک زندگی اور اس کے نشیب وفراز کے ساتھ ایسا کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جو میری شاعری کو مجروح کرتا ہو۔''

اختر الایمان نے اپنی شاعری کے لیے 'مذہب اور ایمان' کا لفظ استعمال کر کے قارئین کو یہ کھلا پیغام دے دیا کہ ان کے نزدیک شاعری ایک اعلیٰ وارفع شے ہے، جس کے ساتھ بے ایمانی، ناانصافی اور زیادتی نہیں کی جاسکتی، جسے فروخت بھی نہیں کیا جاسکتا اور نہ بے جا اغراض ومفادات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ اختر الایمان کی لفاظی نہیں، انھوں نے عملاً ایسا کر کے دکھایا ہے، ان کی شاعری کا ایک ایک مصرعہ خود پکارتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے درست جانا، پیش کر دیا اور جو محسوس کیا اسے شاعری کا جامہ پہنا دیا۔ بطور نمونہ یہ بند دیکھیے:

وسیع شہر میں اک چیخ کیا سنائی دے
بسوں کے شور میں ریلوں کی گڑگڑاہٹ میں
چہل پہل میں بھڑوں جیسی بھنبھناہٹ میں
کسی کو پکڑو سر راہ مار دو چاہے
کسی عفیفہ کی عصمت اتار دو چاہے
وسیع شہر میں ایک چیخ کیا سنائی دے

(عروس البلاد)

اختر الایمان نے چوں کہ شاعری کو ہمیشہ اعلیٰ چیز خیال کیا، اس لیے انھوں نے اپنی شاعری کو محبوب کی زلفوں کا اسیر بنا کر نہیں رکھا، انھوں نے اس کے توسط سے حالات کے گیسوؤں کو سنوارنے کی بھی سعی کی، حادثات اور واقعات کو نظم کر کے بنی نوع انسان کو انسانیت کا سبق بھی

پڑھایا اور مٹتی ہوئی تہذیب اور برباد ہوتے ہوئے آثار قدیمہ کا رونا بھی رویا۔ کہتے ہیں:

یہاں اسرار ہیں، سرگوشیاں ہیں، بے نیازی ہے
یہاں مفلوج تر ہیں تیز تر بازو ہواؤں کے
یہاں بھٹکی ہوئی روحیں کبھی سر جوڑ لیتی ہیں
یہاں پر دفن ہیں گزری ہوئی تہذیب کے نقشے
(پرانی فصیل)

اختر الایمان جتنی محبت انسان سے کرتے ہیں، اتنی ہی انسانی اقدار سے بھی۔ اسی لیے وہ نہ صرف اقدار کے حامی ہیں بلکہ اس کے مبلغ بھی ہیں۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، سماج کے نشیب و فراز پر ان کی گہری نظر ہے، انسانوں کے مابین کون سی شے بہتر ہے اور کون سی شے کمتر۔ کون سی چیز انسان کو اعلیٰ بناتی ہے اور کون سی چیز اسے اس کے مقام سے گراتی ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ وہ بدلتے سماج، حالات و حوادث کو بغور دیکھ کر اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسانی زندگی میں قدریں خاص وقعت رکھتی ہیں اور ان کی وساطت سے انسان ترقی اور شرافت کے اعلیٰ مدارج طے کر سکتا ہے۔ اسی لیے وہ پوری توانائی کے ساتھ اقدار کی تبلیغ و تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان اس مقام پر فائز ہو جہاں وہ اپنی بعثت کے مقصد پر کھرا اترے اور خالق کی نظر میں اعلیٰ مقام پائے۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

''ان قدروں کے مطابق انسان کی تخلیق نورِ ایزدی سے ہوئی ہے وہ ایک بڑے مقصد حیات کے تحت زمین پر بھیجا گیا ہے اور ایک دن اس کثیف میلی اور آلودہ زندگی سے اٹھ کر اپنے خالق، اپنے پروردگار، کے روبرو پیش ہو جانا ہے جس کا وہ حصہ ہے۔ اس لیے انسان کو ذاتی مفاد، خواہشوں اور لالچوں سے بلند ہونا چاہیے تاکہ خدائے بلند و برتر کی نظر میں خود کو اشرف المخلوقات اور خلیفۂ ارض ثابت کر سکے۔'' (بنت لمحات)

اختر الایمان کے یہ خیالات یقیناً بلند و ارفع ہیں اور ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ مذکورہ نظریات نے اختر الایمان کی شاعری کے کینوس کو وسیع تر کر دیا ہے اور ان کی شاعری رومانیت کی منزلوں کو طے کرتی ہوئی انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ حالانکہ اختر الایمان کی شاعری پر رومانیت کے گہرے اثرات ہیں، انھوں نے 'رومانیت' کو الگ الگ انداز سے برتا جس کے سبب انھیں شاعر رومان کہا گیا اور خیال کیا گیا لیکن اختر الایمان کی شاعری پر رومانیت کا لیبل لگانا ان کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی متعدد نظمیں اور بہت سے اشعار رومانیت سے آگے کا سفر طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خود اختر الایمان کو بھی یہ گوارہ نہیں کہ ان کی شاعری کو رومانیت کی قید میں مقید کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے رومانیت کے دائرے کو توڑنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

رومانیت کے جادوئی پنجرے سے آزاد ہونے کے لیے اختر الایمان کو سخت مجاہدہ کرنا پڑا اور انھوں نے جان بوجھ کر بعض نظموں کے لیے ایسے موضوعات منتخب کیے جن میں رومانیت کا ہلکا سا اثر بھی نہ آنے پائے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے پرکشش الفاظ کی جگہ کھردرے اور روکھے الفاظ بھی اپنی نظموں میں پیوست کیے۔ اپنی ایک غیر رومانی نظم 'میرا نام' کی شروعات وہ اس طرح کرتے ہیں:

اختر الایمان جتنی محبت انسان سے کرتے ہیں ، اتنی ہی انسانی اقدار سے بھی ۔اسی لیے وہ نہ صرف اقدار کے حامی ہیں بلکہ اس کے مبلغ بھی ہیں۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، سماج کے نشیب وفراز پر ان کی گہری نظر ہے، انسانوں کے مابین کون سی شے بہتر ہے اور کون سی شے کمتر۔ کون سی چیز انسان کو اعلیٰ بناتی ہے اور کون سی چیز اسے اس کے مقام سے گراتی ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ وہ بدلتے سماج، حالات وحوادث کو بغور دیکھ کر اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسانی زندگی میں قدریں خاص وقعت رکھتی ہیں اور ان کی وساطت سے انسان ترقی اور شرافت کے اعلیٰ مدارج طے کرسکتا ہے۔

مفتیِ شہر کا ہے یہ فتویٰ
بعد تسبیح و حمدِ ربِّ انام
خالقِ شش جہت نے روزِ ازل
یوں مرتب کیا جہاں کا نظام
ایک ذرّہ بھی گر جگہ سے ہلے
گیتی بن جائے حرفِ استفہام

نظم کا آغاز تو غیر رومانی ہے ہی مگر اس کے بعد کے اشعار بھی رومانیت و غنائیت سے خالی ہیں۔ شعر دیکھیے:

لاش اٹھائے پھروں جہاں جاؤں
میرے شانوں پہ آج تک ہے بار
اس وراثت کا جس میں ابن الوقت
سودا کرتے رہے سرِ بازار
ملک و ملت کا اور محبِ وطن
زہر دے کر کیے گئے بیمار

اس نظم میں زندگی کے کئی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے لیکن سادہ اور غیر رومانوی انداز میں۔ الفاظ اور انداز میں اتنی سادگی ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اختر الایمان نے جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

صبح سے شام تک شکم ہی شکم
آدمی ہے مشین یا ہتھیار
آدمی، آدمی کہاں ہے ابھی
آدمی ہے ابھی فقط جاں دار

نظم کے تقریباً تمام اشعار اسی طرح کے سادہ اور سپاٹ لہجے میں ہیں۔ ان اشعار پر سادگی کا انطباق اس لیے کیا جا سکتا ہے کہ یہ اسلوب اختر الایمان کی عام روش سے ہٹ کر ہے۔ کیونکہ وہ عام طور پر ایسے موضوعات میں بھی غنائیت اور سحر انگیزی کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں جو مذہبی، سماجی اور فلسفیانہ انداز کے ہوتے ہیں۔

اختر الایمان کی غیر رومانی نظموں اور اشعار کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے یقیناً رومانیت کی حسین وادیوں کی سیر کی ہے مگر ان کے دلفریب نظاروں سے باہر آ کر زندگی کی سنگلاخ چٹانوں اور چٹیل میدانوں کا بھی انھوں نے رُخ کیا۔ شاعر کا رومانیت کی دنیا میں گم ہو جانا حیرت کی بات نہیں۔ کیونکہ شاعری کے گلیاروں میں جوں ہی شاعر قدم رکھتا ہے، رومانیت کے خوبصورت سائے اس کا تعاقب کرنے لگتے ہیں اور شاعر خواہی نہ خواہی بہت جلد رومانیت کا دلدادہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اختر الایمان بھی رومانیت پر فدا ہوئے لیکن ان کی مضطرب طبیعت نے انھیں اس سے خلاصی کے لیے بے چین بھی رکھا۔

رومانیت کے مزاج و آہنگ میں پوری طرح ڈھلنے کے باوجود اختر الایمان نے دوسری منزلوں کا رُخ اس لیے کیا کہ شاعری کا تقاضا تھا کہ زندگی کے مختلف زاویوں کو شاعری کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اس تقاضے کے تحت انھوں نے حصار کے اندر بھی شاعری کی اور حصار کے باہر بھی۔ رومانیت کے جہان سے آگے دوسری دنیاؤں کی سیاحت اختر الایمان نے اس لیے بھی کی کہ ان کے مزاج میں نری روایت پسندی نہیں تھی، جہاں وہ ضرورت محسوس کرتے تقلید کے بت پاش پاش کر دیتے۔

مثلاً غزل اور رومانیت اردو شاعری پر اس قدر حاوی ہوچکی تھی کہ ہر شاعر اس کی پیروی کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ اختر الایمان نے غزل کی روایت کی تقلید سے گریز کیا۔ انھوں نے نظم کو اپنی شاعری کا محور بنایا، پھر نظموں میں بھی انھوں نے غزل کے رنگ و آہنگ سے بے اعتنائی برتی۔ یہ کام آسان نہ تھا مگر انھوں نے کر دکھایا۔ حالی، اقبال اور جوش نے زبردست نظمیں لکھیں لیکن غزل کے اثرات سے وہ بھی اپنی نظموں کو نہ بچا سکے۔ یہ اختر الایمان کی شاعری کا انفراد ہے کہ وہ غزل سے آگے بڑھ گئے اور بعض نظموں میں رومانیت کو بھی انھوں نے پیچھے چھوڑ دیا یا رومانیت سے پلّہ جھاڑ لیا۔ یہ سب کچھ اتفاقاً نہیں ہوگیا بلکہ ان کی گہری سوچ اور مجاہدے کے بعد ہوا۔ اس بابت خود رقمطراز ہیں:

''جب سے شاعری پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا ہے مجھے یہ احساس ہوا کہ ہماری شاعری چند چیزوں کا شکار ہوکر رہ گئی ہے۔ ان میں سے ایک رومانیت ہے، دوسری غزل یا غالباً رومانیت پوری شاعری پر حاوی ہے اس لیے کہ ہم غزل سے نکل کر نہیں جاسکے۔ غزل کا میدان بہت محدود ہے۔ کسی بھی موضوع کو واضح طور پر بیان کرنے کے لیے دو مصرعے کافی نہیں ہوتے۔ اس حد بندی سے یہ ہوا کہ نئے نئے موضوعات اور ہیئت کے تجربے نہیں کیے جاسکے اور شاعری میں وہ پھیلاؤ نہیں آسکا جو زندگی میں ہے۔ غزل کسی موضوع پر کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ صرف اس کی طرف اشارہ کرسکتی ہے اور کسی موضوع کی طرف صرف اشارہ کافی نہیں ہوتا۔ اس چیز کو ذہن میں رکھ کر میں نے اکثر یہ کوشش کی ہے کہ نظموں میں وہ رسمی رومانیت نہ آئے بلکہ بعض جگہ جان بوجھ کر نظموں میں روکھا پن اور کھرا پن رکھا ہے۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان کے نزدیک شاعری کے تمام تر تقاضوں کی کماحقہٗ تکمیل غزل یا رومانیت سے نہیں ہوتی، اس کے لیے مزید میدانوں، تجربوں، ہیئتوں اور طریقوں کی ضرورت ہے۔ رومانیت سے آگے کی شاعری کرنے والوں میں تنہا اختر الایمان ہی نہیں بلکہ اور بھی ہیں جنھوں نے زندگی کے مختلف موضوعات کو اپنی شاعری میں پوری توانائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اختر الایمان کی غیر رومانی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ان کی نظمیں 'میرا نام'، 'میر ناصر حسین'، 'آگہی' اور 'عہد وفا' ہیں۔ ان میں اختر الایمان نے اپنے آپ کو رومانیت کے اثرات سے اس حد تک بچایا ہے کہ اشعار کے روکھے پھیکے ہونے کا بھی خیال نہ کیا۔

'میر ناصر حسین' اختر الایمان کی خاصی طویل نظم ہے مگر پوری نظم میں رومانیت نام کو بھی نہیں ہے۔ موضوع بھی غیر رومانی ہے اور انداز بھی غیر رومانی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اختر الایمان نے سوچ سمجھ کر اس نظم میں رومانیت سے گریز کیا ہے۔ اس کا اندازہ نظم کے شروع میں ہی ہوجاتا ہے:

چرخِ نیلی فام ازل سے ہے جفا جو کینہ ساز
اس کی آنکھوں میں نہیں اچھے برے کا کچھ لحاظ
ہم سے ان کو چھین لیتا ہے جو ہیں بے حد مفید
جن کو کہنا چاہیے ہر قفل بستہ کی کلید

اسلوب کے اعتبار سے جیسی نظم کی شروعات ہے ویسا ہی اس کا اختتام بھی۔ نظم کے آخری اشعار دیکھیے:

اخترالایمان نے علامتی، ڈرامائی اور رومانوی اسلوب میں توزندگی کے ان گنت مسائل کو پیش کیا ہی ہے مگر سادہ انداز اور لب ولہجے میں بھی زندگی کے دردوکرب، کامیابی وناکامی اوراضطراب وکشمکش کی جگہ جگہ تصویر کھینچی ہے۔ انھوں نے اپنے دورمیں ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندھی بھی کی ہے اور ان کے نتائج کو بھی کھول کر رکھ دیاہے۔ مادہ پرستی کے عروج سے انسانیت اور روحانیت کو جو نقصان پہنچ رہا تھا یا پہنچنے والا تھا، اس کو اختر الایمان نے بہت نزدیک سے محسوس کیا اوراس کو کہیں رومانوی، توکہیں غیررومانوی انداز میں پیش کر دیا۔

کتبۂ ایام پر کندہ ہو ان کا نیک نام
اور ہم کرتے رہیں ان کا ہمیشہ احترام
آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

نظم 'میر ناصر حسین' میں اگر اختر الایمان چاہتے تو بھرپور غنائیت پیدا کرسکتے تھے جو ان کے مزاج کا تقاضا تھا لیکن انھوں نے جس طرح نظم کا آغاز کیا ویسا ہی اختتام کردیا، نہ کہیں الفاظ کا زیروبم نظر آتا ہے، نہ نظم میں تشبیہات واستعارات اور نہ علامات وتلمیحات کا دیدار ہوتا ہے۔

اختر الایمان کی ایک اور نظم جسے پوری طرح سے غیر رومانی کہا جاسکتا ہے 'آگہی' ہے۔ البتہ اس نظم میں 'میرا نام' اور 'میر ناصر حسین' جیسی سادگی نہیں، اس نظم میں انھوں نے تھوڑا زور ضرور پیدا کیا ہے لیکن رومانیت کا اثر اس میں بھی نہیں آنے دیا ہے۔ کہتے ہیں:

میں جب طفلِ مکتب تھا ہر بات ہر فلسفہ جانتا تھا
کھڑے ہوکے منبر پہ پہروں سلاطین پارین و حاضر
حکایات شیریں و تلخ ان کی، ان کے درخشاں جرائم
جو صفحاتِ تاریخ پر کارنامے ہیں، ان کے اوامر
نواہی، حکیموں کے اقوال، دانا خطیبوں کے خطبے
جنھیں مستمندوں نے باقی رکھا، اس کا مخفی و ظاہر

اختر الایمان کی ان نظموں میں غنائیت سے پرے اس حد تک سادگی صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ انھوں نے جان بوجھ کر ایسا کرنے کی کوشش کی، جس کا اعتراف انھوں نے خود بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں نیچرلٹی کا فقدان ہے۔

اختر الایمان نے علامتی، ڈرامائی اور رومانوی اسلوب میں تو زندگی کے ان گنت مسائل کو پیش کیا ہی ہے مگر سادہ انداز اور لب و لہجے میں بھی زندگی کے درد و کرب، کامیابی و ناکامی اور اضطراب و کشمکش کی جگہ جگہ تصویر کھینچی ہے۔ انھوں نے اپنے دور میں ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی بھی کی ہے اور ان کے نتائج کو بھی کھول کر رکھ دیا ہے۔ مادہ پرستی کے عروج سے انسانیت اور روحانیت کو جو نقصان پہنچ رہا تھا یا پہنچنے والا تھا، اس کو اختر الایمان نے بہت نزدیک سے محسوس کیا اور اس کو کہیں رومانوی، تو کہیں غیر رومانوی انداز میں پیش کردیا۔

اگر موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اختر الایمان کی شاعری کا بڑا حصہ غیر رومانی موضوعات پر مشتمل ہے اور اس شاعری میں انھوں نے اپنے مشاہدات، تجربات کو گہرے احساس کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گویا کہ اختر الایمان کے یہاں رومانیت ہی سب کچھ نہیں بلکہ رومانیت کے آگے بھی بہت کچھ ہے جسے انھوں نے شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں وہ زندگی کے ان مسائل کو خالص غیر رومانی انداز میں پیش کرتے دکھائی دیے اور کہیں ان مضامین کو نظم کرتے ہوئے رومانیت کے سائے بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔

■

Md. Yusuf / So Hafiz Saleem, Mohalla Tandola Tanda Distt Rampur-244925 (U.P), Mob: 9310068594

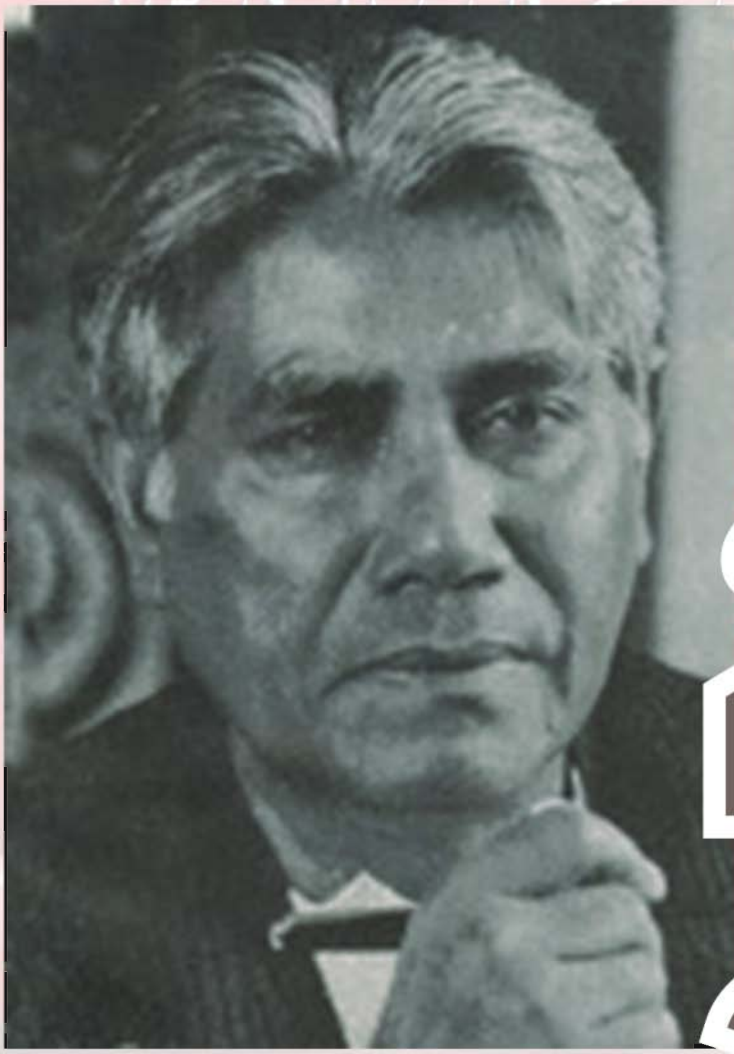

محمد امتیاز احمد

روح کے کرب کا بیانیہ

اخترالایمان (12 نومبر 1915 - 9 مارچ 1996) جدید شاعری کے بنیاد گزاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ناصر کاظمی اور خلیل الرحمن اگر چہ ہجرت کے گہرے کرب اور رفیقوں کی فرقت وجدائی کے درد کی اتھاہ تاثیر میں ڈوبے ہوئے بیان کے شاعر ہیں۔تو اختر نے اپنی روح کی داستان اور روحانی کشمکش کو واضح انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے ان کے ہاں اس روح کا کرب اور اضمحلال شدت سے ابھرا ہے۔ اختر کی شاعری عجب ہی درد سے لبریز ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے، اس کی افسردگی کا اظہار قدم قدم پر ہوتا ہے۔ وزیر آغا کا کہنا ہے کہ:

''غم اور کرب کی یہ کیفیت محض ان کی چند نظموں تک محدود نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ 'گرداب' کی قریب قریب ہر نظم میں ''یہ غم'' ایک برقی رو کی طرح دوڑتا چلا گیا ہے اور شاعر کی زخمی روح برہنہ ہو کر سامنے آگئی ہے۔ شاعر کے دل کو کوئی ایسی ٹھیس لگ چکی ہے کہ وہ ماحول کی ہا ہو، ہنگامہ خیزی اور شوریدہ سری سے کنارہ کش ہو کر اپنی ذات کے اندر سمٹ آیا ہے اور اس کی ہستی ایک آنسو میں ڈھل گئی ہے آنسو شکست کی آخری صورت ہے اور 'گرداب' کی نظموں میں آنسو ہر شے پر محیط ہے۔''

(حامدی کاشمیری، متن اور تجزیہ، راجباغ سری نگر: کمپیوٹر سٹی 2011 ص 67)

تم سے بے رنگی ہستی کا گلہ کرنا ہے
دل پے انبار ہے خوں گشتہ تمناؤں کا
آج ٹوٹے ہوئے تاروں کا خیال آیا ہے
ایک میلہ ہے پریشان سی امیدوں کا
چند پژمردہ بہاروں کا خیال آیا ہے
پاؤں تھک تھک کے رہے جاتے ہیں مایوسی میں
پرمحن راہ گذاروں کا خیال آیا ہے
ساقی و بادہ نہیں، جام لب جو بھی نہیں
تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں!

(جمود، ص 84)

اختر بچپن میں جس افلاس، بے چارگی، تنگدستی اور مجبوری کا شکار رہے معنوی اعتبار سے وہ کبھی بھی اس سے چھٹکارا نہ پا سکے، گوکہ بعد کی زندگی میں انھوں نے دنیا کے اکثر ممالک کے دورے بھی کیے، خوب دولت بھی کمائی بڑے اور امیر لوگوں سے متعارف بھی ہوئے، مگر درد وغم نے کبھی بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ جہاں بھی گئے، جس حال میں بھی رہے یہ ان کے ساتھ ساتھ رہا اور ان کے اکثر اوقات خوشیوں سے محروم ہی رہے اور یہ درد وغم ان کے مزاج کا حصہ بن گیا اور ان کی طبیعت ہی غم پرستی اور سوز وگداز کے رنگ میں رنگ گئی۔ اسی وجہ سے خارجی واقعات وحادثات ان پر گہرے اثرات مرتسم کرتے تھے اور وہ ان کو بھی ذاتی غم کے طور پر لیتے تھے، اسی لیے ان کے ہاں ہمیں داخل و خارج کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ حامدی کاشمیری کے بقول یہی وجہ ہے کہ:

''ان کی نظموں میں جو شعری شخصیت ابھرتی ہے وہ حساس، بینا، مضطرب، شکست خوردہ اور غم آشنا ہے۔

یہ شخصیت جذبات کی سچائی اور نزاکت کی محرم ہے، یہ جمالیاتی رچاؤ رکھتی ہے۔ خوابوں کو عزیز رکھتی ہے۔ تخیل پرست ہے، یادوں کو لاشعور میں چھپائے ہوئے ہے اور حال کی سنگلاخیت سے ٹکراتی ہے اور لہولہان ہو جاتی ہے۔''

(اخترالایمان، 12 سروسامان، مشمولہ 'کلیات اخترالایمان' دہلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2011،ص12)

'نیا آہنگ' کے دیباچہ میں اخترالایمان لکھتے ہیں:

''میری شاعری کیا ہے اگر ایک جملے میں کہنا چاہوں تو میں اسے انسان کی روح کا کرب کہوں گا۔''

(اخترالایمان، آب جو، مشمولہ 'کلیات اخترالایمان' دہلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2011،ص23)

اپنے مجموعوں کے دیباچوں میں انھوں نے اپنی شاعری کی مزید وضاحت خود کی ہے مثلاً: ''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ میرا خون جگر ہے۔'' (ایضاً،ص32)

''میں آج شاعر کو ٹوٹا ہوا آدمی سمجھتا ہوں اور میری شاعری اسی ٹوٹے ہوئے آدمی کی شاعری ہے۔''

(اختر الایمان، نیا آہنگ، مشمولہ ''کلیات اخترالایمان'' دہلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2011،ص32)

اختر کی شاعری کو پڑھ کر اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ان کی کوئی متاع عزیز ان سے اچانک گم ہوئی ہے، جس کی وجہ سے وہ حیران و پریشان ہیں۔ وہ گلی گلی شہر شہر حبیب جالب کی طرح اس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ مگر وہ ان کو کہیں ملتی نہیں۔ ان کے دل میں اس کے ملنے کی آرزو شدت سے ابھرتی ہے۔ ان کی تلاش کہیں بھی اختتام کو نہیں پہنچتی۔ وہ بہت حد تک تو مایوس ہو چکے ہیں مگر دل کے کسی تاریک گوشے میں امید کی کوئی کرن بھی سلگا رکھی ہے۔ امید کی وہ کرن معجزانہ و کراماتی ہے۔ یعنی اب اس متاع عزیز کو وہ معجزاتی طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں اس بات کے شواہد پیش کرتی ہیں:

اسی پیمبر گل کا ہے انتظار مجھے
نہ جانے کب سے سر رہگذار بیٹھا ہوں
برس گزر گئے، امید وار بیٹھا ہوں
وہ آئے گا ابھی اتنا ہے اعتبار مجھے

(پیمبر گل،ص222)

وہ آہٹوں کے گماں کے کئی دوراہوں سے گزرتے ہیں۔ قریہ قریہ، شہر شہر، چپہ چپہ کو عجب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ چشم دید مناظر اس کی یادوں کے جہاں میں ایک تلاطم برپا کر دیتے ہیں۔ ہر موڑ کے ہر منظر سے ان کی کوئی یاد وابستہ ہے۔ اس کو دیکھتے ہی ان کے زخموں سے خون رسنے لگتا ہے۔ کسی کے آنے کی چاہت شدت سے انھیں ستانے لگتی ہے۔ ملن کی یہ خواہش دل میں حسرتوں کے کئی جہانوں کو جنم دیتی ہے۔ کئی بے تاب کہانیوں کو گھڑتی ہے، کئی ناتمام آرزوؤں کو آسودہ کر کے جاتی ہے:

شہر در شہر، قریہ در قریہ
سالہا سال سے بھٹکتا ہوں
بارہا یوں ہوا کہ یہ دنیا
مجھ کو ایسی دکھائی دی جیسے
صبح کی ضو سے پھول کھلتا ہو
بارہا یوں ہوا کہ روشن چاند
یوں لگا جیسے ایک اندھا کنواں
یا کوئی گہرا زخم رستا ہوا

اختر کی شاعری کو پڑھ کر اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ان کی کوئی متاع عزیز ان سے اچانک گم ہوئی ہے، جس کی وجہ سے وہ حیران و پریشان ہیں۔ وہ گلی گلی شہر شہر حبیب جالب کی طرح اس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ مگر وہ ان کو کہیں ملتی نہیں۔ ان کے دل میں اس کے ملنے کی آرزو شدت سے ابھرتی ہے۔ ان کی تلاش کہیں بھی اختتام کو نہیں پہنچتی۔ وہ بہت حد تک تو مایوس ہو چکے ہیں مگر دل کے کسی تاریک گوشے میں امید کی کوئی کرن بھی سلگا رکھی ہے۔ امید کی وہ کرن معجزانہ و کراماتی ہے۔ یعنی اب اس متاع عزیز کو وہ معجزاتی طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

میں بہر کیف پھر بھی زندہ ہوں
اور کل سوچتا رہا پہروں
مجھ کو ایسی کبھی لگن تو نہ تھی
ہر جگہ تیری یاد کیوں آئی؟

(سلسلے،231)

ان نظموں کے علاوہ 'بے چارگی، 333، اچانک 461' 'بچھڑا ہوا آدمی، 515، موت 66، لوگوا ے لوگو، 302' میں بھی اسی 'تلاش' کی پرچھائیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کے ہاں اس تلاش کا سایہ ذہن سے چھٹتا نہیں، اس کا خیال محو نہیں ہو پاتا، اس کی یاد کو بھول نہیں پاتے، وہ ہر بار نہ جانے کیوں اسی مرکز آلام پر لوٹ آتے ہیں؟ انتظار کی اسی معجزانہ امید نے ان کو کڑے کوس طے کرایا، بن باس سے گزارا اور طویل انتظار کرایا۔ اسی سے ان کی زندگی تلخ بھی بن گئی۔ یہی ان کے روح کی کرب کی وجہ ہے۔ اختر دکھ و درد کا نہ تو مقابلہ کر سکے اور نہ ہی اس کا مداوا کیا۔ اس وجہ سے ان کے خواب بے معنی ہو کر رہ گئے اور ارتقائے عمر کے ساتھ ساتھ ان کی بے معنویت بھی بڑھتی ہی چلی گئی۔ یوں 'رائیگانیت' کا احساس ان کی شاعری کا ایک اہم اور غالب عنصر بن جاتا ہے:

حیات نام ہے یادوں کا، تلخ اور شیریں
بھلا کسی نے کسی رنگ و بو کو پکڑا ہے
شفق کو قید میں رکھا، صبا کو بند کیا
ہر ایک لمحہ گریزاں ہے جیسے دشمن ہے
نہ تم ملو گی نہ میں، ہم دونوں لمحے ہیں
وہ لمحے جو جا کے واپس کبھی نہیں آتے!

(بنت لمحات،ص303)

علاوہ ازیں اخترالایمان وقت کو اپنی ذات کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں اور یہ ان کی نظموں میں ان کے ساتھ ساتھ رگوں میں خون کی مانند چلتا ہے جس کا اظہار انھوں نے 'بنت لمحات' کے دیباچے میں کیا ہے۔ وہ 'گزراں' کے لفظ کو پوری زندگی کا حاصل اور اس کی اساس قرار دیتے ہیں اسی کے نتیجے میں 'یادیں' اور 'احساس زیاں' ان کے ہاں جنم لیتی ہیں۔ جو کہ تنہا پسندی، علاحدگی، اور لوگوں سے بیزاری جیسے خیالات و رجحانات کو جنم دیتی ہے اور یہی بعد میں جدید شاعری کے اہم نشانات ثابت ہوئے اس اعتبار سے ان کو پہلی اساس اختر نے ہی فراہم کی، لکھتے ہیں:

''اگر دیکھا جائے تو گزراں کو معنی پہنانے کی کوشش ہی فلسفہ، ادب اور شعر ہے... اس کامیابی اور ناکامی، پانے اور نہ پانے کے درمیان جو کرب ہے وہی گزراں کا حاصل ہے۔ یہ کرب ہی مسرت کا ایک رخ ہے، یہ کرب ہی تخلیق کی روح ہے۔''

(دیباچہ، آب جو کلیات، اخترالایمان (دلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،2011،ص20)

نیز ان کے ہاں خواب اور حقیقت کا تضاد یا حریفانہ کشمکش بھی ملتی ہے۔ وہ یہ بھی فیصلہ نہیں کر پاتے کہ زندگی خواب ہے؟ حقیقت ہے؟ کیا ہے؟ خواب زندگی ہے؟ حقیقت ہے؟ کیا ہے؟ حقیقت خواب ہے؟ خواب، حقیقت ہے؟ کیا ہے؟ زندگی، خواب، حقیقت! یہ عجب سا مخمصہ ہے جس میں اختر پھنسے ہوئے ہیں۔ اسی طرح وہ جسم اور روح، دن اور رات، ماہ و سال کے تضاد

شاید نہیں رہے وہ پتنگوں کے ولولے

کا بھی شکار ہوئے ہیں:

ہر نفس خواب ہے ہر خواب حقیقت کا فریب
اک تماشا ہے نگاہوں کا نہ ماضی ہے نہ حال
آج ماضی ہے وہی دور جو فردا تھا کبھی
موت ملتی ہے تمناؤں کے چہرے پہ گلال!''

(تاریک سیارہ، ایک کشمکش، ص183)

فیصلہ نہیں ہوا
سانحہ کہ واقعہ
کیا ہے زندگی کا نام؟
ہم نہیں تھے اور ہوئے،
ہم تھے اور نہیں رہے
جمع ضرب کر کے جو
آئے وہ نکال لو
غم خوشی میں ڈھال لو

(کال چکر، ص 490, 491)

وہ تذبذب اور گومگو کی کیفیات میں پھنس چکے ہیں۔ نیز ان کو اپنا ماضی چند لمحوں کا مہمان نظر آتا ہے مسجد، 70، تنہائی میں، 89، پرانی فصیل 87، آمادگی 87 میں اس کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس کے ماضی کی تعمیر بوسیدہ ہو چکی ہے اور اس کی اینٹیں ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ سرکتی چلی جاتی ہیں۔ ماضی اس کے پیچھے مستقبل سامنے کی کشمکش و تذبذب میں وہ لٹک کر رہ گیا ہے جس کی وجہ سے نفسیاتی الجھنوں میں گر گیا ہے:

دور برگد کی گھنی چھاؤں میں خاموش وملول
جس جگہ رات کے تاریک کفن کے نیچے
ماضی و حال گنہگار نمازی کی طرح
اپنے اعمال پہ رو لیتے ہیں چپکے چپکے
ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
ایک بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کبھی
گیت پھیکا سا کوئی چھیڑ دیا کرتا ہے
گرد آلود چراغوں کو ہوا کے جھونکے
روز مٹی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس
روشنی آکے دریچوں کی بجھا دیتے ہیں
حسرت شام وسحر بیٹھ کے گنبد کے قریب
ان پریشان دعاؤں کو سنا کرتی ہے
جو ترستی ہی رہی رنگ اثر کی خاطر
اور ٹوٹا ہوا دل تھام لیا کرتی ہے !

(مسجد، ص72-70)

اخترالایمان کی نظموں کا بیشتر حصہ علامتی شاعری پر منحصر ہے جس کا اقرار انھوں نے خود کیا ہے 'میری نظموں کا بیشتر حصہ علامتی شاعری پر مبنی ہے۔ 'موت' اور 'مسجد' کو خود انھوں نے علامتی قرار دیا ہے لکھتے ہیں:

''مسجد مذہب کا اعلامیہ ہے اور اس کی ویرانی عام آدمی کی مذہب سے دوری کا مظاہرہ ہے۔ رعشہ زدہ ہاتھ مذہبیت کے آخری نمائندہ ہیں اور وہ ندی جو مسجد کے قریب سے گزرتی ہے وقت کا دھارا ہے جو عدم کو وجود اور عدم میں تبدیل کرتا ہے اور اپنے ساتھ ہر اس چیز کو بہا کر لے جاتا ہے۔ جس کی زندگی کو ضرورت نہیں رہتی۔''

(ایضاً، ص28)

'موت' میں جو آدمی بستر مرگ پر ہے پرانی قدروں کا اعلامیہ ہے۔ 'تنہائی میں' ببول بے برگ وبار

اسلوب کی نرمی اور شگفتگی میں ایک خواب آور فضا ہے جو علامات، تشبیہات اور پیکروں کی مدد سے ایک خواب آور کیفیت پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے علامات، اشارات پیکر نگاری جیسے عناصر کو برت کے اسے جدید ذہن سے قریب کیا ہے۔ اس میں تفکر اور کہانی پن کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ یاد کا ایک سا رنگ ہے جو داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ جس نے ان نظموں کو ایک ڈرامائی لب و لہجہ اور اسلوب دیا ہے اس وجہ سے کہ ان کے ہاں یاس و امید، اندھیرا اور اجالا، نیکی و بدی، انسانیت اور حیوانیت کی ایک کشمکش اور مستقل پکار ملتی ہے، جس میں بیک وقت گہرائی اور نرمی و مانوسیت ہے

زندگی کا اور تالاب سرمایہ کا اعلامیہ ہے۔ 'قلوپطرہ' 'خاک وخون' دوسری جنگ عظیم کی منظر کشی پیش کرتی ہے۔ 'ایک لڑکا' کا محرک بچپن میں ایک گاؤں چھوڑ کے دوسرے گاؤں میں منتقل ہونا بنتا ہے۔ وہ لڑکا معصومیت، سچائی ستھرے پن اور آزادی کا اعلامیہ تھا۔

''وہ لڑکا جس کی تصویر کبھی میرے ذہن میں تھی۔ اس کا نام اختر الایمان ہے'' (ایضاً، ص29)

''ایک لڑکا ضمیر انسانیت کا اعلامیہ بن گیا۔''

(حامدی کاشمیری، متن اور تجزیہ، راجباغ سری نگر، کپوزٹنگ، 2001، ص85)

اختر کے کلام میں تخلیقی وژن اور تازگی نظر آتی ہے۔ اسلوب کی نرمی اور شگفتگی میں ایک خواب آور فضا ہے جو علامات، تشبیہات اور پیکروں کی مدد سے ایک خواب آور کیفیت پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے علامات، اشارات پیکر نگاری جیسے عناصر کو برت کے اسے جدید ذہن سے قریب کیا ہے۔ اس میں تفکر اور کہانی پن کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ یاد کا ایک سا رنگ ہے جو داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ جس نے ان نظموں کو ایک ڈرامائی لب ولہجہ اور اسلوب دیا ہے اس وجہ سے کہ ان کے ہاں یاس و امید، اندھیرا اور اجالا، نیکی و بدی، انسانیت اور حیوانیت کی ایک کشمکش اور مستقل پکار ملتی ہے، جس میں بیک وقت گہرائی اور نرمی و مانوسیت ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اختر نے ایک شعری لسانیات بھی ترتیب دی ہے اور زبان کے خلاقانہ برتاؤ میں ان کا کارنامہ مجتہدانہ ہے فنی اعتبار سے اخترالایمان کی نظموں میں پختگی، صفائی اور تکمیل کا احساس ہوتا ہے اور زائد عناصر کو تراش خراش کر کے نکال دیا گیا ہے کہ ان کی ہر نظم ایک ایسی تصویر بن جاتی ہے جس میں خطوط اور رنگوں کا تناسب مضبوط اور توانا ہے۔ جو کہ ان کے فن کی عظمت کی دلیل ہے۔ اردو شاعری کے جدید رجحانات کی نمائندگی بھی ان کے کلام سے ہوتی ہے۔ اگرچہ اختر نے اپنی نظموں کے قنوطی ہونے سے انکار کیا ہے مگر صحیح ہے کہ ان کی قنوطیت ہی ان کی خوبی ہے اور اسی قنوطیت نے ان کو ٹوٹے ہوئے دل کا شاعر بنایا ہے جو کہ اس شاعری کی جان ہے۔ میں حامدی کاشمیری کی رائے پر ان سطور کو ختم کرتا ہوں:

''اخترالایمان کی شاعری میں حسیاتی پیکروں کی فراوانی ہے اور یہ پیکر تراشی کا عمل ہے جو ان کے جوق در جوق خیالات اور محسوسات کو شعری استناد عطا کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خیال یا موضوع ان کے ذہن میں جاگزیں ہو کر تخلیقی توانائی کو متحرک کرتا ہے اور پھر جذبے کی حدت سے رنگ برنگ پیکروں میں نمود کرتا ہے یہ پیکر شعوری سعی کے مرہون نہیں بلکہ فطری حالت میں نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سطح زمین سے پھوٹتے ہیں یا پانی کے تالاب میں ایک کنکر پڑنے سے سارا تالاب دائرہ ہو جاتا ہے، اس طرح سے حقیقی صورت حال کی تقلیب واقع ہوتی ہے۔''

■

Muhammmad Imtiyaz Ahmad, D. Phil Scholar
Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia, N Delhil-110025. Email:amana866@gmail.com

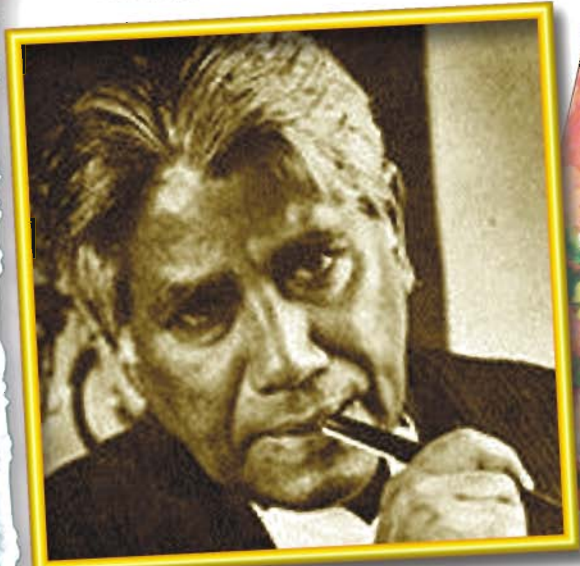

حنا فردوس

اس آباد خرابے میں

اختر الایمان کا شمار جدید اردو نظم کے اہم شعرا میں ہوتا ہے، جہاں ایک طرف ان کی نظمیں موضوع، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے شعری دنیا میں انفرادیت کی حامل ہیں تو وہیں دوسری طرف ان کی نثری تصنیف 'اس آباد خرابے میں' خودنوشت نگاری کی روایت میں بلاشبہ گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

'اس آباد خرابے میں' ایک ایسے فرد کی داستان ہے، جس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے اتار چڑھاؤ دیکھے، کتنے سرد وگرم برداشت کیے، قدم قدم پر مسائل و مصائب کا سامنا کیا مگر یہ اختر الایمان کا ضبط کمال ہے کہ مسلسل سانحات و حادثات کے باوجود وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ قسمت کی ستم ظریفی اور گردش وقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنی نہاد اور گرد و پیش کی وجہ سے میرے ذہن میں زندگی کا کوئی ارفع و اعلیٰ تصور نہیں تھا۔ میں آج جو زندہ ہوں یہ بھی محض اتفاق ہے ورنہ اپنی طرف سے میں نے کبھی کوئی ایسی کوشش نہیں کی کہ زندہ رہوں... علم البشر مجھے ہمیشہ برانگیختہ کرتا تھا۔ بشر کا آغاز، اس کا عروج اس کا زوال یہ سب مجھے جانے کہاں کھینچ لے جاتے ہیں۔'' (اس آباد خرابے میں: اختر الایمان، اردو اکادمی دہلی، 2010،ص 29,30)

اختر الایمان کو انسان کی بے مقصد اور غیر مرتب زندگی کا شدت سے احساس تھا اور وہ اپنے تاثرات کو آپ بیتی میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

''میں ایک مدت سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوا ہوں کہ مسائل جوں کے توں رہتے ہیں۔ آدمی مرتا کھپتا رہتا ہے۔ وقتی طور پر ان مسائل کا کوئی حل نکل آتا ہے مگر اس حل سے کچھ اور نئے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی بڑا مقصد نہیں... اس زمین پر خیالات کا تصورات کا جو بھی منصوبہ ہے وہ انسان کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کو ایک مقصد دینا چاہتا ہے اس لیے مسلسل ادھیڑ بن میں مصروف رہتا ہے۔ روٹی کی تلاش اور جنس کی لذت کے حصول کے بعد اس کے پاس اور کچھ نہیں بچتا اس لیے وہ روز نئے مسائل اٹھاتا رہتا ہے اور خوش ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد پورا کررہا ہے۔'' (ایضاً،ص 175)

اختر الایمان نے اپنے دوست محمود ایاز کی فرمائش پر اپنی زندگی کے واقعات لکھ کر ان کے پاس بھیجے جو رسالہ 'سوغات' میں قسط وار شائع ہوئے۔ 1996 میں اردو اکادمی دہلی سے شائع ہوکر یہ کتاب 'اس آباد خرابے میں' کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ پندرہ ابواب پر مشتمل یہ خودنوشت وہ روداد حیات ہے جس میں اختر الایمان کی زندگی کے تمام گوشے، شخصیت کے منفی و مثبت پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ دیگر آپ بیتیوں کی طرح اپنی پیدائش، مقام اور خاندانی حالات وغیرہ کے براہ راست بیان کے بجائے اختر الایمان افسانوی انداز میں خودنوشت کا آغاز کرتے ہیں مثلاً رات کا وقت، عبداللہ پور جمنا نگر کا اسٹیشن، پلیٹ فارم پر جلتی ہوئی مٹی کے تیل کی لالٹین، مصنف کی غنودگی اور کانوں میں آتی ابا کی آواز وغیرہ افسانے کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ اختر الایمان ماضی کی یادوں کے سہارے زندگی کے تمام اوراق پلٹتے نظر آتے ہیں۔ یہ خود نوشت اختر الایمان کی پیدائش، تعلیم و تربیت، آبا و اجداد، والدین، عزیز و اقارب، دوست و رشتہ دار، استاد وغیرہ کے متعلق تفصیلات بہم پہنچاتی ہے۔ اس آپ بیتی میں جا بہ جا اختر الایمان کی آبائی وطن سے محبت، دیہی مناظر سے انسیت اور بچپن کے پرلطف ایام سے دلچسپی کا مظاہرہ ملتا ہے۔ ان کی زندگی میں نہ جانے کتنے اتار چڑھاؤ آئے، مختلف مقامات کی سیر کی، متعدد ماحول سے واسطہ پڑا مگر گاؤں کے خوبصورت مناظر اور لڑکپن کے بےفکری کے لمحات ان کے ذہن سے کبھی محو نہ ہوئے۔ والد کے ساتھ گاؤں چھوڑتے وقت ان کے دلی کرب کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''میں ایک بیل گاڑی کے پاس کھڑا ہوں۔ ہم ایک گاؤں چھوڑ کر دوسرے گاؤں میں جارہے ہیں۔ ہمارا سامان بیل گاڑی میں لادا جارہا ہے اور میں یہ منظر بڑی بے بسی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ بے بسی اس لیے کہ میں یہ گاؤں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس گاؤں کا نام رکڑی تھا۔ یہاں بہت سے جوہڑ تھے۔ جوہڑوں میں کنول اور نیلوفر کھلتے تھے۔ سب طرف بڑے بڑے آموں کے گھنے باغ تھے۔ باغوں میں کھلیان پڑتے تھے، کوئلیں کوکتی تھیں، پپیہے بولتے تھے، پدے تھے، شامائیں تھیں، لال تھے جو موسم کی تبدیلی کے ساتھ رنگ بدلتے تھے، بینائیں تھیں، غرض کہ وہ سب کچھ تھا جو مجھے مرغوب اور پسند تھا۔ مگر میری مرضی نہیں چلی، مجھے گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی مجھے لے کر روانہ ہوگئی مگر میں وہیں کھڑا رہ گیا۔'' (ایضاً،ص 14,15)

خودنوشت کے ابتدائی ابواب میں مصنف کے بچپن کے حالات و واقعات، والد کی خانہ بدوشانہ زندگی اور نتیجے میں مصنف کے بے ربط تعلیمی مراحل، رکڑی، کمباسی، جگادھری اور سگھ مدرسہ کے احوال، والدین کے اختلافات، بیوی بچوں کو لے کر والد کا غیر سنجیدہ رویہ، معاشی تنگی، مصنف اور ان کی والدہ کا مزدوری کرنا وغیرہ واقعات اختر الایمان کے اذیت اور مشقت آمیز بچپن کا پتہ دیتے ہیں، جو کسی بھی انسان کے لیے بہت ہی المناک تجربہ ہوسکتا ہے۔ بچپن ہر بچے کا دور زریں ہوتا ہے جس میں وہ بے فکری کے ایام گزارتا ہے اور

زندگی کا لطف اٹھاتا ہے مگر اختر الایمان کو اپنی کمسنی میں وہ لطف اور اطمینان نصیب نہ ہو سکا۔ آپ بیتی میں مؤید الاسلام میں چار سال گزارے ہوئے دنوں کا بیان قابل توجہ ہے۔ مؤید الاسلام سے اختر الایمان کی زندگی کے سفر کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ خودنوشت میں مؤید الاسلام کی دعوتوں، مختلف کردار کی شکل وصورت اور حرکات وسکنات، حلقے کے غیر ذمے دارانہ انتظام وغیرہ کا تفصیلی اور متاثر کن بیان ملتا ہے۔ مؤید الاسلام کی زندگی بقول اختر الایمان ان کے لیے کافی اہم رہی ہے:

''مؤید الاسلام میں مجھے چوتھی جماعت میں داخلہ ملا۔ وہ لکڑی کا چھت کو چومتا ہوا بڑا دروازہ میرے لیے واقعی ایک ایسا دروازہ ثابت ہوا جہاں سے میری زندگی کا سفر شروع ہو رہا تھا۔'' (ایضاً، ص 40)

آپ بیتی کے مطالعے سے نہ صرف مصنف کے مشکل حالات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کٹھن مراحل میں زندگی کو بہتر بنانے کی ان کی جدوجہد، صبر وضبط اور حصول علم کی خواہش کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مؤید الاسلام کے بعد ان کی زندگی کی کوئی مخصوص راہ متعین نہ تھی، ایسے میں اختر الایمان لکھتے ہیں:

''اسی طرح کی مجبوریوں میں انسان جیتے ہیں، جیتے کیا ہیں 'گزران' کرتے ہیں۔ صبح کی شام اور شام کی صبح کرتے ہیں، ان میں تھوڑے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی کا مقصد جاننا چاہتے ہیں۔ کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا تو اسے مقصد دینا چاہتے ہیں۔ میرا شمار کن لوگوں میں ہو سکتا ہے، نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں بے چین رہتا تھا۔ خواب ایسے دیکھتا تھا جیسے بازوؤں میں پر نکل آئے ہیں، ذہن میں ایک ہی بات بیٹھی ہوئی تھی اڑنے کے لیے پر چاہئیں تو علم حاصل کرو۔'' (ایضاً، ص 47,48)

اور پھر یہی بات اختر الایمان کے لیے حوصلہ بخش ثابت ہوئی۔ بے مقصد زندگی کو بامقصد اور بامعنی بنانے کی مسلسل کوشش انھیں فتح پوری مسلم ہائی اسکول لے آئی۔ اگرچہ فتح پوری اسکول کی زندگی بقول اختر الایمان ''بہت مصروف اور مشکل بھری زندگی تھی'' (ایضاً، ص 49)

مگر تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہاں سے ملے سرٹیفکیٹ پر صوفی صغیر صاحب کے لکھے جملے اختر الایمان کی دقت پسندی، دور اندیشی، ذہنی صلاحیت اور خود اعتمادی پر دلالت کرتے ہیں۔ 'اس آباد خرابے میں' مصنف کی اینگلو عربک کالج سے وابستگی کا بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے یہاں کی تعلیمی، سیاسی وادبی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ علی گڑھ سے وابستگی، وہاں کے زمانہ طالب علمی، علمی وادبی جلسوں وکانفرنسوں، طلبا کی ذہنی وسعت، اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور مختلف اشخاص سے تعارف وتعلقات کا بھی بیان ملتا ہے۔ اختر الایمان کے ادبی ذوق اور شعر گوئی کی ابتدا میں جامع مسجد کے چوک میں غزلیں گا گا کر بیچتے ہوئے اشفاق نامی شخص کا فیضان شامل ہے اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے اختر الایمان لکھتے ہیں:

''شہر میں کہیں بھی جانا ہو جامع مسجد کے چوک سے اکثر گزرنا ہوتا تھا۔ شام کو گزری کا بازار، کٹورے بجنے کی آوازیں، سیڑھیوں پر خورد ونوش کی سجی ہوئی دکانوں کے ساتھ ایک جھوجری آواز بھی سنائی دیتی تھی اس آواز کے مالک کا نام اشفاق تھا۔ وہ شاعر تھا اور اپنی غزلوں کی چار چار چھ چھ صفحے کی کتابیں چھاپ کر گا گا کر جامع مسجد کے چوک میں بیچا کرتا تھا۔ جانے کیوں ادھر سے گزرتے وقت کئی بار میرے ذہن میں خیال آیا ایسی شاعری تو میں بھی کر سکتا ہوں اور میں نے شاعری شروع کر دی۔'' (ایضاً، ص 43)

'اس آباد خرابے میں' کے مطالعے کے ذریعے اختر الایمان کی شخصیت، اخلاق و کردار اور مزاج واطوار کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ناآسودہ حالات، پُرآزمائش ایام اور طبیعت کی ناسازگاری نے اختر الایمان کے مزاج میں چڑچڑاپن، غصہ اور تنہائی پسندی اور بے چینی کی کیفیت پیدا کردی۔ غیر مطمئن نجی حالات اور سخت احساس محرومی کے باعث ان کے رویے میں نامناسب تبدیلی مثلاً کثرت سے سگریٹ نوشی اور شراب نوشی کے واقعات بھی خودنوشت کے ذریعے سامنے آتے ہیں، جو ان کی شخصیت کے منفی پہلو ہیں مگر بعض ایسے بھی واقعات ہیں جن سے اختر الایمان کے صبر و ضبط، دور اندیشی، معاملہ فہمی، جدوجہد اور قناعت پسندی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خودنوشت کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر الایمان کو تلاش معاش کے لیے ہمہ وقت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور وہ مختلف تجربات سے بھی روشناس ہوئے۔ معاشی فکر کو دور کرنے کے لیے ریڈیو سے وابستہ ہوئے مگر اطمینان بخش ملازمت نہ ہونے کے سبب سلسلہ منقطع ہو گیا۔ فلمی دنیا سے وابستگی اختر الایمان کے لیے خوش کن دور ثابت ہوا۔ انھوں نے فلمی دنیا کی زندگی یہاں کے نفع ونقصان، کامیابی وناکامی کے تلخ وشیریں تجربات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

خودنوشت میں اختر الایمان کی ازدواجی زندگی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ گھر والوں کے دباؤ میں آکر انھوں نے سلمہ (سلیمن) سے نکاح تو کر لیا مگر بیوی کے طور پر قبول نہ کر سکے۔ سلمہ کی ضدی طبیعت، ناخواندگی، مصنف کی ناپسندیدگی اور دونوں کے مزاج میں تضاد نے اس رشتے کو ختم کر دیا۔ سلطانہ سے تعارف اختر الایمان کے دوست محمد علی منصوری کے ذریعے ہوا، جو انھیں کی بہن تھیں۔ پسندیدگی اور ملاقات کے سلسلے نے دونوں کو ازدواجی رشتے میں منسلک کر دیا۔ جس طرح ادبی دنیا میں اختر الایمان نے بطور شاعر نمایاں کامیابی حاصل کی اسی طرح ذاتی زندگی میں بھی وہ ایک اچھے شوہر اور بہترین والد ثابت ہوئے۔ بیوی، بچوں کی آرام وآسائش اور ضروریات کو پوری کرنے کے لیے ہمیشہ سرگرداں رہے، ان کی خواہشات کا ہمیشہ خیال رکھا، بچپن میں جو محرومی انھوں نے دیکھی تھی اور جو خواب تشنہ رہ گئے تھے، بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت کے ذریعے انھوں نے اپنی ذات کے ان تمام خلا کو پورا کیا۔ جس اذیت سے وہ گزرے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا سایہ بھی ان کے بچوں پر پڑے۔ بقول سلطانہ ایمان:

''اختر الایمان کو اپنے بچے، بہت پیارے ہیں۔ بچپن سے آج تک ان کی ہر ضد اور خواہش پوری کی...... یہ کہتے ہیں کہ بچپن میں جو کچھ مجھے نہیں ملا وہ سب ان بچوں کو دینا چاہتا ہوں۔''
(اختر الایمان: عکس اور جہتیں، مرتبہ: شاہد ماہلی، معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی 2000، ص 27)

'اس آباد خرابے میں' کے مطالعے کے ذریعے اختر الایمان کی شخصیت، اخلاق وکردار اور مزاج واطوار کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ناآسودہ حالات، پُرآزمائش ایام اور طبیعت کی ناسازگاری نے اختر الایمان کے مزاج میں چڑچڑاپن، غصہ اور تنہائی پسندی اور بے چینی کی کیفیت پیدا کردی۔ غیر مطمئن نجی حالات اور سخت احساس محرومی کے باعث ان کے رویے میں نامناسب تبدیلی مثلاً کثرت سے سگریٹ نوشی اور شراب نوشی کے واقعات بھی خودنوشت کے ذریعے سامنے آتے ہیں، جو ان کی شخصیت کے منفی پہلو ہیں مگر بعض ایسے بھی واقعات ہیں جن سے اختر الایمان کے صبر وضبط، دور اندیشی، معاملہ فہمی، جدوجہد اور قناعت پسندی کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس خودنوشت کے ذریعے مصنف کے ذاتی احوال وافکار، مزاج واطوار، ذہنی نفسیات کے ساتھ ساتھ متعلقہ عہد کے سیاسی، سماجی، ادبی حالات مختلف تحریکات اور تقسیم ہند کے بھی واقعات سامنے آتے ہیں۔ طرز بیان اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے بھی 'اس آباد خرابے میں' کو بلاشبہ ایک بہترین خودنوشت قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب کسی باقاعدہ پلان کے تحت وجود میں نہیں آئی تھی اس لیے واقعات میں بے ربطی اور تکرار کا معاملہ سامنے آگیا ہے اور بعض مقامات پر تسلسل کی بھی کمی پائی جاتی ہے مگر موضوع اور فنی لوازم کی وجہ سے یہ خودنوشت ایک کامیاب اور یادگار کہی جا سکتی ہے۔

■

Hina Firdaus, Research Scholar, Dept of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002 (UP)

انتخاب کلام

زندگی کے دروازے پر

پا برہنہ و سراسیمہ سا اک جمِ غفیر
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعلِ بے شعلہ و دود
مضطرب ہوکے گھروندوں سے نکل آیا ہے
جیسے اب توڑ ہی ڈالے گا یہ برسوں کا جمود؟

ان پپوٹوں میں یہ پتھرائی ہوئی سی آنکھیں
جن میں فردا کا کوئی خواب اُجاگر ہی نہیں
کیسے ڈھونڈیں گی درِ زیست، کہاں ڈھونڈیں گی
ان کو وہ تشنگیِ شوق میسر ہی نہیں

جیسے صدیوں کے چٹانوں پہ تراشے ہوئے بُت
ایک دیوانے مصور کی طبیعت کا اُبال
ناچتے ناچتے غاروں سے نکل آئے ہوں
اور واپس انھیں غاروں میں ہو جانے کا خیال

زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
اور یہ رقصِ طلسمانہ کے رنگیں سائے
اس کی نظروں کو دیے جاتے ہیں پیہم دھوکے
جیسے بس آنکھ جھپکنے میں وہ اُڑ کر آئے

شہپر موت کسی غولِ بیاباں کی طرح
قہقہے بھرتا ہے، خاموش فضاؤں میں، صدا
کانپتے کانپتے اک بار سمٹ جاتی ہے
ایک تاریک سا پردہ یونہی آویزاں رہا

کوئی دروازہ پہ دستک ہے نہ قدموں کا نشاں
چند پُرہول سے اسرار تہہ سایہ در
خود ہی سرگوشیاں کرتے ہیں، کوئی جیسے کہے
''پھر پلٹ آئے یہ کم بخت وہی شام و سحر؟''

ناچتا رہتا ہے دروازے کے باہر یہ ہجوم
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعلِ بے شعلہ و دود
زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
کیا خبر توڑ ہی دے بڑھ کے کوئی قفلِ جمود؟

ایک لڑکا

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سِنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم، جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم، تتلیوں کے، سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں، جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں، کبھی جیوں چشم خوں بستہ
ہوا میں تیرتا، خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا، مڑتا
مجھے اک لڑکا، آوارہ منش، آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تُند چشموں کا، رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے، ہرگام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کررہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

خدائے عز و جل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بسترِ کم خواب ہو، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایہ
اسی کی بخششیں ہیں، اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا، اک حد فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے خاکِ اسفل سے
مری تخلیق کی مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے، کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کردی ہیں
وہ حاکم قادرِ مطلق ہے، یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ہے، خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اس کی رحمت اور سخاوت ہے!
اسی نے خسروی دی ہے، لئیموں کو مجھے نکبت
اسی نے یاوہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضے میں
جز اک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں، پھر بھی مگر مجھ کو
خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے
عناصر منتشر ہوجانے، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ اُن کا کہہ کر مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکّے کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح، لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلاّ کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مرچکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں!
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مرچکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے

یہ کذب و افترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں!

گریز

رابطہ جسم و جاں میں کتنا ہے
رشتہ اس دل ستاں سے کیسا ہے
کیا ہے وہ، زہر ہے کہ آبِ حیات
بارہا جس کو پی کے دیکھا ہے
کیوں نہیں لکھتے ان حقائق پر
جن کا دامن لہو سے بھیگا ہے
یہ ہیں اور ایسی ڈھیر سی باتیں
جن سے گزرے، چھوا ہے، چکھا ہے
ہم فراموش کرتے رہتے ہیں
آپ ہی خود سے ڈرتے رہتے ہیں

تلاش کی پہلی اڑان

رزق کی جستجو لے گئی سو بہ سو
جسم کی آرزو لے گئی کو بہ کو
اور جب خوانِ نعمت سجایا گیا
ایک گل پیرہن ڈھونڈ لایا گیا
دفعتاً تب یہ احساس پیدا ہوا
گوشت اور پوست کی ایک چرخی ہوں میں
ایک پہیہ ہوں میں، گشت کرتا ہوا
اشتہا مٹ گئی پیٹ کی، جسم کی
روح پیاسی تھی ویسی ہی پیاسی رہی
میرے عزمِ سفر نے مجھے کیا دیا
شرق سے غرب تک ایک پھیلا ہوا فاصلہ، فاصلہ!

مناجات

آشفتہ خاطری مری مٹی میں ہے ملی
تو یونہی مجھ کو دیکھ کے آزردہ ہوگئے
ہر لمحہ قبر ہے گئے لمحے کی، ہر نفس
پہلے نفس کی گور ہے، افسردہ ہوگئے
کارِ جہاں ڈھکا ہے مناظر کے حسن سے
افسونِ جدلیات سے غم مردہ ہوگئے
یوں سمجھو ساز باز ہے اک موت سے حیات
شر قوتِ نمو کا محرک ہے، سادگی
اک ماندگی کی شکل ہے، یونہی چلے چلیں
بے پایاں ممکنات کا یہ بحرِ بے کنار
ہم جس میں تیرتے ہیں، خدائے عظیم ہے
مظہر ہے یا خدا کا، چلو سر بہ سجدہ ہوں

اے ربّ لا یزال کوئی راہِ مستقیم
مجھ کو نہ بخش دینا، یونہی بے قرار رکھ
لاکے محیط میرا مرض آگہی نہیں
اک تشنگی ہے، میرا مرض لاعلاج کر
پھیلا دے اور آگ زمیں پر مرے لیے
جو دہر کا مزاج ہے میرا مزاج کر
منعم، غنیم، قافلہ سالار، اشتہا
کچھ اِس طرح کے اور بھی الفاظ دے مجھے
مفلوج کر کے میرے قویٰ، میرے ولولے
پھر حوصلہ دے، ہمتِ پرواز دے مجھے
آبِ حیات زہر بنا دے مرے لیے
یہ زہر اس کے بعد رگوں میں اُتار دے
دِن، اس کی برکتیں، جسے جی چاہے بخش دے
دائم تڑپ مجھے، خلشِ انتظار دے

بازگشت

نہ کوئی چہرہ شناسا، نہ کوئی راحت جاں
چلے کہاں کے لیے تھے، ہم آگئے ہیں کہاں
وفا کی راہ میں ہر سمت خاک اڑتی ہے
نہ دور تک کہیں چھاؤں، نہ راستوں کے نشاں
وفا بھی سوختہ لب اور جفا بھی سوختہ لب
نہ قہقہے ہیں فضا میں کہیں، نہ آہ و فغاں
یہ کس کا عہدِ ستم ہے، ذرا پتہ تو چلے
ہزار چہرے ہیں، ہر شخص کا ہے حکم رواں

فراعنہ ہیں، نہ شداد ہے، نہ کنس کوئی
مگر انھیں کی صدا سے بھرے ہیں کون و کاں

تشخیص

مجھے یہ کون سے دارالشفا میں لائے ہو
یہاں تو بھیڑ ہے اک زرگزیدہ لوگوں کی
جو اپنے زخم کے مرہم کی جستجو میں ہیں
علاج اس کا تو ممکن نہیں زمیں پہ ابھی
یہ زرگزیدگی ایسا مرض ہے جس کے سبب
بہت سے اور مرض جسم میں ابھرتے ہیں
ہر ایک موڑ پہ، راہوں میں کتنے جان بلب
پڑے کراہتے ہیں لادوائی کے ہاتھوں
بشر گزیدہ ہوں میں لے چلو یہاں سے مجھے
مرا مرض نہیں پہچانتا یہاں کوئی

زمستاں سرد مہری کا

کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں، فقط میں
کسے آواز دو گے، رنگِ پیراہن تصور میں
بہت جلوہ گری کرتا ہے، لیکن وہ قد و قامت
تکلم کا کرشمہ سا تو اوجھل ہے نگاہوں سے
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا جس کا مداوا ہی نہیں کوئی
بجز اس کے اٹھالائیں وہ جنت سی تخیل میں
چمن سازی کریں
لفظوں کے گل بوٹے کھلائیں، اس کے دامن کو
کچھ اس انداز سے کھینچیں، وہ ٹھٹھا مار کے ہنس دے
خفا بھی ہو
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا جس کا مداوا ہے
گزرتی رات کی چاندی پگھلنے دیں
یہ گھاؤ صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں، فقط میں
بہت اُڑتے ہوئے رنگوں کی جھینی چھلنی چادر سے
مرے ہونٹوں سے لپٹی نا طلب بوسوں کی شیرینی
وہ سب آئینہ خانوں میں سجی تصویر سے چہرے
محرک فلم کے پردے پہ عیشِ بزم کے ساماں
وہ سارے ہم نوالہ، ہم پیالہ یوسفِ ثانی
دلِ درد آشنا لے کر جو اِس دنیا میں آئے تھے
مری یادوں کے البم میں ہیں ان کی دھندلی تصویریں
شکست و کامیابی کے مناظر، خندہ پیشانی
شہابی گالوں پہ موتی کی لڑیاں ٹوٹتی بنتی
وفا کی داستاں، رسوائی کے قصے
یہ کس کس کی ہنسی، سرگوشیاں، باتیں ہیں، سب پہچانتا
ہوں میں
میں کیسی آشنائی سے پکڑتا ہوں کلائی کو
وہ کیسی دلربائی سے چھڑا لیتی ہے ہاتھ اپنا
وہ منہ کا ذائقہ، باتوں کی گرمی، رات کا جادو
بہے جاتی ہے میری کشتیِ عمرِ رواں کیسے
حواسِ خمسہ، سحر سامری میں، وقت کی گم ہیں
فسانہ تھا جہاں جیسے، حقیقت تھی گماں جیسے
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں، فقط میں
بہے جاتی ہے میری کشتیِ عمرِ رواں آہستہ آہستہ
خیال و خواب ہوتا جا رہا ہے یہ جہاں آہستہ آہستہ

ماخذ: کلیات اختر الایمان، مرتبین: سلطانہ ایمان، بیدار بخت،
سنہ اشاعت: 2000، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

محمد محفوظ الحسن

اردو زبان و ادب اور مگہی

اُردو ایک مشترک اور مخلوط آریائی نسل کی زبان ہے۔ یہ ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں سے اس کی شیرینی اور مٹھاس دنیا کے دوسرے ممالک تک پہنچی۔ یہ ہندوستان کے مشرق و مغرب، جنوب و شمال میں یکساں طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ ابتدا میں اسے ہندوی کہا جاتا تھا وقت کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں کے اشتراک بالخصوص مغلوں کی آمد کے بعد اسے اردو کے نام سے جانا جانے لگا۔ اردو ترکی زبان میں لشکر کو کہتے ہیں، عام خیال یہی ہے کہ یہ لشکری زبان ہے اور لشکریوں کے آپسی میل جول کی پیداوار ہے جو دوسرے ممالک سے ہندوستانی فاتحین کے ساتھ آئے تھے اور یہاں کے مقامی باشندوں کے اشتراک سے جس نئی بول چال کی زبان کی ابتدا ہوئی وہ اردو ہے۔ اس میں تھوڑی صداقت ضرور ہے مگر اردو کی اصل پیدائش اور نشوونما میں ان بزرگان دین اور تجار کی خدمات سے انکار کی گنجائش نہیں جو ہندوستان کے سواحلی علاقے میں تبلیغ اور تجارت کی غرض سے آئے اور یہیں بس گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کا ہر علاقہ اردو کی اصل جائے پیدائش ہونے کا دعوے دار ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر علاقے کی مقامی بولی اور زبان کے اشتراک سے اس کی نمود ہوئی ہے۔

ایسا ہی ایک علاقہ بہار بھی ہے۔ بہار میں مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں اور زبانیں کل تھیں اور آج بھی ہیں، مثلاً میتھلی، بھوجپوری، انگیکا، بجیکا، مگہی وغیرہ۔ جب بہار کی تقسیم نہیں ہوئی تھی تب چھوٹا ناگپور اور سنتھال پرگنہ کے علاقے میں سنتھالی، اوراؤں اور دیگر ڈراویڈی زبانیں رائج تھیں آج بھی جھارکھنڈ کی تشکیل کے بعد اس علاقے میں ان زبانوں کا رواج ہے، مگر بہار کے دوسرے علاقے کے لوگوں کی موجودگی کے باعث اس علاقے کے تمام صنعتی مقامات پر اردو، مگہی، بھوجپوری اور میتھلی بولنے والے ملتے ہیں۔ جو تلاش روزگار میں اپنے اپنے علاقوں سے آکر یہاں بس گئے ہیں۔

مگدھ کا علاقہ ہندوستانی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ علمی، روحانی نقوش کے ساتھ ساتھ سیاسی برتری بھی اسی علاقے کو حاصل تھی۔ دنیا کی پہلی جمہوریت نے ویشالی میں آنکھیں کھولیں۔ نالندہ اور وکرم شیلا کی یونیورسیٹیاں یہاں قائم ہوئیں۔ اشوک اعظم اس علاقے مگدھ کے باشی تھے۔ مہاویر جین، گوتم بدھ اور حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مواعظ حسنہ اس علاقے سے دنیا کو روحانیت اور وحدانیت کا پاٹھ پڑھاتے رہے۔ مگدھ کے علاقے میں بولی جانے والی زبان کو ماگدھ، مگدھی یا مگہی کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ ہے گیا، نوادہ، ارول، جہان آباد، اورنگ آباد، نالندہ، مونگیر اور بھاگلپور کے کچھ حصے جو نوادہ اور نالندہ سے متصل ہیں۔ سنیتی کمار چٹرجی اور گریرسن کے حوالے سے اختر اورینوی نے ماگدھی اور اودھ ماگدھی میں اسے منقسم کیا ہے۔ مگر آج کی مگہی بھاشا کے ودوان مگہی کو کئی حصوں میں منقسم کرتے ہیں جن کے نام ہیں مانک مگہی، یعنی معیاری مگہی۔ اس میں گیا، جہان آباد، نوادہ اور نالندہ کے علاقے آتے ہیں۔ ارول کا مشرقی حصہ جو سون کنارے واقع ہے اس علاقے میں سون تر پا مگہی رائج ہے۔ نوادہ کا علاقہ جو بھاگلپور سے متصل اور کچھ بھاگلپور کے علاقے جو نوادہ سے متصل ہیں اور کچھ مونگیر ضلع کے حصے میں جو زبان ہے اسے پوری مگہی کہا جاتا ہے۔ اورنگ آباد کے علاقے میں شرت مگہی رائج ہے۔ پٹنہ کا پوربی علاقہ جو مسوڑھی پن پن سے ہوتا ہوا منیر تک جاتا ہے یہ علاقہ ہی مانک مگہی کا کہا جاتا ہے۔ متھلانچل، سیمانچل، بھوجپور کے متصل جو علاقے ہیں ان میں تت ورتی مگہی رائج ہے یعنی شرت اور تت ورتی مگہی وہ ہے جس میں بھوجپوری، میتھلی، کھڑی بولی اور اودھی، برج بھاشا وغیرہ ملی جلی بھاشائیں ہیں۔ بہار میں جو مختلف علاقائی بولیاں بولی جاتی ہیں ان کے جغرافیائی، تہذیبی اور ثقافتی فرق و امتیاز کے علاوہ مگدھ کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی مگہی کے لب و لہجے میں نمایاں فرق نظر آتا ہے اور اس سے اس مخصوص علاقے کی پہچان بنی ہے۔ ماہرین لسانیات کے خیال میں بھوجپوری میتھلی وغیرہ میں ادبی نمونے کافی دستیاب ہیں مگر مگہی کو انھوں نے عوامی بولی ہی قرار دیا ہے اس لیے کہ اس کا اپنا کوئی ادب یا ادبی پہچان نہیں تھی۔ ممکن ہے ان کے زمانے میں یہ صحیح ہو مگر جہاں تک آج کی صورت حال ہے اب باضابطہ مگہی ادب کی ترویج و اشاعت پر زور دیا جا رہا ہے۔ مگہی کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس میں تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ ریڈیو، دوردرشن سے مگہی نشریات ہوتی رہتی ہیں۔ شعری اور نثری تخلیقات کی اشاعت ہو رہی ہے۔

اردو اپنی ابتدا ہی سے مختلف علاقائی زبانوں سے اشتراک کرتی رہی ہے۔ ان سے متاثر ہوتی رہی ہے اور ان پر اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ بہار میں اردو کی ابتدا کے تعلق سے حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور سید محمد امجھری کے جو ملفوظات دستیاب ہوتے ہیں۔ ان میں خالص مگہی کے بعض الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ پھلواری شریف کے شعرا کی شاعری میں بھی خالص مگہی کے الفاظ کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے مگہی کے الفاظ کو خواہ بزرگان دین ہوں یا دوسرے فنکار وادیب، انھوں نے اس کے استعمال سے اپنے فن پاروں کو مقامیت اور علاقائیت آشنا رکھنے اور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا اقرار بھی ضروری ہے کہ مگدھ کے علاقے میں جس کثرت سے اردو کے ادیب و شاعر اور نثر نگار گذرے ہیں کہ ان کی تعداد انگلیوں پر نہیں گنی جا سکتی۔ مگر ان کی تخلیقات میں مگہی زبان کا وہ اثر دیکھا جا سکتا ہے جو میتھلی، بھوجپوری، اودھی، برج بھاشا یا دیگر اپ بھرنشوں کا ہے۔ پھر بھی قدیم و جدید فنکاروں کی تصنیفات میں تلاش کے بعد کچھ نمونے ایسے ضرور مل جاتے ہیں جو مگہی کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

اختر اورینوی نے نقوش سلیمانی کے حوالے سے حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے جو ملفوظات نقل کئے ہیں ان میں۔ ہوتی سو ہوتی، لاگی، ایہیں، پوڑی، ترتے آگو اور سید محمد القادری امجھری سے منسوب ایک جملے میں 'انہاں اور جیو' جیسے الفاظ مگہی اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

نور احمد عملدار شاہ آیت اللہ کے مرثیوں میں، بپتا ہمار، کاسے کہوں، کاسے کہنے کون سنے ہے، مائی، اور راسخ کے یہاں ہیں گے کے الفاظ مگہی کے اثرات ہیں۔

اختر اورینوی، شکیلہ اختر، انجم مانپوری، احمد صغیر کی تخلیقات پر مگہی کے اثرات خال خال نظر آتے ہیں۔ مثلاً

اختر اور بینوی کے افسانہ کوئلہ والا۔ میں بھان کران، فرمائیں، روجہ، مکر بھی، فانی، قرآں، فرمایا، روزہ اور شکر کا استعمال نظر آتا ہے۔

اسی طرح شکیلہ اختر کے یہاں بھی سون ترپا مگہی کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے ایک افسانہ 'ڈائن' میں اگاوہ آنہ پیہ۔ سوا گورو پیہ، کرم گیلی وغیرہ مستعمل ہوئے ہیں۔

انجم مانپوری کے ایک طنزیہ مضمون میر کے یہ جملے مگہی کے اثرات کو درشاتے ہیں۔

جیؤ بتیا، ہئے کاہے ہٹوری، ہمرا رائے، چھوڑ دہل جائے۔ ہمرا اسیسری کے رہائی کر دہل جائی، ہمرا پیٹ پیرات ہے، سرکار کی کرپا سے ہمرا گلٹی پلیگ ناہیں''

اسی طرح احمد صغیر کے ایک افسانہ میں، ہمرا پاس، ہمرا کام، ہاتھ پھیلاوے وغیرہ الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔

بیانیہ صنف میں مگہی کا استعمال جس فنکار نے بھی کیا ہے عام طور سے مکالمہ نگاری کے لیے کیا ہے۔ کرداروں کی سماجی اور طبقاتی پیشکش بھی اس کے ذریعہ ہوئی ہے اور ان کی زبان کے استعمال سے اردو بیانیہ کو ذائقہ دار بنانے کی کوشش بھی ہوئی ہے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے مگہی میں معیاری ادبی تخلیقات کی طرف بہت کم توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ اس کا اپنا ادب نہیں ہے۔ مگہی زبان میں عام انسانی زندگی کے حقائق اور کلچر و تمدن کو زبانی طور پر مقامی لوک گیتوں میں محفوظ کر رکھا ہے۔ ان گیتوں کو مختلف مواقع پر مختلف موسموں اور تیوہاروں، رسم و رواج کی انجام دہی کے وقت مگھہ کے علاقے میں بڑی فراخ دلی سے جذبات کی عکاسی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے اور آج بھی اس کا سلسلہ برقرار ہے۔ اردو بولنے والے گھرانوں میں بھی یہ لوریوں اور دیگر شکل میں زبانی طور پر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہیں۔ شکیلہ اختر نے معاصر پٹنہ اور آج کل دہلی میں بہار کے لوگ گیت کے عنوان سے اور قاسم خورشید نے بہار کے علاقائی زبانوں کا ادب اور اردو کے عنوان سے...... اپنے ایک مضمون میں اس کی نشاندہی کی ہے۔ اردو ادب میں ان گیتوں کے تحریری نمونے نہیں ملتے۔ اس سے یہ انداز لگانا بہت دشوار نہیں ہے کہ مگہی نے کہاں تک اردو ادب کو متاثر کیا ہے۔

پھر بھی مختلف قسم کے گیت کے کچھ حصے جو ہمارے گھروں میں سننے کو ملے ہیں یا آس پاس کے علاقوں میں مختلف موقعوں پر گائے جاتے ہیں ان کے نمونے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

بچوں کو سلانے یا بہلانے کے لیے

''ارے آوٴ پارے آوٴ، ندیا کنارے آوٴ، سونا کے کٹوریا میں دودھ بھات لیلے آوٴ ببوا کے مُنھوا میں گوٹوک''

جب کوئی دلہن یا بیٹی گھر سے سسرال یا سسرال سے گھر آتی ہے تو کہاروں سے کیا کہتی ہے؟

اَموا کے نیچو نیچو ڈولیا اتار رے کہروا دیکھی ہی ہنسے گننواں کے لوگ

کسان ہل بیل کاندھے پر رکھ کر ہل جوتنے نکلتا ہے تو یہ گیت سنائی دیتا ہے۔

کھیتوا جوتل جائے کنوا، آگو آگو بیلا پاچھے سے کسنوا کھیتوا جوتل جائے۔

ان سطور کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان و ادب پر مگہی کے اثرات نمایاں ہیں۔ البتہ مگہی زبان و ادب میں عربی و فارسی کے الفاظ اور اصناف نے اپنی جگہ بنالی ہے اور ان کی تصنیفات و تالیفات میں اردو کے اثرات سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

ہاں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ دیگر مقامی اور علاقائی زبانوں کے ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے اور اس کے وافر نمونے اور مثالیں مختلف فنکاروں کی تحریروں میں دستیاب ہیں۔ قاسم خورشید نے مگہی کے تعلق سے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''مگہی میں ادب عالیہ کی کمی خاص طور سے رہی ہے۔ اس لیے اس کے عوامی ادب میں ہی عوامی زندگی کی حقیقی تحریر ہوتی ہے۔ اس کے عوامی گیت جذبات کی نزاکت اور شاعرانہ دل کشی کے نقطہ نظر سے اعلی درجے کے ہیں۔ بہار کی دیگر زبانوں کی طرح اس میں بھی تمام مواقع پر گائے جانے والے ہر قسم کے عوامی گیت دستیاب ہیں۔ ان گیتوں میں موسم بہار کے خوشی، برسات کے منڈولے، جدائی کا کرب، ماں باپ کی شفقت وغیرہ کے فطری جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔'' مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''کہا گیا ہے کہ یہ گیت تحریری نہیں ہیں بلکہ یہ بولی کی سطح پر گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں کے بول ایک گاؤں کے نہیں ہیں بلکہ یہ کئی گاؤں میں جو ایک دوسرے سے پچاسوں میل کے فاصلے پر واقع ہیں گائے جاتے ہیں، لیکن ان گیتوں کو سن کر بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اردو ادب بکھرا ہوا ہے۔ مگدھ کی غیر مسلم خواتین بھی گیت اور جھومر گاتی ہیں۔ جیٹھ اور چیت کے موقع پر جو گیت وہ گاتی ہیں یا ہولی اور چیتار جو مرد گاتے ہیں ان کی شعریات دوسری ہوتی ہیں۔ ان میں اردو کا مزاج تقریباً ناپید ہوتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں خالص مگہیت ہوتی ہے۔ اس فرق سے اس امر کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ ایک علاقہ ہونے کے باوجود دو قوموں کے تہذیبی اور فکری سرمائے مختلف ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اظہار کے وسائل میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔ حسن و جمال اور پرواز تخیل اردو کی طرح مگہی میں بھی موجود ہیں اس لیے مگہی اردو بھی ادبی چاشنی رکھتی ہے۔''

(بحوالہ: بہار کی علاقائی زبانوں کا ادب اور اردو، از قائم خورشید، مطبوعہ اردو دنیا صفحہ 13)

میں چاہتا ہوں کہ چند ایسے الفاظ کی بھی نشاندہی کردوں جن کا استعمال بہاری مصنفین نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ اور جو تھوڑے بہت لہجے کے اختلاف کے ساتھ مگہی میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ ایسے ہیں جو پٹنہ، گیا، مونگیر، نالندہ، بھاگلپور، مظفر پور اورنگ آباد، نوادہ جہان آباد وغیرہ کے علاقوں میں سنے جاسکتے ہیں۔

اٹنا یعنی سمانا۔ اگارہ یعنی گیارہ، بابو یعنی چھوٹا بچہ، بہنوئی، بہن کا شوہر، بھگنا، بھگنی یعنی بھانجا۔ بھانجی، بھوجی بھوجائی بھی بھاوج، پتوہ، پتوہیا یعنی بہو، بھنٹا (گول بیگن) بتیانا یعنی بات چیت یا گفتگو کرنا۔ پھلیا، چھوٹی سوزی جو عام طور پر نوزائدہ بچوں کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہے۔ پنیانا یعنی پانی ڈالنا۔ پٹون (کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے پانی ڈالنا) ٹھیہونا (گھٹنا)، چیرا (کیچوا)، چھیمی (مٹر کا پھل) ڈیڑھ سس (بڑی سالی)، ڈھکنا۔ (داخل ہونا یا گھسنا) رام تروئی (بھنڈی) روپنی، روپنا، (بوائی بونا) ساٹنا (چپکانا) کوڑنا (کھودنا) کونہڑا (گول کدو)، کھٹنا کھٹانا (تھکا دینے کی حد تک کام لینا) کھدیڑنا (رگیدنا) کھل جانا (چل دینا، عام طور پر گاڑی یعنی بیل گاڑی، ریل، موٹر وغیرہ کے لیے) کیولا یا کملا (سنترہ یا سنگترہ) گارنا (نچوڑنا) گتنی (دیورانی یا جٹھانی کے لیے) گوئٹھا (اُپلا) گھیلا (گھڑا) مت پالتر (بیل کے لیے) تکنا (چھپنے کے لیے) لنگا (ننگا) نانی، نتنی (نواسہ، نواسی) نتواں (ترئی) نیہر (میکا یا مائکہ) ٹھہاکا (قہقہہ)۔ یہ وہ مصادر و اسم ہیں جو عام طور پر دہلی، لکھنو یا دیگر علاقوں میں بولے، سمجھے یا استعمال نہیں کیے جاتے ہیں۔ یہ بہار سے مخصوص ہیں اور یہ مگدھ کے مختلف علاقوں میں تھوڑے بہت تلفظ یا لہجے کے اختلاف کے ساتھ بولے بھی جاتے ہیں اور لکھے بھی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے الفاظ، محاورات و ضرب الامثال ہیں جو صرف بہاری اردو سے مخصوص ہیں۔ تفصیلی جان کاری کے لیے بہار اردو لغت مرتبہ فصیح الدین بلخی اور احمد یوسف مطبوعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ کا مطالعہ کافی سود مند ہوگا۔

■

Prof. Mohd Mahfoozul Hasan, Shams Manzil, Sir Syed Colony, Nera Karim Ganj, Gaya - 823001 (Bihar)

مشترکہ بنگال میں اردو کا ارتقا
خطبات عبدالحق کی روشنی میں

معین الدین

مولوی عبدالحق کا وطن مالوف ہاپوڑ ہے جو کبھی ضلع میرٹھ میں تھا اور اب خود ایک ضلع ہے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کرنے کے بعد 1892 میں علی گڑھ کالج سے انھوں نے بی اے کیا اور رسالہ 'افسر' جاری کر کے اپنی قومی زبان اردو کی خدمت کا مقدس فریضہ ادا کرنے لگے۔ 1911 میں انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد مقرر ہوئے۔ 1921 سے رسالہ 'اردو' آپ کی ادارت میں بڑی آب وتاب سے نکل رہا تھا اور اردو ادب کو مالا مال کر رہا تھا۔

اس کے بعد مولوی صاحب حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہاں ایک اسکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ مولوی کا لقب اسی زمانے کی یادگار ہے۔ تیرہ سال تک انھوں نے ہوم سکریٹری کے دفتر میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر اورنگ آباد کالج میں صدر مہتمم تعلیمات ہوگئے۔ اس کے بعد اورنگ آباد کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں اردو کے پروفیسر ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور کراچی میں اردو کالج کی بنیاد رکھی اور مرکزی اردو بورڈ قائم کیا۔ کالج کا ذریعہ تعلیم اردو مقرر کیا اور زندگی بھر اردو کی خدمت کرنے کے بعد 1961 میں وفات پائی۔

مولوی عبدالحق اردو کی ترقی کے لیے مختلف کانفرنسوں میں گئے۔ کبھی لاہور، کبھی دہلی، کبھی بہار، علی گڑھ، کراچی، ناگ پور، گوالیار، لائل پور، بمبئی، بلوچستان اور خیر پور وغیرہ۔ اسی طرح 7 مارچ 1943 کو شمالی بنگال کے شہر دیناج پور میں ایک عام جلسے میں اردو کی حمایت وترقی کے لیے خطاب کیا۔

7 مارچ 1943 کو مولوی عبدالحق نے شمالی بنگال کے ضلع دیناج پور میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا جس کا خلاصہ یہ کہ ملک بنگال سے فارسی اور اردو کا تعلق زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اور اس کی تاریخ نہایت دل چسپ اور سبق آموز ہے۔ یعنی تیرہویں صدی سے شروع ہوکر اٹھارھویں صدی تک کا زمانہ ہے۔ اس میں بہت سے انقلاب رونما ہوئے۔ غلام بادشاہوں، پٹھانوں اور مغلوں کے دور دورے رہے۔ درمیانی زمانے میں تقریباً دو صدی دلّی کی مرکزی حکومت سے قطع تعلق کر کے یہاں آزاد خود مختار حکومتیں رہیں۔ باوجود ان تمام تغیرات اور رد و بدل کے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عہد اس ملک کے لیے بڑی خوش حالی اور خیر و برکت کا باعث ہوا۔

اس زمانے میں جب مسلمان یہاں آئے تو بنگالی زبان نہایت حقارت سے دیکھی جاتی تھی اور یہاں کے اہل علم اور پنڈت اسے ایک کنواری اور ناشستہ بولی خیال کر کے ناقابل التفات سمجھتے تھے۔ بارھویں صدی کے کرشنا پنڈت نے اسے 'پیشاچی پراکرت' یعنی بھوتوں کی بولی کا لقب دیا تھا۔ مسلمان فرماں رواؤں اور امرا کی سرپرستی میں یہ زبان بنی اسے وہ عروج حاصل ہوا، جو ہم اس وقت دیکھتے ہیں، بنگالی زبان وادب کے مورّخ ڈاکٹر بینس چندر سین لکھتے ہیں کہ ''بنگالی کو ادبی رتبے تک پہنچانے میں متعدد اثرات نے کام کیا۔ لیکن اس معاملے میں اسلامی فتح کو سب سے زیادہ بلند اور مقدم درجہ حاصل ہے۔ اگر ہندو راجا رہتے تو بنگالی زبان کا بادشاہوں کے دربار تک رسائی پانا مشکل ہوجاتا ہے۔'' یہی ڈاکٹر صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ پٹھان فرماں رواؤں نے ان کتابوں یعنی 'رامائن اور مہابھارت' کے ترجمے کے لیے ایسے علما مقرر کیے جو ان کا ترجمہ ایسی بنگالی میں کریں جو وہ بولتے اور سمجھتے تھے۔ لہٰذا مہابھارت کا پہلا بنگالی ترجمہ نصیر شاہ، شہنشاہ گور کے حکم سے 1325 میں ہوا۔

مسلمان فرماں رواؤں اور امیروں کی سرپرستی اور قدردانی سے یہ ہوا کہ دیگر والیان ملک اور ماتحت راجاؤں نے باوجود متعصب برہمنوں کی مخالفت کے ایسی مثالوں کی تقلید کے بغیر چارہ نہ دیکھا۔ اس طرح قدیم بنگالی علم وادب کو خوب ترقی ہوئی اور مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں اسے بے حد عروج حاصل ہوا۔ اس زبان پروری اور آپس کے میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کے ہزاروں لفظ بنگالی زبان میں گھل مل گئے اور بہت سے سنسکرت الفاظ کی جگہ فارسی نے لے لی۔ مثلاً ٹاکا کی جگہ خزانہ، بھومی کی جگہ زمیں، اور بھوسیا کی جگہ زمین دار وغیرہ۔

جب مغلیہ سلطنت میں انحطاط اور ضعف پیدا ہوا تو مختلف صوبوں نے آزاد ہوکر خود مختاری حاصل کر لی اور ان کے درباروں میں فارسی کے ساتھ اردو کو بھی فروغ حاصل ہوا اور یہ فارسی اردو کے اچھے خاصے مرکز بن گئے۔ چنانچہ بنگال میں مرشد آباد کے دربار نے اردو کے بہت سے ممتاز شعرا کی سرپرستی کی۔ ان میں علی نقی خاں انتظار، سید امام الدین فدا، سید عبدالولی عزلت، شیخ فرحت اللہ فرحت، مرزا ظہور علی خلیق، محمد فقیہ دردمند، مخلص علی خاں مخلص ہردے رام جودت، نقی علی فراق اور مرزا ولی محمد ولی وغیرہ نے اپنے افکار واشعار سے اردو زبان وادب کا ذوق پھیلایا اور شعر وسخن کی بزموں کی رونق بڑھائی۔ انشاء اللہ خاں انشا کے والد جناب ماشاء اللہ خاں وغیرہ نواب مرشد آباد کے ملازم تھے اور انشاء اللہ خاں یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ مرشد آباد کے علاوہ ہگلی۔ بردوان، پنڈوا اور ڈھاکہ وغیرہ مقامات میں اس کا اثر پہنچا اور پھر وہ بھی چھوٹے چھوٹے ادبی مرکز بن گئے۔

بنگال میں جب انگریزی اقتدار بڑھا تو کلکتہ کو بڑی اہمیت

حاصل ہوگئی اور یہ سیاست اور ادب کا صدر مقام بن گیا۔ ہندوستان کے رئیسوں کے نائب اور سفیر یہاں رہنے لگے۔ ان کے ساتھ ان کے درباری، مصاحب اور ملازم بھی آئے جن کی وجہ سے اردو زبان کا خوب چرچا ہوا۔ نہ صرف بنگالی زبان پر بلکہ اہل بنگال کی معاشرت اور تہذیب پر بھی اس کا بہت اثر ہوا اور اس زمانے میں ہندو اور مسلمانوں میں رواداری اور یگانگت کے ایسے تعلقات تھے جن سے آج کل ہم لوگوں کو عبرت اور سبق حاصل کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا اثر زبان و معاشرت ہی پر نہیں بلکہ مذہب پر بھی ہوا۔

ابتدا میں جو صوفی حضرات ہندوستان آئے وہ ہندوستان کی زبانوں سے بے بہرہ تھے۔ چونکہ وہ عوام میں اپنے خیالات اور عقائد کی تلقین کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے وہ زبان سیکھی جس کی آواز عوام وخواص دونوں تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ زبان اس وقت کی اردو تھی، جسے اب ہندوستانی بھی کہنے لگے۔ انھیں کی بدولت ابتدائی اردو کو اشاعت نصیب ہوئی اور ملک کے مختلف علاقوں میں پہنچی۔ پھر بعد میں یہی طریقہ ویشنوں یعنی ہندو مبلغین نے بھی اختیار کیا۔ وہ اپنا عقیدہ سارے ہندوستان میں پھیلانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ایسی زبان کی ضرورت تھی جو ہر جگہ نہیں تو اکثر جگہ سمجھی جائے۔ اس لیے جن لوگوں کو اس نئی زبان اور تعلیم کی اشاعت کی خدمت سپرد ہوتی تو انھیں لامحالہ وہ زبان سیکھنی پڑتی جو بقول ڈاکٹر سین ''اس تمام ہندوستان کی جو دہلی کے مسلمان بادشاہوں کے زیر حکومت تھا، 'لنگوافرینکا' بن گئی تھی۔ ڈاکٹر سین نے اس زبان کا نام ہندی لکھا ہے، لیکن وہ ہندی نہ تھی جسے ہم آج کل ہندی کہتے ہیں۔ بلکہ یہ اردو یا ہندوستانی تھی، جسے فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے ہندی کہتے تھے۔ یہ ویشنوی بہت سے ہندوستانی لفظ تحفے کے طور پر لائے اور اپنی مادری زبان کی نذر کیے۔ ویسے ویشنوی کے پرستاروں کی اکثر کتابیں برج بولی میں ہیں جو اردو کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی۔

زبان کے معاملے میں مدرسہ عالیہ کلکتہ نے بھی کام کیا گو کہ وہاں عربی فارسی اور دینیات کی تعلیم ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے، لیکن ذریعہ تعلیم ہمیشہ اردو رہی ہے۔ وہاں اس ادارے میں جو کلکتہ پڑھنے آتے تھے ان کی وساطت سے اردو کا رواج بنگال کے مختلف اضلاع میں ہوا۔ پھر ایک دوسرا ادارہ جس نے فی الحقیقت اردو زبان اور ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی وہ کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج تھا۔ اس کالج میں اردو کے اچھے اچھے ادیب اور اہل زبان ملازم رکھے گئے ان لوگوں نے اردو نثر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور فصیح اور سلیس اردو اور بول چال کی زبان لکھنے کا ڈول ڈالا۔ اس وقت کی لکھی ہوئی کتابیں اب بھی مطالعے کے قابل ہیں اور بعض تو ایسی ہیں کہ اردو زبان کے دلدادہ انھیں ہمیشہ شوق سے پڑھیں گے۔ جب یہ قابل قدر خدمت انجام پا رہی تھی تو ممکن نہیں کہ یہ صوبہ اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔

اس کے علاوہ واعظ، مبلغ، صوفی اور علمائے دین جو بنگال کے مختلف حصوں میں آتے رہتے تھے ان کی وجہ سے اردو دور دور تک دیہات میں پہنچ گئی اور اس طرح گاؤں والے بھی اس کے سننے کے عادی ہو گئے اور ان میں اس کے سمجھنے اور بولنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

بنگال سے جو طالب علم وہاں پڑھنے آتے تھے وہ تھوڑے ہی دنوں میں اچھی اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے لگتے تھے اور پھر یو پی اور بہار کے عربی مدارس میں تعلیم کے لیے بنگال سے صدہا طالب علم جاتے ہیں اور اردو کے ذریعے سے تحصیل علم

برسوں پہلے یعنی 7 مارچ 1943 کو شمالی بنگال کے شہر دیناج پور کے جلسہ عام میں سامعین کو مخاطب کر کے مولوی عبدالحق صاحب نے کہا کہ زبان کے معاملے میں انجمن ترقی اردو کا مسلک اور مقصد صاف اور واضح ہے۔ انجمن کسی زبان کی حریف اور مخالف نہیں، لیکن میرے اصرار کی بڑی قوی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں جہاں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں، وہاں یہی ایک ایسی زبان ہے جو سارے ملک کی مشترکہ اور عام زبان ہونے کا حق رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی دو قوموں اور دو تہذیبوں سے مل کر بنی اور ہندو و مسلمانوں کی مشترکہ کوشش سے بڑھی اور اس بلند رتبے کو پہنچی ہے۔ خطاب میں یہ بھی کہا کہ صرف کانفرنس کر لینا اور تجویزیں منظور کرا لینا آسان ہے، کام کرنا مشکل ہے۔

کرتے ہیں اور جب اپنے وطن واپس آتے ہیں تو درس و تدریس اور وعظ و پند میں اردو ہی استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح تاجر اور مزدور پیشہ بھی ایک طرح اس کام میں مدد دے رہے ہیں۔

ملک فرانس کے ایک دانشور گارساں دتاسی 1862 میں لکھتے ہیں کہ ''جس وقت سر۔ جے۔ پی گرانٹ سابق لفٹیننٹ گورنر یورپ واپس جا رہے تھے تو کلکتہ کے باشندوں نے 16 اپریل کو ایک جلسہ منعقد کیا جس میں موصوف کی ہر دلعزیزی اور خلوص کا اظہار کیا۔ جلسے کی صدارت راجا رادھا کانت دیو بہادر نے کی۔ موصوف بڑے فاضل آدمی اور ایک ضخیم سنسکرت لغت کے مصنف ہیں، اس موقعے پر انھوں نے جو تقریر کی وہ اردو میں تھی۔ ان کی تقریر کے بعد راجا کالی کرشن بہادر کھڑے ہوئے، یہ بھی اپنے زمانے کی مشہور شخصیت ہیں اور حسب موقع اردو میں تقریر کی۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو زبان اور اسلامی تہذیب کا اہل بنگال پر کس حد تک اثر تھا۔ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ دونوں یکساں طور پر اس کے زیر اثر تھے۔ ویسے بھی بنگال کے مسلمانوں کے لیے اردو کا سیکھنا مشکل نہیں۔ اس لیے کہ بنگلہ میں ہزارہا فارسی، عربی اور اردو کے لفظ پہلے سے موجود ہیں۔ دوسری آسانی ان کو یہ ہے کہ وہ اردو رسم خط سے بھی کسی قدر آشنا ہیں کیونکہ ہر مسلمان بچے کو ابتدا میں کلام مجید پڑھایا جاتا ہے۔ لہٰذا تھوڑی سی کوشش کے بعد آسانی سے اردو پڑھنا لکھنا بخوبی سیکھ جاتے ہیں۔

لہٰذا برسوں پہلے یعنی 7 مارچ 1943 کو شمالی بنگال کے شہر دیناج پور کے جلسہ عام میں سامعین کو مخاطب کر کے مولوی عبدالحق صاحب نے کہا کہ زبان کے معاملے میں انجمن ترقی اردو کا مسلک اور مقصد صاف اور واضح ہے۔ انجمن کسی زبان کی حریف اور مخالف نہیں، لیکن میرے اصرار کی بڑی قوی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں جہاں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں، وہاں یہی ایک ایسی زبان ہے جو سارے ملک کی مشترکہ اور عام زبان ہونے کا حق رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی دو قوموں اور دو تہذیبوں سے مل کر بنی اور ہندو و مسلمانوں کی مشترکہ کوشش سے بڑھی اور اس بلند رتبے کو پہنچی ہے۔ خطاب میں یہ بھی کہا کہ صرف کانفرنس کر لینا اور تجویزیں منظور کرا لینا آسان ہے، کام کرنا مشکل ہے۔ بہرطور خواب دیکھنے اور انتظار کرنے کا وقت گیا اور اب کام کا وقت ہے۔

الغرض بابائے اردو مولوی عبدالحق کے تمام خطبات کا لب لباب یہ ہے کہ قومی زبان زندگی اور تہذیب کا ایک لازمی جزو ہے۔ عبدالحق نے زبان کی تاریخ اور اس کی قومی و ثقافتی اہمیت پر بار بار زور دیا ہے۔ ان کا ہر خطبہ کسی اعلیٰ عدالت میں کسی لائق وکیل کا تیار کیا ہوا جواب دعویٰ معلوم ہوتا ہے۔ خطبات عبدالحق قومی اور ثقافتی مد و جزر کی داستان بھی ہیں اور خود ان کی شخصیت، سیرت اور اردو کے لیے طویل جد و جہد کی تاریخ بھی۔ خلاصہ یہ کہ خطبات عبدالحق جو پروفیسر عبادت بریلوی نے مرتب کی ہے، ادبی نقطۂ نظر سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے اور ان کا خطباتی ادب میں وہی مقام ہے جو فن خطوط نگاری میں غالب کے خطوط کا۔ ان کے خطبات میں تقریر اور تحریر دونوں کا لطف پایا جاتا ہے۔

■

Moyeenuddin, Naya Babu Para, Sayyed Pur, Nilfa Mari, (Bangladesh)

احمد خان

تخلیق اور تخلیقیت: تعریف و تفہیم

تخلیق کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی دنیا کی تاریخ۔ فطرت اور بنی نوع انسان، دونوں کا وجود تخلیق کی بنا پر قائم ہے۔ فطرت کا اپنا ایک تخلیقی نظام ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پیڑ پودے، گھاس پھوس، پھل پھول، بہار، خزاں، بادو باراں، ژالہ باری، بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، چرند پرند، حیوانات، پہاڑ، جھیل، جھرنے وغیرہ فطرت کے اہم تخلیقی مظاہر ہیں۔ انسانی تخلیق میں زراعت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ زراعتی عمل سے انسان کی نظریں سورج، دریا اور موسم جیسے عناصر کی طرف مبذول ہوئیں۔ اس طرح زراعت کی بدولت انھیں تخلیقِ کائنات کے رمز کو سمجھنے میں مدد ملی۔ قبل از تاریخ انسان جنگلوں میں اور دریاؤں کے کنارے آباد تھا۔ جہاں پھل پھول اور پانی آسانی سے دستیاب تھے۔ ایک زمانہ آیا جب غذا کے لیے جانوروں کا شکار کیا جانے لگا۔ ابتداً وہ جانوروں کا گوشت کچا ہی کھاتے تھے۔ جب انھیں آگ کا علم ہوا تو زندگی جینے کا ایک نیا سلیقہ آیا۔ انسان کو شکار کرنے اور خونخوار جانوروں سے حفاظت کے لیے اسلحوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ابتداً لکڑیوں کے ہتھیار بنائے گئے۔ عہدِ پتھر میں داخل ہوئے تو پتھر کے مضبوط ہتھیاروں کا استعمال ہوا۔ لوہے کا علم ہوا تو تخلیقی سفر میں مزید شدت آئی۔ لوہے سے کاشتکاری کو فروغ ملا اور جنگلوں کی صفائی اور تحفظ کے لیے اسلحہ بنایا گیا۔ تخلیق بذاتِ خود ایک ایسا عمل ہے جو ہر دور میں بوقلمونی سے گزرتی رہی ہے۔ کسی بھی شے کا وجود اپنے عروج کو پہنچتا ہے اور پھر اپنے انجام کو۔ عہدِ قدیم سے ہی پودوں اور جانوروں کی کئی نسلیں پیدا ہوئیں اور ناپید ہو گئیں، کئی قومیں اور تہذیبیں پروان چڑھیں اور فنا ہو گئیں۔ یہ سلسلہ نظامِ فطرت اور انسان کے تخلیقی عمل کا بھی غماز ہے۔ آج انسان کا پتھر سے ایٹم بم تک کا سفر، اس کے تخلیقی کارناموں کی زندہ مثالیں ہیں۔ امریکی مفکر پروفیسر ایلسورتھ ہنٹنگٹن (Ellsworth Huntington)، شعبۂ جغرافیہ، ییل یونیورسٹی (پیدائش 16 ستمبر، 1876، وفات 17 اکتوبر، 1947)، نے ماحولیاتی تبدیلی اور تاریخِ تمدن پر متعدد نایاب کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں 'چینج آف کلائیمیٹ اینڈ ہسٹری' (1913)، 'سولائزیشن اینڈ کلائیمیٹ' (1915) اور 'مین اسپرنگس آف سولائزیشن' (1945) انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے مطابق ہر دور میں قومیں، تہذیبیں، نباتات اور حیوانات کو اپنے عروج کے بعد زوال کا سامنا رہا ہے:

"قدیم زمانے میں پودوں اور جانوروں کے یکے بعد دیگرے کئی ادوار آئے جن میں وہ پیدا ہوئے، پھلے پھولے اور پھر حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ قبل از تاریخ کے دور میں انسان نما حیوانوں کے کئی نمونے سامنے آئے۔ تاریخی دور میں بھی قومیں اور تہذیبیں پیدا ہو کر پروان چڑھیں اور فنا ہو گئیں۔ سائنس، آرٹ اور ادب کئی بار بلندیوں پر پہنچے اور پھر زوال اور انجماد کی نذر ہو گئے۔"

(Ellsworth Huntington, mainsprings of Civilazation,(1945), p. 459)

ترسیل کی کہانی بھی انتہائی عجیب و غریب ہے۔ ایک زمانہ تھا جب انسان احساسات و جذبات اور افکار و خیالات کو سلیقے سے ادا نہیں کر پاتا تھا۔ اس کے پاس مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ وہ مانندِ حیوان اپنی بات کہنے کے لیے چیختا چنگھاڑتا تھا۔ اشاروں اور کنایوں سے اپنی بات کو سمجھایا کرتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے گلے میں لفظ ادا کرنے کی قوت نہیں تھی۔ وہ آوازیں نکال سکتا تھا، غراہٹ اور چیخ سے مدد لے سکتا تھا لیکن وہ لفظ کی تشکیل نہیں کر سکتا تھا۔

بقول بی کے کنتھیالا: (B. K. Kunthiala)

"The earliest of human beings, used noises and body movements. These constituted mutually understood signals and signs developed by smallgroups living togather. The noises include growls, grunts and shrieks. But they could not speak . This was because of their under developed larynx or voice-box. They could make sounds, but they could not construct or utter words."

(Human Communication, P-15)

(مفہوم: قدیم بنی نوع انسان، ترسیل کے لیے چیخ چنگھاڑ اور جسمانی حرکات کا استعمال کرتے تھے۔ اس طرح کے اشارے اور علامتیں باہمی سمجھ کے تحت چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ساتھ رہنے والے افراد کے ذریعے قائم کی گئی تھیں۔ ان آوازوں میں غراہٹ، جھلاہٹ اور چنگھاڑ کی ملی جلی کیفیات شامل ہوتی تھیں۔ لیکن وہ ہم کلام نہیں ہو سکتے تھے۔ ایسا اس لیے تھا کیونکہ ان میں صوتی نظم کا فقدان تھا۔ وہ بے ترتیب آوازیں پیدا کر سکتے تھے لیکن ان میں آوازوں کو الفاظ میں منقلب کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔)

کرومیگنن انسان (Cro-Magnon man)، ہماری طرح زبان اور وائس باکس (Voice-box) کے حامل تھے۔ ہزاروں سال قبل کرومیگنن میں تمدن کی تشکیل کی صلاحیت تھی۔ انھوں نے کاشتکاری کو فروغ دیا۔ وہ غذا

کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے ندیوں کے کنارے آباد ہوئے۔ انھوں نے جانوروں کو پالنے اور غذا پیدا کرنے کی ابتداء کی۔ انھوں نے زبان کو مضبوطی سے فروغ دیا۔ بقول بی کے کتھیالا:

"Cro-Magnon man was that it had a skull structure, tongue and voice-box (Larynx) just like ours today. and with these they could speak. speach and language seems to have originated about 35,000 to 40,000 years ago"

(Human Communication, P-16)

(مفہوم: انسانی نسل 'کرو۔میگنن' کے ہڈیوں کا ڈھانچہ، زبان اور صوتی نظام آج کے انسان کی طرح ہی تھا۔ علاوہ ازیں وہ بات چیت کر سکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تکلم اور زبان کی ابتدا تقریباً 35,000 سے 40,000 سال قبل ہوئی تھی۔)

انسان جب لسانی اظہار کا حامل ہوا تو آواز میں صفائی آئی۔ اس کے علاوہ اس نے آواز کو دور تک پہنچانے کے لیے ڈھول تاشے کی تخلیق کی۔ لیکن اس کی رسائی کا ایک دائرہ تھا، جس سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ لہٰذا وسیع ترسیل کے لیے آگ کا استعمال کیا گیا۔ یعنی مصیبت کے وقت آگ لگائی جاتی، جس سے اٹھنے والے دھواں کو دیکھتے ہی لوگ مدد کو پہنچ جاتے۔ انسان جب اشارے، کنایے اور چیخ چنگھاڑ کے دور سے باہر آیا تو دلچسپی لے کر اپنے روزمرہ کے واقعات بیان کرنے لگا۔ ایسے واقعات، قصے کہانیوں کی شکل اختیار کرتے گئے۔ اس طرح قصہ گوئی، تفریح کا ایک اہم ذریعہ بن گئی۔ اسی طریقے سے ایک زمانے تک شکار کھیلنا، تفریح کا ایک دلچسپ ذریعہ تھا۔ علاوہ ازیں جنگ و جدال اور متعدد جانوروں کی تصویروں کو پتھروں پر کندہ کرنا بھی ایک تفریحی فعل تھا۔ پتھروں کو کاٹ کاٹ کر نہ صرف چھوٹی چھوٹی مورتیاں بنائی گئیں بلکہ پہاڑوں کو بھی تراش کر بلند ترین مجسموں بلکہ صنم کدوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ عہدِ قدیم کے تخلیقی شاہکار آج بھی اجنتا ایلورا کی شکل میں موجود ہیں۔ اس طرح نقاشی، سنگ تراشی، پچی کاری اور مجسمہ سازی کا تخلیقی آغاز ہوا اور یہ سلسلہ انسان کی تخلیقی مہارت کے ساتھ ساتھ اپنی عظمت کو پہنچتا گیا۔

جنگلات بنیادی طور پر عجائبات کا زندہ نمونہ ہیں جہاں چرند پرند اور بے شمار جانوروں کی ملی جلی آوازوں سے ایک خاص غنائیت پیدا ہوتی ہے۔ سرور سے بھری آوازوں نے انسان کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ جانوروں کی آوازوں کی نقل کرنا، انسان کی خوش فعلیوں میں شامل ہو گیا۔ انسان نے موسیقی کے رمز کو نظامِ فطرت کے ذریعے ہی سمجھا۔ اس طرح موسیقی کا آغاز ہوا۔ انسان جب تھکا ماندہ گھر واپس آتا تو اسے ذہنی اور جسمانی تلذذ کی ضرورت محسوس ہوتی جس کی تکمیل کا ایک اہم ذریعہ جسمانی ہم آہنگی تھی۔ رفتہ رفتہ قصے کہانیاں، گیت موسیقی اور سیر وشکار کے علاوہ دیگر تفریحی ذرائع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جسم اور روح کی داخلی مسرت کے نئے نئے طریقۂ اظہار تراشے گئے۔ جسم میں جب حرکت پیدا ہوتی تو رقص کی صورت اختیار کر لیتی۔ جانوروں کی اچھل کود اور سرمستیوں سے بھی انسان کو جسمانی حرکت و مشق سے تلذذ حاصل کرنے کا علم ہوا۔ اس طرح انسان

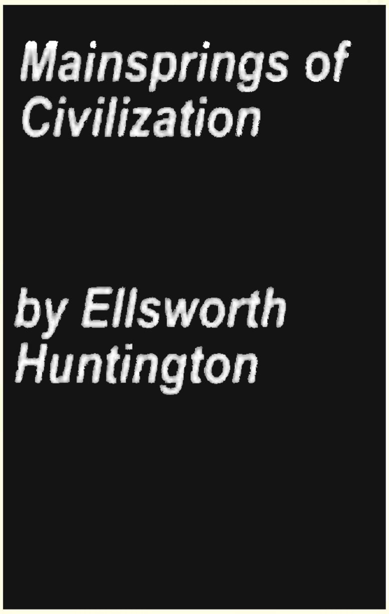

نے جب اپنے جسم کی حرکتوں کو فنی شکل عطا کی تو رقص کا با ضابطہ آغاز ہوا۔ بقول وزیر آغا:

''فنونِ لطیفہ میں رقص سب سے قدیم فن ہے، لہٰذا بنیادی آہنگ سے نسبتاً زیادہ متاثر ہے۔ ابتدائی جنگلی تہذیب، بجائے خود جسم کی ایسی پکار تھی جو ایک خاص لمحے میں برانگیخت ہو کر سارے قبیلے کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھی.... مجموعی اعتبار سے یہ رقص، قبیلے کی جسمانی حرکت پر منتج ہوتا، چاہے اس حرکت کا مدعا، غنیم سے مقابلہ کرنا ہوتا یا جنسی روابط میں مبتلا ہونا۔''

(تخلیقی عمل، انٹرنیشنل اردو پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2005، ص 128)

جب چیخ چنگھاڑ کی آوازوں نے معنی ومفہوم کا تہذیب یافتہ جامہ زیب تن کیا تو سر اور آہنگ کو راہ ملی۔ آواز کی کرختگی میں میٹھا رس گھلنے لگا۔ آواز کی اس تبدیلی سے موسیقی میں غنائیت کو جلا ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے تفریحی ذرائع میں رقص وموسیقی نے ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ اس طرح موسیقی، جذبات کے اظہار کا ایک اہم ذریعہ بن گئی۔ بقول وزیر آغا۔

''انسانی جسم 'آہنگ' سے آشنا ہو تو رقص جنم لیتا ہے۔ مگر جب آہنگ کے دائرے میں سمٹ آئے تو موسیقی وجود میں آتی ہے۔ موسیقی اس فنی اظہار کا دوسرا نام ہے جس میں آواز، اپنے بوجھل، ناتراشیدہ عناصر سے نجات پا کر لطیف اور سبک سار ہو جاتی ہے۔'' (تخلیقی عمل، ص137)

انسان، فطرت کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے ہمیشہ سے کوشاں رہا ہے۔ سورج کا طلوع ہونا اور ذرے ذرے کو روشن کر دینا، ان کے لیے حیرت، استعجاب اور تحفظ کا باعث تھا۔ دن کی روشنی میں ان کا خوف غائب ہو جاتا اور رات کی تاریکی، خونخوار جانوروں کے خوف اور عدمِ تحفظ کا پیغام لاتی۔ اس طرح ان میں بھوت پریت اور دیو کا وجود خلق ہو گیا۔ یہیں سے اسطور سازی کا عمل توانا ہوا۔ شب وروز اس متضاد احساس کے سبب دن کو اچھائی اور نیکی کی علامت سمجھا گیا تو رات کو برائی اور گناہوں کا محور قرار دیا گیا۔ اب قصے کہانیوں کے کردار جانور اور انسان ہی نہیں رہے بلکہ ان میں اسطوری کردار بھی شامل ہو گئے۔ بقول وزیر آغا:

''اسطور آفرینی ایک خالص تخلیقی عمل ہے جو منطقی سوچ کے عمل سے قطعاً مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسطور آفرینی وہ پہلا تخلیقی عمل ہے جو اپنی قوت اور پرواز میں آرٹ اور شاعری کے تخلیقی عمل کا ہم پلہ قرار پا سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ شاعری اور آرٹ کی طرح اسطور آفرینی بھی انسان کی اس تخلیقی جست کا نتیجہ تھی جو اس نے جبلی سطح سے آرکی ٹائپل (Archetypal) سطح کی طرف لگائی اور جس نے اسے حیوان کی تنگ اور حسیات کے تابع فضا سے باہر نکال کر تخیل کی اس فضا میں لا کھڑا کیا جو انسانی آزادی کی طرف ایک نہایت اہم قدم تھا۔''

(تخلیقی عمل، انٹرنیشنل اردو پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2005، ص 42)

بنیادی طور پر اسطور سازی میں دیوتاؤں کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔ ابتداً ہر دیوتا کہیں نہ کہیں نظامِ فطرت سے متعلق تھا۔ انھیں آگ، سمندر، زراعت، ہوا، رحم، قہر، روشنی اور اندھیرے سے منسوب کیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب انسان فطرت کی قوتوں کے رحم وکرم پر انحصار کرتا تھا۔ لہٰذا وہ جہاں خود کو بے بس محسوس کرتا وہاں ایک نیا دیوتا خلق کر لیتا۔ جب اساطیر میں تنتر منتر یعنی جادو ٹونے کو جگہ ملی تو انسان میں ایک طرح کی خود اعتمادی آئی۔ جس کی بدولت اس نے خود کو بعض اوقات دیوتاؤں کے ہم پلہ لا کھڑا کر دیا۔ بقول وزیر آغا:

''جادو پر قدیم انسان کا اعتقاد کسی منفرد سوچ یا منطق کا نتیجہ نہیں تھا، لیکن یہ غیر شعوری سطح پر انسان کے یہاں خود

اعتمادی کی ایک ابتدائی صورت ضرور تھی۔ یہی خود اعتمادی، اسطور آفرینی کے عمل میں شامل ہوئی تو انسان نے ایسا انسانی ہیرو خلق کر لیا جو دیوتاؤں کے کارنامے انجام دینے پر قادر تھا۔" (تخلیقی عمل، ص 83)

جب انسان عدم تشخص کے حصار سے باہر آیا تو وہ قبیلے، خطے اور علاقے کی پہچان اختیار کرنے لگا۔ عدم طبقات کی جگہ قبیلائی شناخت بننے لگی۔ قبیلے کی پہچان اس کے سردار، مکھیا اور اس کے دیوتا سے ہونے لگی۔ مکھیا کا فرمان ہر کسی کے لیے حرفِ آخر ہوتا۔ کھیتی کے ساتھ جانوروں کو بڑی تعداد میں پالا جانے لگا۔ دراصل جانوروں کے باعث ہی قبیلوں میں رابطہ، تجارت اور جنگ وجدل کا سلسلہ شروع ہوا۔ جانور مذہبی رسوم کے بھی اہم جز تھے۔ انسان اب ایک ایسے دور میں داخل ہو گیا تھا جب اسے رابطے کے لیے تحریری زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ابتداً قبیلائی نشان مختص ہوئے۔ ایسے نشانات اور علامتوں کو خلق کیا گیا، جن سے تحریری رابطے میں مدد ملی۔ یہی وہ علامات ہیں جو آگے چل کر رسم الخط کی صورت اختیار کر گئیں۔ اس طرح انسان، محدود اور قدرے مبہم نشانات سے ترقی کرتے ہوئے تہذیب وتمدن کا خالق بن گیا۔ فرد سے معاشرے کی تخلیق ہوئی جس میں زندگی اور معاشرتی قدریں متصادم ہوتے ہوئے بھی مسلسل رواں ہیں۔ بقول وزیر آغا:

"فرد اور معاشرے کا تصادم درخت کی نئی اور پرانی چھال کا تصادم ہے۔ اسی سے زندگی تازہ دم ہوتی ہے اور پرانی کیچلی اتار کر ایک نیا لباس پہن لیتی ہے۔ دراصل زندگی کا مقصد تسلسل ہے اور یہ تسلسل زیر و بم کے اسی آہنگ کے تابع ہے جو ساری کائنات میں جاری وساری ہے۔" (تخلیقی عمل، ص 37)

آج انسانی تخلیق کا سفر بے زبان جذبے، گمنام زندگی اور محدود وسائل سے ترقی کرتے ہوئے ایک ایسے دور میں داخل ہو گیا ہے جہاں انسان نے سمندر، جنگلات، دریا، پہاڑ اور آسمان کو تہہ پا کر دیا ہے۔ وہ روز افزوں نئی نئی ایجادات اور نئے نئے وسائل پیدا کرنے میں سرگرمِ عمل ہے۔ تخلیق کا یہ سفر آج بھی انسان کو ہر لمحہ نئے نئے انکشافات سے روشناس کر رہا ہے۔

تخلیقیت (Creativity)

انگریزی لفظ "Creativity"، لاطینی لفظ Creo سے ماخوذ ہے، جس کے معنی پیدا کرنے کے ہے۔ چودھویں صدی کی انگریزی کہانیوں میں لفظ "Creat" کا استعمال ہونے لگا تھا۔ اگرچہ اس کے جدید معنی انسان کے ذریعے کی گئی تخلیق کا ایک عمل ہے۔ تخلیقیت عام طور پر کسی فرد کے ذریعے کسی نئی تخلیق کو کہتے ہیں جس کی عوام الناس میں کوئی قدرو قیمت ہو۔ قدرو قیمت سے مراد یہ ہے کہ تخلیق انسانی مقاصد کے لیے مفید اور معنویت رکھتی ہو۔ تخلیقیت عام طور پر انسان کی ذہانت اور خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ تخلیقیت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے کسی شے میں نیا پن پیدا ہوتا ہے اور اس کی ایک گراں قدر اہمیت ہوتی ہے۔ تخلیق میں نیا پن، ایک بنیادی جز ہے جس کا موازنہ اس تخلیق سے کیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی شکل میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں نئی بات یا نئی چیز کا تعلق فرد واحد اور سماج دونوں سے ہوتا ہے۔ کسی نئی

جب انسان عدم تشخص کے حصار سے باہر آیا تو وہ قبیلے، خطے اور علاقے کی پہچان اختیار کرنے لگا۔ عدم طبقات کی جگہ قبیلائی شناخت بننے لگی۔ قبیلے کی پہچان اس کے سردار، مکھیا اور اس کے دیوتا سے ہونے لگی۔ مکھیا کا فرمان ہر کسی کے لیے حرفِ آخر ہوتا۔ کھیتی کے ساتھ جانوروں کو بڑی تعداد میں پالا جانے لگا۔ دراصل جانوروں کے باعث ہی قبیلوں میں رابطہ، تجارت اور جنگ و جدل کا سلسلہ شروع ہوا۔ جانور مذہبی رسوم کے بھی اہم جز تھے۔ انسان اب ایک ایسے دور میں داخل ہو گیا تھا جب اسے رابطے کے لیے تحریری زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ابتداً قبیلائی نشان مختص ہوئے۔

چیز کی قدرو قیمت بھی متعدد معنی ومفہوم رکھتی ہے۔ بقول مائیکل ممفورڈ (Michael Mumford):

"We seem to have reached a general agreement that creativity involves the production of novel, useful products."

(مفہوم: ہمیں اس بات پر عام اتفاق ہے کہ تخلیقیت، نئی اور مفید اشیا کی تخلیق میں معاون ہوتی ہے۔)

(Mumford , 2003, "Taking stock in creativity research", P-110)

تخلیقیت کا دائرہ انتہائی وسیع ہے۔ تخلیقیت کا تعلق، فہم و ادراک، ذہنی قوت، سائنسی رموز، اور ٹکنالوجی کے موجدانہ استعمال وغیرہ سے ہے۔ عام طور پر تخلیقیت کی شناخت، اس کی اپنی اشیا سے ہوتی ہے۔ صنعت وحرفت، موسیقی، تحریر، آرٹ یا کسی بھی معمہ کو سمجھنے اور سائنسی ایجادات میں تخلیقیت کو بنیادی ضرورت تصور کیا جاتا ہے۔ متعدد سائنسی ایجادات، اکثر اچانک اور کرشمائی حرکات و سکنات کے نتائج کے طور پر سامنے آئی ہیں جبکہ تخلیقی عمل سے گزرنے والی تخلیقی مثالیں کم ہی دستیاب ہیں۔ ادبی تخلیق میں تخلیقیت کی زیادہ تر تعریفوں میں دو عناصر یعنی نئے پن (Novelty) اور قدرو قیمت (Valuable) کو خصوصی توجہ حاصل ہے۔ اس ضمن میں ناولٹی کی وضاحت نئے پن، تازگی اور دلچسپ کے معنی ومفہوم میں کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں غیر معمولی، غیر متوقع، حیرت انگیزی اور عجیب وغریب واقعہ کو بھی اس معنی میں شامل کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر تخلیقی فن پارے یا تخلیق میں نئے پن کا ہونا لازمی ہے۔ علاوہ ازیں قدرو قیمت (Valuable) کو تخلیقی فن پارے کی معنویت، مناسبت، موزونیت، اہمیت، افادیت اور تاثیر کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ امریکی ماہر نفسیات رابرٹ جے اسٹرنبرگ (Robert J. Sternberg) (پیدائش 8 دسمبر، 1949) متعدد امریکی یونیورسٹیوں سے وابستہ رہے۔ انھوں نے ییل یونیورسٹی سے بی اے اور اسٹینڈفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے لوبارٹ (Lubart) کے ساتھ تخلیقیت کے موضوع پر اپنے مضمون بعنوان "The Concept of Creativity: Prospects and Paradigms". میں نئے پن اور اصل کو خصوصی اہمیت دی ہے:

"Creativity is the ability to produce work that is both novel and original unexpected and appropriate (i.e. usefull adoptive concerning task constraints)"

(مفہوم: تخلیقیت میں کسی فن پارے کو فنی تقاضے کے مطابق جدت پسندی، غیر متوقع پن اور موزونیت کے ساتھ پیش کرنے کی لامتناہی صلاحیت ہوتی ہے۔)

("Hand book of creativity" , edited by Robert J.Sternberg (1999), P-90)

گروبر اور والیک (Gruber and Wallace) نے بھی تخلیق میں نئے پن اور قدرو قیمت کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ بقول گروبر اور والیک:

"Like most Definations of creativity, ours involves novelty and value: The creative product must be new and must be given value according to some external criteria"

(مفہوم: تخلیقیت کی بیشتر تعریفوں کی طرح ہمارے نزدیک بھی نئے پن اور قدرو قیمت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بشرطیکہ تخلیق کو جدت اور ظاہری معیار کے مطابق گراں قدر ہونی چاہیے۔)

("Hand book of creativity" , edited by Robert

J.Sternberg (1999), P-94)

حقیقت یہ ہے کہ تخلیق میں مواد اور مضامین کا ماٰخذ اکثر جانا پہچانا ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر، پرانے سے نئے اور معمولی سے غیر معمولی بنانے کا نام تخلیقیت ہے۔ اس طرح انسانی تخلیق میں نئے پن اور غیر متوقع صورتِ حال کی خصوصی اہمیت ہوتی ہے۔ غیر پیشین گوئی (Unpridictable) بھی تخلیق کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ غیر پیشین گوئی کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ تخلیق کا ایسا فارم جس کا استعمال تخلیق کار کے ماحول میں نہ ہو۔ نئے پن (Novelty) کی ایک شکل قلبِ ماہیت (Transformation) میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی اپنی ایک حد ہے۔ مختصر یہ کہ اصل یا حقیقت (Originality) تخلیقی فن پارے کی حتمی خصوصیت نہیں ہے اور تخلیقیت میں نئے پن کی بنیاد اکثر اس نکتے پر ہے کہ ماضی میں کیا تخلیق ہوا ہے اور موجودہ تخلیق اس سے کیوں کر اور کس قدر مختلف ہے۔ بقول مارٹنڈیل: (Martindale)

"A creative idea i.e. one that is both original and appropriate for the situation in which it occurs."

(مفہوم: 'تخلیقی خیال' جس ماحول میں بھی پیدا ہوتا ہے، اس میں انفرادیت اور موزونیت ہوتی ہے۔)

(Martindale, Biological bases of creativity, New York, 1999:P-137)

نئے پن کا تصور اخذ کردہ موضوع اور اس کے مقدم کے مابین امتیاز پر منحصر کرتا ہے۔ اس طرح 'نیا' ایک تبدیلی کا عمل ہے۔ پرانا نیا ہوسکتا ہے اگر اسے کچھ الگ طریقے سے پیش کیا جائے۔ لہٰذا نئے کے تصور کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ نئے کی صورت، اس کی اقسام، اس کی سطح، غیر معمولی، ممتاز اور منفرد ہونی چاہیے۔ تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ اس کی قدر و قیمت ہو اور وہ مفید اور کارآمد بھی ہو۔ فن پارے کی اصلیت یا حقیقت صرف اس میں نہیں کہ اس کا تعلق اولین تخلیقی عمل سے ہے۔ بلکہ اسے معاشرے میں قبولیت حاصل ہونی چاہیے اور اس میں عوام کے افکار و نظریات، احساسات اور طرزِ زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کی اہلیت ہونی چاہیے۔ لہٰذا فن پارے کا افادی ہونا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ افادیت (Usefulness) کو مختلف طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا مذہب، فلسفہ، آرٹ اور مذہبی رسوم کے دیگر فارم کی قدر و قیمت کو Utilitarianists نے انکار کرتے ہوئے مادی ضرورت کے حقائق کو اہمیت دی۔ قبل از صنعتی معاشرے میں جدت پسندی اور تخلیقیت کو نہ صرف بے کار اور غیر افادی تصور کیا جاتا تھا بلکہ اسے انتہائی خطرناک اور مضر سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ روایتی نظام کو مسخ کردے گی۔ تخلیق میں افادیت کی تفہیم و ادراک وقت کے ساتھ ساتھ قابل تبدیل بھی ہے۔ مثلاً کسی فنکار کی قدر و قیمت اور افادیت کبھی کبھی اس کے عہد میں اسے نہیں ملتی۔ اسے بعد کی نسل میں مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں سائنس، ریاضی اور دیگر تکنیکی شعبہ جات کا استعمال یا افادیت ایک عام آدمی کے لیے قطعی نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتابوں کا استعمال ان کے لیے کیا ہے؟ جو اسے پڑھ نہیں سکتے۔ اس لیے کسی بھی فن پارے کی اہمیت اور افادیت کا

تہذیبی و معاشرتی مذاق میں تبدیلی کے مطابق تخلیقیت میں عہد بہ عہد تبدیلی آتی رہی ہے۔ ایک عمومی خیال ہے کہ مذہب اور پر اسراریت پر مبنی اس کی معنویت بتدریج کم ہوتی گئی۔ تخلیقیت کے ذرائع ماورائی و مافوق الفطری قوت سے فردِ واحد اور معاشرتی کاوش میں تبدیل ہو گئے۔ مشاہداتی اشیا اور ظاہری ایجادات معرض وجود میں آتی گئیں۔ تخلیق میں نئے پن، افادیت، داخلی اور ظاہری تعین کا تصور تخلیقیت کی موجودہ تفہیم کے بنیادی اجزا ہیں۔ جن کا تعلق مغربی نظریات میں ذاتی تشخص اور تاریخی اور معاشرتی شعور سے گہرا ہے۔ اگرچہ تخلیقیت کے مذکورہ نظریات کو عالمی سطح پر قبولیت حاصل ہے لیکن مغربی تہذیب میں ہی تخلیقیت کے متعدد معنی و مفہوم بیان کیے گئے ہیں

تعین اس کے قاری سے ہوتا ہے۔ معاشرے اور فردِ واحد کے مابین تفریق اس کی ضرورت، مفاد اور دلچسپی سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی فن پارے کی اہمیت اور افادیت کو قائم کرنے کے لیے کوئی واحد اصول نہیں ہے۔ لیکن کسی شاہکار تخلیق کی قدر و قیمت، اس کے تخلیقی مذاق اور اس کی عظمت پر منحصر کرتی ہے اور اس میں انسانی زندگی کو تبدیل کرنے یا متاثر کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہوتی ہے۔ تخلیقی فن پارے کی افادیت کے متعلق Feist کی رائے کچھ یوں ہے:

"creative product is not meant in merely a pragmatic sense, for behavior or thought can be judge as useful on purely intellectual or asthetic critaria."

(مفہوم: تخلیق، صرف عملی نقطۂ نظر کی تفہیم نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ذریعے تخلیقی رویے اور فکر و خیال کو خالص دانشورانہ یا جمالیاتی معیار پر متعین کیا جاسکتا ہے۔)

(Feist- 1998, Personality and social psychological review :P-158)

تخلیقیت کی زیادہ تر تعریفیں ثقافت اور تاریخ کے محدود اور نام نہاد عالمی نظریات پر مبنی ہیں۔ دراصل یہ عالمی نظریات نہ تو عالمگیر ہیں اور نہ ہی دائمی و راسخ۔ تخلیقیت کی تاریخ، مغربی زبانوں میں تخلیقیت کا موجودہ تصور نسبتاً زیادہ جدید ہے۔ مثلاً قدیم یونان میں تخلیقیت کا زیادہ تر استعمال حرفت کے معنی میں ہوتا تھا۔ جس میں کاریگری، فنکاری، ہنر مندی اور اہلیت و صلاحیت شامل ہوتی تھیں۔ تخلیقیت، جدید کاری اور بازتعمیریت میں بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ روایت اور کلچر کی تخلیق اور ان کے فروغ میں تخلیقی اذہان کا اہم رول رہا ہے۔ تہذیبی و معاشرتی مذاق میں تبدیلی کے مطابق تخلیقیت میں عہد بہ عہد تبدیلی آتی رہی ہے۔ ایک عمومی خیال ہے کہ مذہب اور پر اسراریت پر مبنی اس کی معنویت بتدریج کم ہوتی گئی۔ تخلیقیت کے ذرائع ماورائی و مافوق الفطری قوت سے فردِ واحد اور معاشرتی کاوش میں تبدیل ہو گئے۔ مشاہداتی اشیا اور ظاہری ایجادات معرضِ وجود میں آتی گئیں۔ تخلیق میں نئے پن، افادیت، داخلی اور ظاہری تعین کا تصور تخلیقیت کی موجودہ تفہیم کے بنیادی اجزا ہیں۔ جن کا تعلق مغربی نظریات میں ذاتی تشخص اور تاریخی اور معاشرتی شعور سے گہرا ہے۔ اگرچہ تخلیقیت کے مذکورہ نظریات کو عالمی سطح پر قبولیت حاصل ہے لیکن مغربی تہذیب میں ہی تخلیقیت کے متعدد معنی و مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ Lubart نے تخلیقیت کی مغربی تفہیم کا موازنہ تخلیقیت کے مشرقی نظریات سے کیا ہے جس کی بنیاد اشیا اور اصل (Originality) پر مبنی مظاہر پر ہے۔ اس کے مطابق مغربی تخلیقی تصور کی کوئی موزونیت و مطابقت نہیں ہے جس کی بنیاد تین اصولوں پر قائم ہے۔ اول، دیومالا اور روایت کی باز تعمیر اور وجودیت۔ دوم، زمانے کی cyclical گھماؤ دار وقت نہ کہ آگے کی جانب رواں وقت۔ سوم تخلیق (creation) سے انکار اور unbegun world کا تصور۔ لوبارٹ کے مطابق مشرقی تخلیقی تصور کی ایجاداتی پیداوار پر توجہ کم رہی ہے:

"The estern concept of creativity seems less focused on innovative products. Instead, creativity involves a state of personal fulfilment, a connection to a primordial realm, or the expression of an inner essence of ultimate reality."

(مفہوم: تخلیقیت کے مشرقی تصورات میں نو دریافت پر توجہ کم رہی ہے۔ اس کے بجائے تخلیقیت، ذاتی تسکین،

روایتی حقائق سے وابستگی اور حتمی حقیقت کی داخلی روح کا اظہار ہے۔)

(Lubart 1999: "The concept of creativity: Prospects and Paradigms", P-340)

لوبارٹ کے مطابق تخلیق کا مشرقی نظریہ جذباتی، ذاتی اور بین ذاتی عناصر پر زور دیتا ہے۔ مشرق میں تخلیقیت کا مقصد ایسی تخلیق کے بمقابل، جس میں نیا پن ہو اور اس کی کوئی افادیت ہو، سے کہیں زیادہ کسی ذات یا کسی مقصد یا کسی واقعہ یا صورت کی حقیقی تصویر پیش کرنا ہے۔ دراصل مغربی اور مشرقی نظریات مخصوص کلچر کے ضمنی موضوعات سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلی تجزیہ، قومی کلچر یا معاشرتی ضمنی کلچر میں تخلیقی تعمیر میں اختلافات کو اجاگر کرے گا۔ تخلیقیت کو مغربی تہذیب میں نشاۃ ثانیہ تک عام طور پر خدائی یا غیبی تحریک تصور کیا جاتا تھا۔ گریک کلچر میں مثلاً Muse کو خدا کی جانب سے بحیثیت ثالث خالق تصور کیا گیا۔ Judaeo-Chrastion روایت کے تحت تخلیقیت، خدا کی اجارہ داری ہے۔ انسان کے اندر ایسی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ کچھ نیا تخلیق کر سکے، سوائے خدا کے کاموں کے اظہار کے۔ مغرب میں تخلیقیت بحیثیت خدائی عمل کا نظریہ نشاۃ ثانیہ اور اس کے بعد تک قائم رہا۔ اگرچہ اٹھارھویں صدی اور عہدِ بیداری (age of enlightenment) تک تخلیقیت (بالخصوص نظریۂ فن) کا رشتہ افکارِ تخیل سے عام ہو گیا۔ Thomas Hobbes کی تحریروں میں قوتِ متخیلہ، انسانی ادراک کے ایک اہم عنصر کے طور پر نمایاں ہوئی۔ William Duff نے پہلی بار قوتِ متخیلہ کو غیر معمولی ذہانت (Genius) کے طور پر پہچانا، اس نے اہلیت اور ذہانت کے فرق کو بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ رومن مائیتھالوجی میں ہر فرد میں ایک اندرونی یا روحانی قوت پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ جو اس کی قسمت اور کردار پر تسلط رکھتی ہے۔ غیر معمولی ذہانت ہر فرد، خاندان اور معاشرے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جس فرد کے اندر غیر معمولی دانشورانہ قوت ہوتی ہے اسے جینئس کہتے ہیں۔ عہد جدید میں جینئس کی تفہیم ایک ایسی باطنی اہلیت سے ہے جو دانشورانہ صلاحیت وفضیلت اور نادر تخلیقیت کا اظہار کر سکے یا ایک ایسا غیر معمولی فردِ واحد جو اصل، برتر اور جدید اشیا کی ایجاد کر سکے، وہ جینئس ہے۔ اگرچہ جینئس کا تصور قدرتی طاقت، غیر معمولی ادراک اور اعلیٰ شعور کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن جینئس اکثر تخلیقی صلاحیت و اہلیت سے برتر اور مخالف رہا ہے۔ جینئس ایک عام صلاحیت سے مختلف ہے۔ ذہن کے اندر کچھ ایسی خداداد قوت ہوتی ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتی ہے۔ بقول رونکو اور البرٹ (Albert اور Runco):

"Original genius was truly exceptional and by definition was to be exempt from the rules, customs and obligation that applied to the talented."

(مفہوم: اصل جینئس، حقیقتاً دوسروں سے منفرد ہوتے ہیں۔ وہ روایتی تعریفات، اصول وضوابط اور فرضِ منصبی سے بھی مبرا ہوتے ہیں۔ جو کہ عام فنکار کے لیے ضروری لوازمات تصور کیے جاتے ہیں۔)

(Albert and Runco, "A history of research on creativity"-1999, P-5)

جینئس کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ معاصر و مابعد نسل پر اس کے شدید اور دائمی اثرات مرتب ہوں۔ ایک جینئس کی پہچان اس کی دیرپا سیاسی، سماجی وثقافتی خدمات میں بھی ہے جس کی بدولت اسے مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ بقول سائمنٹن (Simonton):

لوبارٹ کے مطابق تخلیق کا مشرقی نظریہ جذباتی، ذاتی اور بین ذاتی عناصر پر زور دیتا ہے۔ مشرق میں تخلیقیت کا مقصد ایسی تخلیق کے بمقابل، جس میں نیا پن ہو اور اس کی کوئی افادیت ہو، سے کہیں زیادہ کسی ذات یا کسی مقصد یا کسی واقعہ یا صورت کی حقیقی تصویر پیش کرنا ہے۔ دراصل مغربی اور مشرقی نظریات مخصوص کلچر کے ضمنی موضوعات سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلی تجزیہ، قومی کلچر یا معاشرتی ضمنی کلچر میں تخلیقی تعمیر میں اختلافات کواجاگر کرے گا۔ تخلیقیت کو مغربی تہذیب میں نشاۃ ثانیہ تک عام طور پر خدائی یا غیبی تحریک تصور کیا جاتا تھا۔ گریک کلچر میں مثلاً Muse کو خدا کی جانب سے بحیثیت ثالث خالق تصور کیا گیا۔

"For the most part to be identified as a genius an indivisual must become famous, and the fame must be attained for making durable contributions to cultural or political endeavors."

(مفہوم: جینئس کی شناخت یہ ہے کہ وہ انتہائی معروف ہو اور اس کی خدمات تہذیبی و سیاسی سرگرمیوں میں روایت ساز کی حیثیت رکھتی ہوں۔)

("Creative Productivity: A predective and explanatory model of career trajectories and landmarks", Psychological Review 104, -1997:P-66)

دراصل جینئس ایک منفرد شخصیت کا نام ہے۔ جس میں غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے، جو ایسا کارنامہ انجام دیتا ہے جسے لوگ رہتی دنیا تک یاد رکھتے ہیں۔ تخلیقیت کو مغرب میں براہِ راست آزادانہ مضمون کے طور پر انیسویں صدی سے قبل توجہ نہیں ملی تھی۔ لیکن Runco اور Albert کی کاوشوں کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں اسے ایک آزادانہ مضمون کے طور پر شناخت حاصل ہوئی۔ اکثر مفکرین آرٹ اور ادب کے شعبے سے تخلیقیت کو وابستہ کرتے ہیں۔ ان شعبوں میں تخلیقیت کے لیے اصل یا حقیقی کو تشفی بخش صورتِ حال تصور کرتے ہیں۔ جبکہ دیگر شعبوں میں اصل اور تقلید دونوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔

تخلیق کے اقتصادی نظریات میں بنیادی طور پر تخلیقیت کے تین پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی جاتی رہی ہے۔ اول اقتصادی فروغ پر تخلیقیت کے اثرات، یعنی ایسی تخلیق جس سے ملک کی اقتصادیات کو فروغ ملے اور بین اقوامی اقتصادی مقابلے کے لیے ملک کو تیار کیا جا سکے۔ دوم تخلیقیت کے لیے بازار پر مبنی ماڈل کی تکنیک۔ یعنی ایسی تکنیک کو فروغ دیا جائے جو عالمی معیار کے مساوی ہو اور جس سے بازار کی تجارتی و ترقیاتی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ سوم اقتصادی تخلیقیت کی توسیع۔ یعنی ایک ایسا تخلیقی نظم ونسق قائم کرنا، جس سے اقتصادی تخلیقیت کو استحکام، فروغ اور وسعت حاصل ہو سکے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں Joseph Schumpeter نے تخلیقی تخریب (creative destruction) کا اقتصادی نظریہ پیش کیا جس کے مطابق نئی ایجادات نے پرانے طور طریقوں کو تباہ کر دیا اور اس کی جگہ لے لی۔ ماہر اقتصادیات Paul Romer کے مطابق تخلیقیت، نئی تکنالوجی و مصنوعات و اقتصادی فروغ میں معاون ہوتی ہے۔ تخلیقیت، سرمایہ کو بڑھاتی ہے اور تخلیقی اشیا Intellectual property laws سے تحفظ پاتے ہیں۔ ڈینیل پنک (Danial Pink) نے اپنی کتاب "A whole new media" (2005) میں لکھا ہے کہ ہم ایک نئی صدی میں داخل ہو رہے ہیں جہاں تخلیقیت کی اہمیت بدرجہ اتم بڑھتی رہے گی۔ اس عملی و مادی عہد میں ہمیں دلیل اور تجزیاتی فکر کے مقابلے جذبات کی نمائندگی کرنے والی صحیح سمت کی سوچ کو پروان چڑھانا چاہیے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ Nickerson نے متعدد تخلیقی تکنیک یا طریقہ کار کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ مثلاً اغراض و مقاصد کو قائم کرنا، بنیادی مہارت پیدا کرنا، خصوصی علم کے حصول کی حوصلہ افزائی کرنا، تجسس اور غور وخوض کو بڑھاوا دینا، رغبت پیدا کرنا، (بالخصوص باطنی رغبت)، خود اعتمادی اور خطرہ مول

لینے کی خواہش کی حوصلہ افزائی کرنا،مہارت اور خود حریفی کومرکزیت دینا، تخلیقیت سے متعلق معاون تصورات کوفروغ دینا، انتخاب اور دریافت کے لیے سہولت فراہم کرنا، ذاتی نظم ونسق کو فروغ دینا، تخلیقی عمل کے لیے آموزشی تکنیک اور حکمتِ عملی کی سہولت فراہم کرنااور اعتدال کی فراہمی وغیرہ۔جنھیں فنونِ لطیفہ اور صنعتی شعبے نے فروغ دیا ہے۔

تخلیق کا اظہاراس کے اردگرد کے ماحول، معاشرہ اور تہذیب وثقافت پر ہوتا ہے۔کسی بھی تخلیق پرعصری ماحول و رجحان کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ بقول اسٹرن برگ (Sternberg):

"A creative environment is defined as the physical, social and cultural environment in which creative activity occurs."

(مفہوم:تخلیقی سرگرمی کوانجام دینے میں تخلیقی ماحول کاخصوصی درجہ ہے۔تخلیقی ماحول کی تشریح یہ ہے کہ خطہ، سماج ا ورثقافت کی ایسی فضا، جس میں تخلیقیت کوجلا ملتی ہو۔)

("Hand book of creativity" , edited by Robert J.Sternberg (1999), P-108)

کچھ محققین کا خیال یہ ہے کہ ماحول میں صورتِ حال کی تبدیلی سے تخلیقی عمل میں تبدیلی آتی ہے۔یعنی تبدیلیِ آب وہوا سے تخلیقیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بقول Cziksentmihalyi:

"It easier to enhance creativity by changing condition in the environment them by trying to make people think more creatively."

(مفہوم:ماحولیاتی تبدیلی کے ذریعے تخلیقی ذہن میں وسعت اور تخلیقی تفکر میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔)

("Creativity:Flow and the psychologicy of discovery and invention", Harper Collins, 1996:p-185)

Arieti (1976) نے تخلیقی ماحول کے پیشِ نظر ایک اصطلاح creativogenic سے معاشرے کو متعارف کرایا، جس کے مطابق ایک ایسا سماج جس میں تخلیقیت کو پروان چڑھنے میں مدد ملتی ہو۔ Simonton (1999) نے تخلیقیت کے فروغ میں معاون معاشرتی ماحول کی چار صفات: اول،سرگرمی کا میدان۔ دوم، دانشورانہ قدرو منزلت ۔سوم، نسلی تکثیریت۔ چہارم، سیاسی آزادی کوخصوصی اہمیت دی ہے۔

تخلیق کار کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ تخلیقیت کے لیے شعوری طور پر ایک موافق ماحول کی تشکیل کرے۔ اس عمل میں تخلیق کار کی غیر معمولی ذہانت کی شناخت ہوتی ہے۔ جس سے وہ دنیا کو اس کی خواہش اور ضرورت کے مطابق تشفی اور حظ دیتا ہے۔ درج ذیل اشعار میں تخلیقیت پرعصری ماحول کے اثرات کوبخوبی دیکھا جاسکتا ہے:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج وتخت کا
دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھی
(میر)

مختلف شعبہ جات جیسے علم نفسیات، تعلیم، تجارت، تاریخ، سائنس، سماجیات، سیاسیات اور دیگرعلوم و فنون کے مابین تخلیقی تحقیق اور تخلیقی تقاضے میں ایک تفریق اور علیحدگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً تجارت پرمبنی تخلیقی تحقیق میں جدت کے لیے جس چیز کو ترجیح دی جاتی ہے، وہ ہے تنظیمی عناصر کی تخلیقیت۔ یعنی تنظیمی مفاد کے لیے کی جانے والی تخلیق۔ جبکہ نفسیاتی تحقیق میں تخلیقی اصطلاح کا استعمال فردِ واحد کی ذات پرمنحصر ہوتا ہے۔ اس طرح تخلیقی تحقیق، انتہائی متفرق اور علیحدہ تشخص کی حامل ہے۔ اس ضمن میں کچھ اہم اور موثر کوششوں سے موجودہ طرز فکر، طریقۂ کار، تصورات اور اصطلاحات کو منظم کیاگیاہے

ماہرِ سماجیات و اقتصادیات رچرڈ فلوریڈا(پیدائش 26نومبر، 1957) کوامریکن اربن اسٹڈیز تھیوریسٹ' کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہے۔انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔انھوں نے Rotman University of ، School of Management Toronto میں بحیثیت پروفیسر خدمات انجام دیں۔فلوریڈا کی مقبولیت 'تخلیقی طبقے کا تصوراورشہری بازتشکیل پر اس کے اثرات' کو پیش کرنے میں ہے۔انھوں نے اپنی کتاب "The rise of creative class" (2002) میں شہر کاری اور نقل مکانی جیسے مسائل کی موثر نشاندہی کی ہے اور اقتصادی ترقی کے لیے تکنالوجی، اہلیت اور قوتِ برداشت اور تخلیقی ماہرین کوضروری قرار دیا ہے۔انھوں نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سماجی وسعت، ثقافتی اور جغرافیائی ماحول کوتخلیقیت کا باعث قرار دیا ہے۔

تخلیقیت کے تصور میں زمانہ قدیم سے ہی تبدیلی آتی رہی ہے۔انیسویں صدی میں تخلیقیت، سائنسی افادیت کا ایک ذریعہ تھی۔مغرب میں 1950 کے بعد تخلیقی تحقیق،علم کا ایک الگ شعبے کے طور پر وجود میں آئی۔تخلیقیت پر تحقیقی ادب، ایک اہم، اعلامرتبت اور مختلف العناصر کامرکب ہے۔

تخلیقیت کا مطالعہ بہت سارے نامکمل فکری نقطۂ نظر، ذاتی مفروضات، طریقۂ کار، میلانات اور طبیعاتی فکری نظریے کے تحت ہوتا رہا ہے۔لہٰذا یکساں مصطلحات کی کمی، مکمل نظریے کی ناپیدگی کے باعث صورتِ حال میں خرابی یا پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔اگر فکر میں یکسانیت ہوتی تو تخلیقی تحقیق کے متعدد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد ملتی۔لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ تخلیقیت کا کوئی یکساں تصور ہوتا ہی نہیں ہے۔

بقول Ochse :

"Creativity means different things to different people- even to different psychologists."

(مفہوم: تخلیقیت، مختلف افراد اور یہاں تک کہ مختلف ماہرین نفسیات کے لیے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔)

(Cited in"Creativity, inteligence and psychoticism" by Rushton, J.P., 1990, P-35)

مختلف شعبہ جات جیسے علم نفسیات، تعلیم، تجارت، تاریخ، سائنس، سماجیات، سیاسیات اور دیگر علوم وفنون کے مابین تخلیقی تحقیق اور تخلیقی تقاضے میں ایک تفریق اور علیحدگی پائی جاتی ہے۔مثلاً تجارت پرمبنی تخلیقی تحقیق میں جدت کے لیے جس چیز کو ترجیح دی جاتی ہے، وہ ہے تنظیمی عناصر کی تخلیقیت۔ یعنی تنظیمی مفاد کے لیے کی جانے والی تخلیق۔ جبکہ نفسیاتی تحقیق میں تخلیقی اصطلاح کا استعمال فردِ واحد کی ذات پرمنحصر ہوتا ہے۔اس طرح تخلیقی تحقیق، انتہائی متفرق اور علیحدہ تشخص کی حامل ہے۔ اس ضمن میں کچھ اہم اور موثر کوششوں سے موجودہ طرزِ فکر، طریقۂ کار، تصورات اور اصطلاحات کو منظم کیا گیا ہے۔دراصل تخلیقیت ایک فن ہے جس کی بنا پر فنکار اپنی عظمت کو پہنچتا ہے، تخلیقی معراج کو حاصل کرتا ہے۔فن، ایک ایسا سرمایہ ہے جس میں مہارت کی کثرت، انفرادیت اور لافانیت ہوتی ہے۔تخلیق میں تخیل، ادراک، علم، عرفان اور مادرانہ تحمل کی بڑی ضرورت واہمیت ہے، مشق وریاضت اس پہ مستزاد ہیں۔ اس کے بعد ہی کسی عظیم شاہکار کی تخلیق ہوتی ہے۔

■

Dr. Ahmad Khan, Assistant Professor, Dept. of Urdu, Zakir Husain Delhi College, New Delhi
Email: ahmadk71@yahoo.co.in
Ph. 9868701491/9540911224

جمشید احمد

اردو ادب میں تہذیبی اشتراک اور رواداری

خواجہ غلام السیدین نے اپنی کتاب 'روحِ تہذیب' میں تہذیب کے تین مفاہیم پیش کیے ہیں جن میں پہلا مفہوم مذہب اور اخلاق کی تعلیم سے متعلق ہے جس میں اخلاقی قدروں کو تقدم حاصل ہے۔ تہذیب کا دوسرا نظریہ انسانی زندگی کے اجتماعی اور تمدنی پہلو سے متعلق ہے جس میں انسانی عادات واطوار کو فضیلت دی گئی ہے اور تیسرا مفہوم زندگی کے عملی شعبوں سے تعلق رکھتا ہے جس میں انسانی ذہن کے تینوں حلقوں یعنی ادراکی، جذباتی اور نفسی حرکی، کو ملحوظ رکھتے ہوئے فنونِ لطیفہ کے اعلیٰ مذاق کو مہذب ہونے کا پیمانہ قرار دیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب نے تہذیب کے ان تینوں مفاہیم میں 'اعتدال' کو قدرِ مشترک قرار دیتے ہوئے شدت ومبالغے اور مصنوعیت کو ناقص عوامل تصور کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے تہذیب اور تہذیب یافتہ افراد کا ہر طرح سے محاکمہ کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"... ہر انسان اس مشترک انسانیت کے رشتے کا احترام کرے جو اسے دوسروں سے ملاتا ہے اور کسی خارجی یا نمائشی فرق کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ تر نہ سمجھے۔ نہ ہی اسے کسی شخص کو اس بنا پر حقیر سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ اس کے کام کی نوعیت بہت معمولی ہے۔"[1]

ہم اپنے روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والے الفاظ میں بھی تہذیب وتمدن کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص نامناسب لفظیات کا استعمال کرتا ہے تو ہم اسے غیر مہذب کہتے ہیں اس کے برعکس اگر کوئی شخص زبان کا سلیقہ مندانہ استعمال کرتا ہے تو ہم اسے مہذب کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مہذب شخص کی گفتگو کچھ اس طرح کی ہونی چاہیے۔

(الف): میں عرض کروں کہ آپ نے جو کچھ بھی فرمایا وہ بے حد مناسب ہے۔

(ب): میں، آپ کے دولت خانے پر اس غرض سے حاضر ہوا کہ آپ کسی روز میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔

ان مثالوں میں 'متکلم' کے لیے عرض کرنا اور مخاطب کے لیے فرمانا، اپنے گھر کے لیے غریب خانہ اور دیگر افراد کے گھر کے لیے دولت خانہ، خود کے لیے حاضر ہونا اور کسی دوسرے کی آمد کے لیے تشریف لانا جیسے اسما وافعال کا استعمال کرنا ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ اسی طرح مخاطب کا اقرار وانکار کا اظہار بھی 'ہاں' یا 'نہیں' کے بجائے 'جی ہاں' یا 'جی نہیں' سے ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہماری گفت وشنید کا تعلق بھی کہیں نہ کہیں تہذیب وتمدن سے منسلک ہے۔

ہم اپنی زبان کی اہمیت وافادیت پر عموماً غور وخوض نہیں کرتے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا واسطہ زبان سے نہ ہو۔ اس سلسلے میں احتشام حسین نے زبان کے تعملات کی اہمیت و افادیت کا بہت منطقی انداز میں احاطہ کیا ہے:

"تعلیم کا سارا نظام، سیاست کے سارے ہتھکنڈے، مذہب کی ساری اشاعت، تہذیب کی ساری بقا زبان پر ہی منحصر ہے۔ اس سے تہذیب کے نقش ونگار محفوظ رہتے ہیں اور وسیع تر بھی ہوتے ہیں۔ جب ایک قوم دوسری قوم پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسے محکوم بنا لیتی ہے۔ جب ایک ملک کا سیاسی وقار دوسرے ملک کو متاثر کرتا ہے۔ جب زوال کے عہد میں ایک گروہ کا اقتدار دوسرا گروہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے اس وقت تہذیبی قدروں کا احساس ہی قومی زندگی کا محافظ بنتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے نمایاں کام زبان کرتی ہے کیونکہ وہی روایات کے تسلسل کو برقرار رکھتی ہے اور تہذیبی اقدار کی مظہر بن جاتی ہے۔"[2]

زبان سے تہذیب وتمدن کے انسلاک کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہم، زبانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کی مدت کم وبیش چھ ہزار سال تک جاتی ہے اور جب انسانی تہذیب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کی تاریخ بھی زبان کی تاریخ سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ لہٰذا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ زبان نہ صرف تہذیب کا تحفظ کرتی ہے بلکہ اس کی ترویج واشاعت میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اس عمومی نظریے کے بعد اگر زبان کا تخصیصی محاکمہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبانیں، عام کے ساتھ ساتھ اپنی مخصوص شناخت بھی رکھتی ہیں۔ مثلاً سنسکرت اور عربی کے مذہبی و منطقی، انگریزی کے علمی و سیاسی، فارسی و اردو کے شعری و تہذیبی شناخت نامے ان کی بنیادی تخصیصیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابتدا سے ہی اردو زبان کی ایک بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو دوسری زبانوں سے جوڑا ہے یعنی ان کے ساتھ دوستانہ اور بامروت تعلقات رکھتے ہوئے ان کے ذخیرۂ الفاظ، ان کی شعری وادبی روایات اور ان کے تہذیبی روابط کو اپنے اندر جذب کیا یعنی ابتدا سے ہی اردو کے مزاج میں رواداری کو اخذ اور یکجہتی کو قبول کرنے کی بے پناہ قوت رہی ہے۔ جب اردو نے اپنے آپ کو دوسری زبانوں کے وافر الفاظ ومحاورات سے مالا مال کرلیا تو اس نے اس رواداری کے رجحان کو باقی رکھتے ہوئے ایسا طرز بیان اختیار کیا جس کی مثال کسی دوسری زبان میں ملنا مشکل ہے۔ اس ضمن میں شمیم حنفی کا محاکمہ ہماری رہنمائی کرتا ہے:

"اردو کی تاریخ ایک ایسے اجتماعی تجربے کی تاریخ سے عبارت رہی ہے جس میں ایک ساتھ کئی روایتوں کی آہٹ محسوس کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیبی روایت، گیارہویں اور بارہویں صدی میں مسلمانوں کے ساتھ مکالمے کے نتیجے میں دو تہذیبوں کی آمیزش سے نمودار ہونے والی عہد وسطیٰ کی روایت، مغربی دنیا سے روشناسی کے بعد اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے عہد عقلیت اور عہد روشن خیالی کی روایت جسے جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے طور پر دیکھا گیا، اردو کے دامن

میں ان سب کے لیے گنجائش رہی ہے۔''[3]

اردو کے لسانی تناظر کے محاکمے کے بعد مرزا خلیل احمد بیگ نے بھی تقریباً اسی نوع کا نتیجہ اخذ کیا ہے:

''زبان کی لسانیاتی سطح سے قطع نظر اس کی ایک سطح وہ ہوتی ہے جو اس کی ادبی سطح کہلاتی ہے۔ ادبی سطح پر بھی زبان کی جڑیں تہذیب وتمدن سے بہت گہری پیوست ہوتی ہیں۔ سماج کی ہر دھڑکن اور تہذیب کی ہر کروٹ زبان کے وسیلے سے ادب میں منعکس ہوتی ہے۔ گویا زبان وادب سماج اور تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اردو کی جڑیں چونکہ ہندوستانی تہذیب میں بہت گہری پیوست ہیں لہٰذا اس کے ادب میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔''[4]

اردو زبان کے ساتھ ساتھ ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس کے شعرا وادبا نے ابتدا سے ہی بغض وتعصب سے گریز کی روش اپنائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دینی سختی اور نام نہاد مذہبی ریاکاری سے پرہیز کرتے رہے اور واعظ وزاہد کا مذاق اڑاتے رہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ان شعرا کو نہ تو مذہب سے بیر تھا اور نہ ہی علمائے دین سے، بلکہ وہ شاکی تھے تو ان کے داخل وخارج کے مابین پائے جانے والے تضادات سے۔ یعنی انھیں گلہ تھا تو ناصح کی مصنوعی نصیحت، واعظ کے بے تکے وعظ اور شیخ و برہمن کے طبقاتی امتیازات سے۔ اس ضمن میں بطور مثال چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے (غالب)

حضرت واعظ نے جو چاہا کہا
پر نہ بولے کچھ خدا کے ڈر سے ہم (داغ)

شیخ جی بھی وہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں
اب تو ہم مصلحتاً ان کا ادب کرتے ہیں (اکبرالہ آبادی)

جناب شیخ سے کہہ دو، اگر سمجھانے آئے ہیں
کہ ہم دیروحرم ہوتے ہوئے میخانے آئے ہیں (ریاض خیرآبادی)

اس طرح کے اشعار اردو شاعری میں کثرت سے دیکھے جاسکتے ہیں جن میں شعرا نے ریاکاری، تعصب، کٹرپن اور دو عملی وغیرہ کو موضوع بنایا ہے اور شیخ و برہمن کا مذاق اڑاتے ہوئے ظاہر داری کو ہر لحاظ سے رد کیا ہے۔

ہر دور میں اردو شعرا نے رواداری، دردمندی، یکجہتی اور کشادہ دلی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ بلاشبہ یہ وہ بنیادی صفات ہیں جن کے بغیر کسی شخص کے مہذب ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی وہی شخص مہذب ہوسکتا ہے، جس کے اندر رواداری، ہمدردی، قومی اور انسانی یکجہتی کا جذبہ موجود ہو اور رواداری کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی روش پر تو مضبوطی سے قائم رہے مگر دوسروں کو بھی اس کے اپنے مسلک پر چلنے کا پورا حق عطا کرے۔ غالب نے اس بات کو کس خوبصورتی سے سمجھا اور سمجھایا ہے:

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
(غالب)

یعنی اگر ایک برہمن اپنے مسلک کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے بت خانے میں مرجائے تو وہ اس قابل ہے کہ اسے کعبے میں دفن کیا جائے گویا اس کی وفاداری قابل قدر ہے۔ رواداری، ہمدردی، قومی یا انسانی یکجہتی کے متعلق بھی چند شعر ملاحظہ کریں:

ہر دور میں اردو شعرا نے رواداری، دردمندی، یکجہتی اور کشادہ دلی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ بلاشبہ یہ وہ بنیادی صفات ہیں جن کے بغیر کسی شخص کے مہذب ہونے کا تصو ر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی وہی شخص مہذب ہوسکتا ہے، جس کے اندر رواداری، ہمدردی، قومی اور انسانی یکجہتی کا جذبہ موجود ہو اور رواداری کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی روش پر تو مضبوطی سے قائم رہے مگر دوسروں کو بھی اس کے اپنے مسلک پر چلنے کا پورا حق عطا کرے۔ غالب نے اس بات کو کس خوبصورتی سے سمجھا اور سمجھایا ہے:

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے (جگر)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا (میر)

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا (چکبست)

دل کی کدورتیں اگر انساں سے دور ہوں
سارے نفاق گبر و مسلماں سے دور ہوں (آتش)

یہ کس مذہب میں اور مشرب میں ہے ہندو مسلمانو
خدا کو چھوڑ دل میں الفت دیر و حرم رکھنا (حاتم)

چھوڑا میں کفر و دیں، ہے فقط یار سے غرض
تسبیح سے نہ کام، نہ زنار سے غرض (سودا)

گوش کو ہوش سے ٹک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک (میر)

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انساں ہووے (آتش)

اس قبیل کے اور بھی بہت سے اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں شعرا نے رواداری، ہمدردی اور قومی یا انسانی یکجہتی کی حمایت کی ہے اور تنگ نظری، تعصب اور مذہب کے ظواہر یا رسوم ہی کو اصل مذہب سمجھ لینے کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے شاعروں نے مذہب کے ان لوازمات اور ظواہر کی ہمیشہ مذمت کی ہے جو دلوں میں بُعد پیدا کرتے ہیں اور انسان کو انسان سے جدا کرتے ہیں۔ غزل کے شعرا سنتوں اور بھگتوں کی طرح حقیقت مطلق کی اس وحدت پر بار بار زور دیتے ہیں جو تمام مذاہب کی روح ہے۔''[5]

مذہبی، قومی اور انسانی رواداری کی ایک عمدہ مثال یہ بھی ہے کہ اردو کے ہندو اور مسلم شعرا و مصنّفین نے ایک دوسرے کے مذاہب کا بھرپور احترام کرتے ہوئے ایک دوسرے کی مذہبی کتابوں پر بھی نظمیں لکھیں یا ان کے خیالات کو اپنے ادب میں پیش کیا۔ نظیر اکبرآبادی نے ہولی، دیوالی اور کرشن جی پر نظمیں لکھیں اور اقبال نے رام اور گرونانک پر تو اسی طرح غیر مسلم شعرا نے بھی حمد، نعت اور منقبت وغیرہ نظم کیں۔

اس کے علاوہ اردو کی تقریباً تمام اصناف میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کے دلکش نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول 'آگ کا دریا' میں ڈھائی ہزار سالہ ہندوستانی تہذیب کو نہایت ہی کامیاب طریقے سے پیش کیا ہے۔ میر انیس کے مرثیے بھی ہندوستانی رنگ وآہنگ لیے ہوتے ہیں یعنی ان کے مرثیوں کے کردار، ماحول اور فضا وغیرہ میں ہندوستانی تہذیب منعکس ہوتی ہے۔ اسی طرح اردو گیتوں میں بھی ہندوستانی تہذیب کے مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ اردو مثنویوں میں تو یہ مرقعے اور بھی تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔

اردو شعرا نے اپنے کلام میں ہندوستانی تلمیحات، محاورے، تشبیہات اور استعارات وغیرہ کو بھی کثرت سے استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے اردو ادب ہندوستانی تہذیب وتمدن سے اور بھی قریب ہوگیا ہے۔

اردو کے شعری ادب کے ساتھ ساتھ اس کا افسانوی ادب بھی اپنی تہذیبی وابستگی کی بنیاد پر دیگر زبانوں کے ادب سے قدرے ممتاز ومنفرد نظر آتا ہے کیونکہ اس میں تہذیبی اشتراک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی تہذیبی اشتراک، مشترکہ تہذیب، کے نام سے منسوب ہے جو ہندوستان کو اردو کا عنایت کردہ لاثانی تحفہ ہے۔ اس ضمن میں دنیا بھر کی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن کا سلسلہ پریم چند سے ہوتا ہوا

راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، قاضی عبدالستار، خالدہ حسین، زاہدہ حنا، نیر مسعود، سید محمد اشرف اور طارق چھتاری تک پہنچتا ہے۔ لیکن سر دست دو تخلیقات کی شدید یاد آرہی ہے۔ اوّل تو قرۃ العین حیدر کا ناولٹ 'سیتا ہرن' اور دوم اشفاق احمد کا افسانہ 'گڈریا'۔

قرۃ العین حیدر نے سیتا ہرن میں سیتا میر چندانی کے سفر حیات کو ذریعہ بنا کر تہذیبی روابط کے تقریباً تمام رنگوں کو بہت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ دراصل سیتا ہرن طبقۂ اشرافیہ، متوسط طبقہ اور نو تعلیم یافتہ طبقے کے تہذیبی شناخت ناموں، ان کے افکار اور ان کے اعمال کا پنچ تنتر ہے جو وقت کی جبیں پر صدیوں تک ثبت رہے گا۔ مثال کے طور پر تین مختصر اقتباسات درج کیے جا رہے ہیں جن سے ہمارے عہد کے افراد کا تہذیبی سروکار واضح ہوگا۔ یہ اقتباسات جمیل کے دو خطوط ہیں جو اس نے اپنی بہن بلقیس کو امریکہ سے لکھ بھیجے تھے اور ایک بیانیہ پر مشتمل ہیں:

''...میں نے پچھلے اتوار کو ایک اسپینش لڑکی سے شادی کر لی۔ وہ میرے ہی سیکشن میں کام کرتی ہے۔ بہت معقول لڑکی ہے۔ انٹلیکچول نہیں ہے۔ اسمتھ کالج کی تعلیم یافتہ ہے جو یاں کا بڑا سخت ارسٹوکریٹک کالج ہے۔ چنانچہ اطمینان رکھو۔ تمھاری بھاوج 'شاپ گرل' نہیں جو تم نیٹو لڑکیوں کا راسخ عقیدہ ہے کہ تمھارے ناخلف بھائی لوگ مغرب میں آکر شاپ گرلز اور بقول تمھارے دھونبوں کو سمیٹ لاتے ہیں... واقعی!!! تم لوگ کس قدر زبردست اسلوب ہو۔ بہر حال تصویر آئندہ بھیجوں گا۔ کارمن خوبصورت نہیں مگر ساری پہن کر بالکل ہندوستانی لگے گی۔ ع 'کیونکہ آج بھی اس دیش میں عام ہے چشم غزال' وغیرہ۔ یہ بات اماں کو بتلا دینا۔ راہل اچھی طرح ہے۔ کارمن سے ابھی سے بہت ہل گیا ہے اور خوب موٹا ہو رہا ہے ماشاء اللہ سے۔

1951 میں بلقیس کے پاس جمیل کا خط اسی نیو یارک سے آیا تھا:

''...ہاں ایک چیز البتہ بتلانا بھول گیا۔ میں نے پچھلے ہفتے ایک سندھی لڑکی سے شادی کر لی۔ وہ کولمبیا میں سوشیولوجی پڑھ رہی ہے۔ ذات کی عامل ہے جو سندھیوں میں بڑی اونچی ذات سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اماں کو کم از کم یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ میں نے کسی 'پیچ فرنگن' کو پلے نہیں باندھ لیا۔ اب بٹیا تم اس اشتیاق میں مری جا رہی ہوگی کہ اس کی شکل کیسی ہے۔ تو بھئی بے حد گوری ہے۔ ایک دم سرخ و سفید اور کافی خوبصورت ہے۔ عورتوں کے حسن کی تعریف کے معاملے میں ہمیشہ کا کنجوس ہوں (کیونکہ ذرا سی تعریف سے ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے) مگر یہ واقعی اچھی خاصی قبول صورت لڑکی ہے۔ قد میں تم سے ذرا نکلتی ہے۔ اردو بہت صاف نہیں بولتی مگر بڑا پائینچہ پہن کر عین میں چاند پور موضع تلسی پور ضلع فیض آباد کی سیدانی معلوم ہوگی۔ اطمینان رکھو...

...یہ اس قدر شائستہ، مہذب، نستعلیق وضعدار اور غیر سیاسی قسم کے لوگ تھے کہ سیتا کو حیرت ہوتی تھی۔ اتنا بڑا ہنگامہ آکر گزر گیا۔ دنیا تہہ و بالا ہو گئی مگر یہ لوگ اسی سکون سے ان کوٹھیوں میں بیٹھے رہے۔''[6]

گڈریا کی معنویت یہ ہے کہ اس نے مذہبی حدود کو عبور کرتے ہوئے تہذیبی Discourse کا ایک اچھوتا منظر نامہ پیش کیا۔ اس افسانے کے داؤجی، صرف اشفاق احمد یا افسانے کے راوی کے داؤجی نہیں رہتے ہیں بلکہ ہر اس قاری کے داؤجی بن جاتے ہیں جو تہذیب کی ابجد سے واقف ہو۔ داؤجی کا لباس، ان کا علم، ان کا عمل، ان کا درس اور ان کی فکر اس تہذیب کی بے مثال نمائندہ ہیں جن کے امتزاج سے سچی ہندوستانیت کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ یہ وہ داؤجی ہیں جو راوی سے سورہ فاتحہ سنتے ہیں۔ دسویں جماعت میں صندلی نامہ، فسانہ آزاد اور الف لیلہ پڑھ چکے ہیں۔ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے کریما، گلستاں اور بوستاں کو جہیز تصور کرتے ہیں اور بقول داؤجی کہ ''میں اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سر مطہر پر مکے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔'' داؤجی کو اپنی بودی جان سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ یہ ان کی مرحوم ماں کی نشانی ہے۔ ان کو سب سے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ ان کے ہونے والے سمدھی فارسی کے استاد ہیں۔ یہ ہے داؤجی کی شخصیت۔ پھر یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کو آزادی ملی اور وہ ہندوستانی کے بجائے ہندو، مسلمان اور سکھ بن بیٹھے۔ اس کے بعد داؤجی اور داؤجی جیسوں پر کیا گزری ملاحظہ ہو:

''رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو داؤجی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور کہہ رہا تھا ''اب بول بیٹا اب بول۔'' اور داؤجی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے پگڑی اتار کر کہا ''پہلے بودی کاٹو بودی۔'' اور رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤجی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا ''بلا دیں گے جے؟'' اور رانو نے کہا ''جانے دو بڈھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا۔'' پھر اس نے داؤجی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا ''کلمہ پڑھ پنڈتا'' اور داؤجی آہستہ سے بولے ''کون سا؟''

رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا ''سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں۔''

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا: ''چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔''

اور ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!''[7]

بظاہر یہ اقتباس تہذیبی تنزل کا مظاہرہ کر رہا ہے لیکن بہ باطن یہ درس دے رہا ہے کہ جب تک ہمارے درمیان تہذیبی لین دین کا سلسلہ جاری و ساری رہے گا تب تک ہماری تہذیب ہمارے اذہان اور معاشرے کو معطر کرتی رہے گی۔ ادب کے تہذیبی اظہاریے کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک جملے میں پندرہ سو سالہ تہذیبی روایت کو پیوست کر دیتا ہے۔ کیا ہمیں اس کا ثبوت اشفاق احمد نے اس جملے میں نہیں دیا ہے کہ:

''اور ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!''

کیا اس ایک جملے کے علامتی نظام سے تہذیب کا سلسلہ داؤجی کے ساتھ ساتھ فرید گنج شکر سے ہوتا ہوا حضرت محمد تک نہیں پہنچتا؟

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان و ادب نے عالمی تہذیبوں کے امتزاج سے نہ صرف ہندوستانی تہذیب کو منور و منفرد بنایا بلکہ ہندوستان کی تہذیب کو ایک ایسی مشترکہ صورت عطا کی جسے دیکھ کر آج بھی دنیا بھر کے لوگ رشک کرتے ہیں۔

اس محاکمے سے ثابت ہوتا ہے کہ بلاشبہ زبان و ادب خیالات و جذبات کے اظہار کا بہترین وسیلے کے ساتھ ہی ساتھ سماجی اور تہذیبی مظہر کے نمائندے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ زبان اور اس کے ادب میں سماج، تاریخ اور تہذیب کو محفوظ رکھنے، ان کی نمائندگی کرنے اور انھیں دائمی حیات بخشنے کی قوتیں موجود ہوتی ہیں جس کی عمدہ مثال اردو زبان و ادب ہے۔

حواشی:

1. روح تہذیب، خواجہ غلام السیدین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ص 53
2. زبان و تہذیب، احتشام حسین، مشمولہ اردو میں لسانیاتی تحقیق، مرتبہ: ڈاکٹر عبدالستار دلوی، 1971، ص 268
3. انفرادی شعور اور اجتماعی زندگی، شمیم حنفی، ص 124
4. اردو زبان کی تاریخ، مرزا خلیل احمد بیگ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص 409
5. اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب، گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص 255
6. چار ناولٹ، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص 76-77، 77-78، 81
7. گڈریا، اشفاق احمد، مشمولہ: اردو کے تیرہ افسانے، مرتبہ: اطہر پرویز، ص 323

Jamshed Ahmad, Pandeshar College, Pandeshvar, Bardwan - 713346 (W.B)

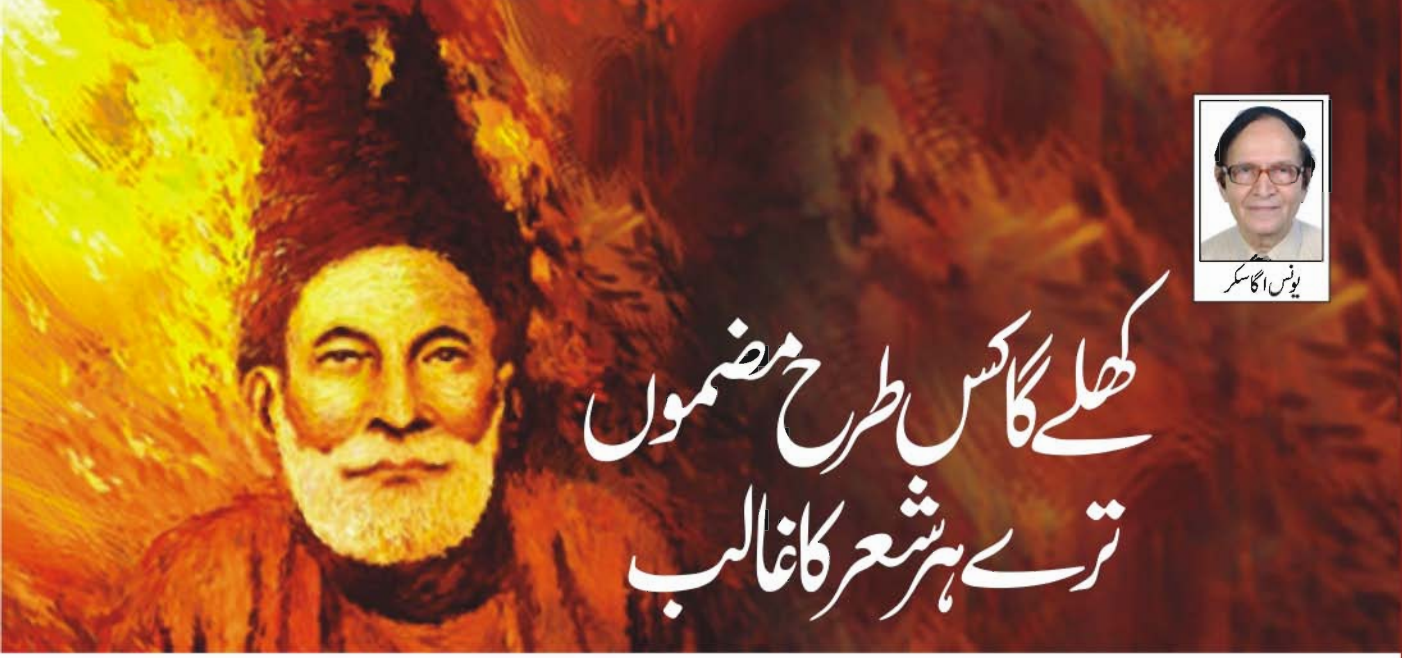

یونس اگاسکر

کھلے گا کس طرح مضموں ترے ہر شعر کا غالب

غالب کی شعر گوئی کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ کمال ذہانت کے ساتھ مضمون شعر کے کسی نہ کسی پہلو کو بین السطور میں اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ جب تک شعر کو ایک سے زیادہ بار نہ پڑھیں یا تدقیق سے کام نہ لیں شعر کا مفہوم پوری طرح نہیں کھلتا اور اسی لیے اس قسم کے شعروں کی شرح میں بعض اوقات ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔

غالب کے دو مشہور شعروں میں کعبہ و بت خانہ اور کعبہ و اہل کنشت کا ذکر قدرے تفنن کے ساتھ ملتا ہے مگر ان میں کہی سے زیادہ اَن کہی بات پر لطف معلوم ہوتی ہے بشرطیکہ شعر کی تفہیم میں تامل و تفکر کو راہ دی جائے۔

پہلے زیادہ مشہور شعر سنیے:

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مَرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالب کے ممتاز شارح نظم طباطبائی فرماتے ہیں: ''یعنی وفاداری و پاسداری ہر حال میں، یہاں تک کہ کفر میں بھی قابلِ قدر ہے۔''

اس شعر پر گفتگو سے پہلے مومن کا یہ شعر پڑھیے:

کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومن
بت کسی کا خدا نہیں ہوتا

غالب نے بھی وفاداری کے ساتھ استواری کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ بت خانے میں عمر گزارنے والا برہمن بھی اس حقیقت سے واقف ہو جانے کے باوجود کہ بت حاجت روا نہیں ہوتے، ان کی سیوا اور پوجا کرنا نہیں چھوڑتا۔

بتوں کے پجاری برہمن کے مقابلے میں خدا پرستوں کو دیکھیے کہ جہاں کوئی کام رکا یا حاجت روائی کی صورت نظر نہ آئی کہ 'ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں' کہہ کے روگردانی شروع کر دیتے ہیں یا غالب ہی کے الفاظ میں شکایت کرنا شروع کر دیتے ہیں:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یعنی خدا پرستی تو ہم نے کب کی چھوڑ دی اور اب ہر جگہ کہتے پھرتے ہیں:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

خیر نمرود خدا نہ سہی ایک مطلق العنان بادشاہ تو تھا۔ اپنی رعایا کی حسبِ استطاعت حاجت روائی تو کر ہی سکتا تھا۔ بت تو ادنیٰ سی حاجت روائی کی استطاعت بھی نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود برہمن ان کے قدموں میں پڑا رہتا ہے۔

اب دوسرا شعر سنیے:

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

پھر مومن یاد آ گئے، فرماتے ہیں:

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

یہ وہی مومن ہیں جنھوں نے مرتے دم تک عشقِ بتاں میں گرفتار رہنے کو اپنی مجبوری بتایا تھا:

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

خیر غالب کے شعر کی طرف لوٹتے ہیں۔ غالب کے سب سے معروف اور موقر شرح نگار نظم طباطبائی نے غالب کے مذکورہ بالا پہلے شعر کی طرح اس دوسرے شعر کو بھی ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھا ہے، فرماتے ہیں:

''کعبے گیا تو کیا ہوا، کیا کہیں بت کدے کو میں بھولنے والا ہوں۔''

آیئے شعر کو ایک بار پھر دہرا لیتے ہیں:

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبتِ اہلِ کنشت کو

طباطبائی نے 'کعبے میں جا رہا' کی معنویت کو نظرانداز کر کے محض 'کعبے گیا' کہہ کر جو شرح کی ہے کہ 'میں بت کدے کو بھولنے والا نہیں ہوں' وہ اس اعتبار سے ادھوری اور ناقص ہے کہ غالب 'کعبے میں جا رہے' اور 'حق صحبتِ اہلِ کنشت' کو نہ بھولنے کی بات کہہ رہے ہیں، محض بت کدے کو نہ بھولنے کی نہیں۔

'حقِ صحبت اہلِ کنشت' سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کا جواب غالب کے درج ذیل شعر میں تلاش کیا جا سکتا ہے:

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

یعنی کعبہ بھی کبھی بت خانہ ہی تھا۔ ایسے میں کعبہ میں جا رہنے سے بتوں سے ناتا توڑنے کا طعنہ دینا درست نہ ہوگا۔ کعبے سے نسبت ہونے کی وجہ سے ہی میں بتوں کا پرستار تھا۔ کعبے سے دور رہ کر میں نے بت پرستی نہیں چھوڑی تو اب کعبے میں آ بسنے کے بعد میں حق صحبتِ اہل کنشت کو کیوں کر بھولوں گا؟ یعنی بتوں کی پرستش کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

'مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو' میں بھی غالب نے یہی کنایہ رکھا ہے کہ کعبہ بھی کبھی بت خانہ تھا، اس لیے برہمن کی بتوں سے اٹوٹ وفاداری کا بہترین صلہ یہی ہونا چاہیے کہ اسے کعبے میں دفن کیا جائے۔ برہمن کو کعبے میں دفن کرنے کا اس سے عمدہ جواز کیا ہو سکتا ہے۔

ویسے غالب اپنے وحدت الوجودی رجحان کے سبب کعبہ و بت خانہ کو ایک ہی حقیقت کے دو روپ مانتے تھے۔ اس لحاظ سے بھی اہلِ کعبہ و اہلِ کنشت میں تفریق ان کے شعری مسلک کے خلاف ہوتی۔

اخیر میں بس اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ محولہ بالا دو شعروں کی

تشریح میں کعبے کے کبھی بت خانہ ہونے کی 'ان کہی' پر قرار واقعی توجہ نہ دینے کے سبب طباطبائی اور دیگر شارحین کے بیان کردہ مطالب میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

ا غالب کا ایک نہایت مشہور مطلع ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اکثر شرح نگاروں نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے گل اندام حسینوں کے زیر زمین چلے جانے کے بعد لالہ و گل کی صورت میں نمایاں ہونے کو شعر کا بنیادی خیال یا مضمون قرار دیا ہے اور فارسی و اردو کے پیش رو شعرا کے حوالے سے اس خیال کے قدیم یا فرسودہ ہونے کی طرف اشارہ یا اس پر استدلال کیا ہے اور اس بات سے صرفِ نظر کر گئے ہیں کہ غالب نے 'نمایاں' ہونے والی صورتوں سے زیادہ 'پنہاں' رہ جانے والی صورتوں کو بنیادی اہمیت دی ہے۔

چناں چہ طباطبائی کے نزدیک اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ لالہ و گل انھیں حسینوں کی خاک ہے جو خاک میں مل گئے۔'

قطع نظر اس سے کہ طباطبائی سے اس قدر پھسپھسے جملے کی توقع نہیں کی جاسکتی، ان کا 'سب کہاں کچھ' جیسے بولتے ہوئے فقرے کو نظر انداز کرنا ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے نیز افسوس اس بات پہ ہوتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی جیسے درّاک اور نکتہ شناس شارح نے بھی غالباً طباطبائی کی شرح سے دھوکا کھا کے امیر خسرو، میر تقی میر اور ناسخ کے شعروں سے غالب کے زیر بحث شعر کا موازنہ کرتے ہوئے خاصی طویل گفتگو کی ہے مگر غالب کی جدت طرازیوں مضمون آفرینی کی داد دینے کے باوجود وہ اس حقیقت کو اجاگر نہیں کر پائے ہیں کہ غالب کا مضمون فارسی اور اردو میں مستعمل خیال سے جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔

غالب سے قبل فارسی و اردو کے شعرا نے گل و لالہ کے کھلنے کا سبب حسینانِ گل اندام کے خاک میں مل جانے کو بتایا ہے لیکن کسی نے گل و لالہ کی شکل میں بھی نمایاں نہ ہو پانے والی حسین صورتوں کی باز آفرینی میں فطرت کی لازوال قوتِ نمو کے ناکام رہنے کا مضمون نہیں باندھا ہے۔

'خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں' کو تحسین و تاسف دونوں تاثرات کا حاصل مصرع سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ خاک میں پنہاں ہونے والی صورتوں کا حسن اس دشتِ امکاں کے پرے جا کے حسنِ ازل میں شامل ہوگیا ہے۔ اب وہ کسی بھی مادی روپ میں ظاہر نہیں ہوگا کیونکہ مادی کائنات میں وہ صلاحیت نہیں کہ ان کے حسن کی باز آفرینی کر سکے۔

دوسری صورت میں ان حسینوں کے لوٹ آنے کی تمنا کے حسرت میں بدل جانے کا اظہار ہوگا یعنی گنج ہائے گراں مایہ کے زیر زمیں چلے جانے کا ماتم ہوگا جیسا کہ غالب کے اس شعر میں نظر آتا ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ا کہی کے ساتھ اَن کہی پر بھی توجہ نہ دینے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ غالب کا شعر ہے:

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

طباطبائی فرماتے ہیں: ''خط کے نکل آنے سے خریدار کم

شعر میں معشوق کے رخِ روشن کو شمع سے اور خط کی سیاہی کو شمع کشتہ (بجھی ہوئی شمع) کے دھوئیں سے تشبیہ دیتے ہوئے بازارِ حسن کے سرد پڑجانے کے مضمون کی تکمیل کی گئی ہے۔ شمعِ کشتہ اور بازار کی رونق یا چهل پہل کے سرد ہونے میں پائی جانے والی مناسبت پر ضروری توجہ نہ دینے کے سبب طباطبائی کی شرح نامکمل رہ گئی ہے۔ خیال رہے شمع کے بجھانے کو شمع ٹھنڈی کرنا بھی کہتے ہیں۔

ہوگئے اور بازارِ عشق سرد ہوگیا۔ تو گویا خط' بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے کہ اس دھوئیں کا اٹھنا اور گرمیِ بازار و فروغِ حسن کا زوالِ شمع کے ساتھ ہی ہوجاتا ہے۔''

اس شرح میں غیر ضروری کفایتِ لفظی کھٹکتی ہے۔ 'بازارِ عشق سرد ہوگیا' کی مناسبت سے محض 'خریدار کم ہوگئے' کہنے کے بجائے 'حسن کے خریدار کم ہوگئے' کہنا چاہیے تھا۔ اس طرح 'اس دھوئیں کا اٹھنا اور گرمیِ بازار و حسن کا زوال شمع کے ساتھ ہی ہوجاتا ہے۔' اس گنجلک جملے کو اس طرح لکھنا چاہیے تھا کہ شمع کے بجھنے سے بازار کے سرد ہونے کا تعلق اجاگر ہوتا ہے۔ اگر جملہ یوں ہوتا تو قدرے بہتر ہوتا:

''جس طرح دوکانوں میں شمع کے بجھنے پر خریدار نہیں آتے اور گرمیِ بازار کم ہوجاتی ہے اسی طرح معشوق کی کم سنی کا دور ختم ہوتے ہی اس کے حسن کی شمع بھی ٹھنڈی ہوگئی اور عاشقوں کی گرم بازاری بھی جاتی رہی۔''

شعر کی تفہیم کے لیے بازار کی تمثیل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ بازار عموماً شام کے وقت لگا کرتے تھے اور دیر رات گئے تک کھلے رہتے تھے۔ جب تک دوکانوں میں چراغ یا شمع روشن تھی خریدار آتے تھے۔ بتی گل ہونے کا مطلب ہوتا تھا دوکان بند ہوگئی یا مطلوبہ شے ختم ہوگئی۔ ایسے میں خریدار اس دوکان کا رخ نہیں کرتے۔ شمع کے بجھنے سے دھواں اٹھتا ہے جو سیاہ ہوتا ہے۔ دوست کے رخِ روشن پہ خط کی نمود بھی گویا بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ شمعِ حسن گل ہوگئی۔ ایسے میں حسن کے خریداروں کی چهل پہل کا کم ہونا بھی ایک فطری بات تھی سو ہوکر رہی۔

شعر میں معشوق کے رخِ روشن کو شمع سے اور خط کی سیاہی کو شمعِ کشتہ (بجھی ہوئی شمع) کے دھوئیں سے تشبیہ دیتے ہوئے بازارِ حسن کے سرد پڑ جانے کے مضمون کی تکمیل کی گئی ہے۔ شمعِ کشتہ اور بازار کی رونق یا چهل پہل کے سرد ہونے میں پائی جانے والی مناسبت پر ضروری توجہ نہ دینے کے سبب طباطبائی کی شرح نامکمل رہ گئی ہے۔ خیال رہے شمع کے بجھانے کو شمع ٹھنڈی کرنا بھی کہتے ہیں۔

ا مندرجہ ذیل شعر کی شرح کو بھی ہماری گفتگو میں شامل کیا جاسکتا ہے:

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

طباطبائی فرماتے ہیں: ''مضطرب اور بے تاب کو آتش زیرپا کہتے ہیں اور آتش جب زیرپا ہوئی تو زنجیرپا گویا موئے آتش دیدہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ بال آگ کو دیکھ کر (؟) پیچ دار ہوجاتا ہے اور حلقۂ زنجیر کی ہیئت پیدا کرتا ہے۔''

یہ شرح اس اعتبار سے نامکمل ہے کہ آگ کے اثر سے بال صرف پیچ دار ہی نہیں ہوتا بلکہ اتنا کمزور ہوجاتا ہے کہ محض چھو لینے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس شعر میں اسیری میں بھی آزادی حاصل ہونے کا مضمون ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مضطرب اور بے تاب کو آتش زیرپا کہتے ہیں لیکن اس ترکیب کی بلاغت پر غور کریں تو ایک نکتہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح آتش زیر پا شخص ایک ہی جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا یا ایک قدم زمین پر دھرے گا تو دوسرا اٹھا لے گا، اسی طرح غالب اپنے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ نہ صرف میرے پیروں کی زنجیر موئے آتش دیدہ کی طرح کمزور ہوکے ٹوٹ گئی ہے بلکہ میں جس طرح زنداں سے باہر دشت نوردی کیا کرتا تھا وہی انداز یہاں بھی اپنائے ہوئے ہوں۔ دشت نہیں تو نہ سہی پیر تو معذور نہیں۔

غالب کے اس شعر کو ان کے درج ذیل دو شعروں سے ملا کر دیکھیں تو اس کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے:

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پانو میں زنجیر نہیں

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ
ملتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

Prof. Yunus Agaskar,
E-212, Vaswani Lane, Opp: J.P Marg,
7, Bungalow, Andheri (West),
Mumbai-400058 (MS)

حاتم طائی کے ملک سے

عذرا نقوی

اردو ادب کے حوالے سے ملکِ یمن کا نام آتے ہی قصہ حاتم طائی کا خیال آتا ہے۔ لیکن ہم آج موجودہ زمانے کے یمن کی بات کرنا چاہتے ہیں، وہ یمن جو دولت مند عرب ممالک کا ایک غریب رشتے دار ہے اور سیاسی اتھل پتھل میں سب سے منفرد ہے۔ ابھی 1990 میں ہی اس خطے کو ایک طویل خانہ جنگی اور سیاسی کشمکش کے بعد ایک متحد ملک، یونائٹیڈ ریپبلک آف یمن بننا نصیب ہوا۔ اس سے پہلے 1918 سے لے کر 1967 تک اس علاقے پر برطانوی فوجی تسلط رہا اور جب انتیس نومبر، 1967 کو برطانیہ کی فوجوں کا انخلا ہوا تو یمن کے زیادہ آبادی والے شمالی علاقے اور غریب اور کم آبادی والے، غریب جنوبی یمن کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی جو 1990 میں ختم ہوئی اور نیا یمن وجود میں آیا۔ اس خانہ جنگی کے دوران ہی یمن ایک قبائلی نظام سے ایک متحد سیاسی اکائی بن کر ابھرا، جو تا حال سیاسی اتھل پتھل کا شکار ہے اور ان دنوں تو حالات اور بھی پیچیدہ و سنگین ہوگئے ہیں۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد ہم یمن کے ہم عصر ادب کی طرف آتے ہیں او پر یمن کے سیاسی حالات کا بے حد مختصر تعارف ہم نے اس لیے کیا ہے کہ سیاسی پس منظر کسی ملک کے ادب کو سمجھنے میں کافی معاون ہوسکتا ہے۔ عربی زبان میں صنفِ شاعری کی ہمیشہ بہت اہمیت رہی ہے اور ہم عصر ادب میں بھی شاعری ہی کو فوقیت حاصل ہے۔ لندن میں Banipal نام کا ایک ٹرسٹ ہے جو ماڈرن عربی ادب کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ اسی ٹرسٹ کے تحت Banipal ہی کے نام سے لندن سے ایک انگریزی رسالہ شائع ہوتا ہے۔ اس کا چھتیسواں شمارہ 'یمن' کے ادب پر مشتمل ہے۔ ہم اس مضمون میں یمن کے ہم عصر ادیبوں کی لکھی ہوئی کچھ کہانیوں کا جائزہ لیں گے۔

یمن میں مختصر کہانی لکھنے کی ابتدا یوں تو انیس سو چالیس کی دہائی میں ہوگئی تھی، احمد براق کی ایک کہانی ایک اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ ملک میں جیسے جیسے نئے اخبارات اور رسائل شائع ہونے لگے، کہانیاں لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ صالح الدحان کی کہانیوں کا مجموعہ انیس سو چھپن میں شائع ہوا۔ انیس سو پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں جو کہانیاں لکھی گئیں ان میں اس دور کے سیاسی اور سماجی مسائل کا زیادہ اثر تھا۔ جب یمنی ادیب ملک سے باہر جانے لگے اور دوسری زبانوں کے ادب سے روشناس ہوئے تب یمنی ادب میں کافی تبدیلی آئی۔ محمد عبدالولی (1977 -1940) جنھوں نے مصر اور سویت یونین میں تعلیم حاصل کی اپنے وقت کے نمایاں کہانی کار تھے۔ ان کے دو ناولوں کے انگریزی ترجمے "Sana'a an open city" اور "They die stranger" کے نام سے شائع ہوئے اور بہت مشہور ہوئے۔ ان کی اور ان جیسے دوسرے لکھنے والوں کی کوششوں سے یمنی ادب میں کہانیاں محض غیر مربوط سماجی تبصروں کے انداز سے نکل کر کہانی کی ہیئت اور حقیقت پسندانہ نثر میں ڈھلنے لگیں۔ اس مضمون میں ہم کچھ منتخب یمنی کہانیوں کا جائزہ لیں گے جن میں ماڈرن طرزِ زندگی سے مزاحمت، اور سادہ روایتی زندگی کا ناسٹیلجیا بھی ہے، نئے دور کی دستک بھی سنائی دیتی ہے اور سیاسی حالات کی جھلک بھی موجود ہے۔

زاید مطیع دماج یمن کے مشہور لکھنے والے ہیں۔ ان کا ایک ناول "The Hostage" کے نام سے انگریزی میں ترجمہ ہوکر بہت مشہور ہوا تھا۔ یہ عرب رائٹرز یونین کے سو (100) بہترین ادب پاروں کی فہرست میں پینتالیسویں نمبر پر رکھا گیا تھا۔ زاید مطیع دماج کی کہانی 'بھٹے بیچنے والی' یمن کے روایتی بازار کی تصویر کشی کرتی ہے جہاں 'قط' کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ عرب ممالک میں لوگ قط (ایک پودے کی سوکھی ہوئی پتّیاں) چباتے ہیں اور تھوک دیتے ہیں جیسے ہمارے ممالک میں تمبا کو کھایا جاتا ہے۔ اس بازار میں 'قط' کے علاوہ مختلف قسم کی دالیں، سبزیاں وغیرہ بھی فروخت ہوتی ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک نوجوان ہے جو سرکاری ملازم ہے اور اکثر اس بازار میں ایک خوبصورت، خوش مزاج اور طرح دار لڑکی کی وجہ سے ہی آتا ہے جو بھٹے بھون کر بیچتی ہے۔ وہ لڑکی ہمیشہ اپنی مخصوص جگہ بازار کے دروازے کے قریب دری بچھا کر بیٹھتی ہے، بازار کے دوسرے معمولی دکان دار بھی اس لڑکی کا لحاظ کرتے ہیں۔ روایتی عربی لباس میں یہ لڑکی آدھے چہرے کو نقاب میں چھپائے رکھتی ہے لیکن اس کی چمک دار آنکھیں ہی نوجوان کے دل کو گرما دیتی ہیں۔ وہ اس لڑکی سے فلرٹ سا کرتا رہتا ہے ادھر ادھر کی باتیں کرتا ہے، اس کے معصوم حسن سے محظوظ ہوتا ہے۔ اس لڑکی کے قرب میں وہ سکون پاتا تھا اس لڑکی کا سراپا اور قط بازار کا نقشہ مصنف نے بہت کامیابی سے کھینچا ہے، قاری خود کو اسی بازار میں موجود محسوس کرتا ہے۔ جب یہ لڑکی ایک دن ذکر کرتی ہے کہ وہ اب بھٹے بھوننے کا کام ختم کر کے 'قط' بیچنے کا کام شروع کرنے والی ہے تو یہ نوجوان کو ناگوار گزرتا ہے کیونکہ قط کے کاروبار میں عموماً اوباش قسم کے، عیار لوگ ہی ہوتے ہیں، وہ لڑکی کو اس قسم کے لوگوں سے دور رہنے کو کہتا ہے لیکن یہ لڑکی بازار کے ایک امیر، عیار، لالچی، بد دیانت قط کے کاروباری کی مدد سے قط بیچنے کا کام کرنے لگتی ہے جس میں زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ یہ شخص بازار کے دوسرے لوگوں اور اس نوجوان کا بھٹے بیچنے والی کے ارد گرد رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ نوجوان لڑکی کے اس اقدام سے دل برداشتہ ہوجاتا ہے اور اس بازار میں جانا بند کر دیتا ہے۔ بہت عرصے بعد وہ ایک دن اس بازار میں جاتا ہے تو دیکھتا ہے وہ لڑکی اب پختہ عمر کی ہوگئی ہے اور بازار کے عقبی حصے میں اپنے قط کے ٹھیلے کے پیچھے آلتی پالتی مارے بیٹھی ہے۔ وہ نوجوان دیکھتا ہے کہ بازار کے دروازے کے قریب ایک اور نوجوان لڑکی بھٹے بھون کر بیچ رہی ہے۔ یہ لڑکی اس کی پرانی محبوبہ کی طرح خوبصورت تو نہیں ہے لیکن وہ نوجوان اس کی طرف ملتفت ہونے لگتا ہے، جیسے یہ لڑکی بھی اس کے لیے بھاگتی دوڑتی، مصروف جدید دور کی زندگی میں ایک جائے فرار ہو۔ اس کہانی میں معصوم، جوان، خوبصورت بھٹے بیچنے والی عورت کی زندگی کی سادگی، طمانیت اور خوبصورتی کی علامت معلوم ہوتی ہے۔

علی العواد بادیب کی ایک کہانی عرب کی ایک دلچسپ رسم کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ کہانی دنیا کے کسی بھی قاری کے دل میں اُتر سکتی ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ "Trilling Cries of Joy" کے نام سے ہوا ہے۔ Trilling جس کو عربی میں 'زغرودة' کہتے ہیں، ایک رسم ہے جس میں کسی بھی خوشی کے موقعے پر خواتین اپنی زبان کو منہ میں گھما کر آوازیں نکالتی ہیں (ہندوستان میں بنگال اور آسام میں بھی یہ

رسم ہے اور اسے اُلا دھونی کہتے ہیں)۔ یہ کہانی ایک بیٹے 'محسن' کی اپنی ماں کی یادوں اور محبت کی کہانی ہے۔ وہ یاد کرتا ہے کہ اس کی ماں 'زغرودۃ' کرنے میں مشاق تھی۔ محلے پڑوس میں، خاندان میں جب بھی کوئی خوشی کا موقع ہوتا تھا وہ خاص طور پر بلائی جاتی تھی۔ اس کے والد کو یہ ناپسند تھا وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا، کبھی کبھی تضحیک بھی کرتا تھا ''سلمی! یہ کیا ہر جگہ گدھے کی سی آوازیں نکالنے پہنچ جاتی ہو۔'' محسن یاد کرتا ہے کہ جب وہ بچہ تھا تو اکثر شادی بیاہ، یا حج سے لوگوں کی واپسی کے موقع پر ماں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ ماں کو اکثر تحفے تحائف اور مٹھائیاں ملتی تھیں جو وہ فوراً بچوں کو دے دیتی تھیں۔ محسن جب بڑا ہونے لگا تو اسے اپنی ماں کے 'زغرودۃ' کرنے سے شرمندگی سی ہونے لگی۔ اسکول میں کوئی لڑکا اگر اس کا ذکر کرتا تو وہ لڑنے لگتا تھا۔ وہ اسکول کی پڑھائی کے بعد مزید تعلیم کے لیے سوڈان جانے لگا تو ماں نے اس کو روتے ہوئے رخصت کیا اور کہنے لگی میں تب تک 'زغرودۃ' کرتی رہوں گی جب تک تم سڑک پر جاتے ہوئے نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاؤ گے۔ سوڈان میں وہ شروع میں تو پڑھائی میں غرق ہو گیا لیکن کچھ دن بعد اسے گھر کی یاد ستانے لگی۔ کہیں دور بھی اگر 'زغرودۃ' کی آواز آتی تو اسے اپنا وطن، اس کے پہاڑ، اپنا گھر، اپنی ماں، اپنی گلیاں اپنے دوست یاد آنے لگتے، اس کا دل چاہتا کہ کہیں سے یہ آواز آئے۔ لیکن ایک بار جب سوڈان میں تعلیم کے دوران وہ اپنے گھر ملنے گیا اور اپنے شہر کی فضا میں سانس لیا تو اس آواز سے اس کی کوفت واپس آتی محسوس ہوئی۔ تعلیم کے دوران اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ ماں سے ملنے گیا تو اس بار اس نے 'زغرودۃ' نہیں کیا اور پھر کبھی بھی اس نے یہ خوشی کی آوازیں نہیں نکالیں اور پھر وہ خود بھی موت کی آغوش میں چلی گئی۔ کہانی کا اختتام ایک جذباتی مونولاگ کے انداز میں ہے، وہ اپنی شادی کے موقع پر ماں کو یاد کرتا ہے۔ اس کی بہن سعادہ 'زغرودۃ' کرتی ہے، اسے بتاتی ہے کہ ماں کہا کرتی تھی کہ میں اپنے بیٹوں کی شادی پر، اور خاص کر آپ کا نام لیتی تھی کہ محسن کی شادی پر کب 'زغرودۃ' کروں گی؟ محسن یہ سن کر روتے ہوئے کہتا جاتا ہے، ''اگر ایسا ہے ماں تو تم ضرور 'زغرودۃ' کرو، 'زغرودۃ' کرو! نا''

وجدی الاحدال (پیدائش 1973) یمنی ادب کا ایک اہم نام ہے، ناول، کہانیاں اور ڈرامے لکھتے ہیں۔ ان کے ایک ناول 'قوارب جبلیہ' پر بنیاد پسند اسلامی گروپ کی طرف سے بہت اعتراض ہوا تھا اور وہ ملک بدر ہونے پر مجبور ہو گئے تھے، اور کافی دن لبنان میں رہنے کے بعد وہ واپس یمن آ گئے تھے۔ ان کا ایک ناول 'فیلسوف القرنطینۃ' کا انگریزی ترجمہ "Quarintine Philoshper" کے نام سے ہوا تھا اور 2008 کے Arab booker ایوارڈ کے لیے نامزد ہوا تھا۔ ان کا ایک اور ناول "A land without Jasmin" کے نام سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر کافی مشہور ہوا ہے۔ آج کل وجدی یمنی وزارتِ ثقافت میں سنیما اور ڈرامہ میں کام کرتے ہیں۔ ان کی ایک کہانی ہے 'پیدل واپسی'، اس میں ہماری ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوتی ہے جس کے لیے پیدل چلنا جدید ذرائع سفر کے خلاف جانے کی علامت ہے۔ یہ غریب ہے اور اپنی زندگی سادہ رکھنا چاہتا ہے اور کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا۔ اس رویے پر قائم رہنے کے لیے اسے اپنی محبوبہ دھلیا کو کھونا بھی پڑتا ہے، جو تھک کر ایک کار والے آدمی سے لفٹ لے لیتی ہے اور عصمت دری کا شکار ہو جاتی ہے۔ پوری کہانی میں ہمیں نئے صارفی سماج سے بیزاری کی ایک زیریں لہر محسوس ہوتی ہے۔ جدید زندگی سے مزاحمت اور خوف ہمیں ہمدان دمّاج کی کہانی 'بھیانک خواب' میں بھی نظر آتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار (مصنف نے کوئی نام نہیں دیا) بار بار ایک خواب دیکھتا ہے کہ اس کو کسی تیز رفتار کار نے کچل دیا ہے۔ ایک بار وواقعی سڑک پر چلتے ہوئے وہ کار کی چپیٹ میں آنے والا ہی تھا کہ ایک اجنبی اسے بچا لیتا ہے۔

جدید زندگی کا ایک مثبت پہلو ہمیں محمد بہا کی کہانی 'الوداعی الفاظ' میں نظر آتا ہے۔ اس کہانی میں ہمیں ایک باہمت عورت سعیدہ ملتی ہے جس کا شوہر اسے اور اپنے بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر ملک سے باہر گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ ماڈرن زمانے میں حکومت کی طرف سے تعلیم نسواں اور دیگر سہولتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سعیدہ پڑھنا لکھنا سیکھتی ہے، ملازمت حاصل کرتی ہے اور خود اپنے ہاتھ سے اپنے شوہر کو ایک الوداعی خط لکھتی ہے جس میں اپنی زندگی کے سارے غم و غصے کا اظہار کرتی ہے اور اطلاع دیتی ہے کہ وہ اب خود کفیل ہے اور بچوں کی پرورش بھی بخوبی کر رہی ہے۔ خط کے ساتھ اس نے ایک اخبار کا تراشہ بھی منسلک کر دیا ہے جو عدالت کی طرف سے خلع کا نوٹس ہے اور اس میں لکھا ہے کہ اگر متعین تاریخ تک وہ کورٹ میں حاضر نہ ہوا تو یہ شادی ختم سمجھی جائے گی۔

دہشت گردی سے متعلق کہانی 'بس نمبر 99' میں یاسر عبدالباقی نے دہشت گردی کی سفاکی کی ایک جھلک پیش کی ہے۔ ایک ضعیفہ اور اس کا کم عمر پوتا ایک بس میں سفر کر رہے ہیں۔ ایک اور مسافر بس میں مع ایک بھاری بیگ کے داخل ہوتا ہے۔ پوتا اسکو دیکھ لیتا ہے اور خوشی سے چلاتا ہے ''دادی دیکھو! چچا سمیر ہیں'' ضعیفہ اپنے بیٹے سمیر کو پہچان جاتی ہے لیکن پوتے کو منع کر دیتی ہے کہ اس سے بات نہ کرے لیکن وہ اداسی سے سوچتی ہے کہ میرا اپنا خون مجھے نہیں پہچانتا، یا ہو سکتا ہے اس نے دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ نوجوان (سمیر) بس میں بیٹھے کچھ غیر ملکیوں پر نظر ڈالتا ہے اور بس میں پیچھے ایک بوڑھی عورت کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور وہیں سیٹ کے نیچے اپنا بھاری سا مقفل بیگ رکھ دیتا ہے۔ سمیر کئی سال ہوئے پُراسرار طریقے سے کہیں چلا جاتا تھا اور واپس آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کہا تھا کہ وہ افغانستان میں تھا، لیکن جو پتہ اس نے دیا تھا وہاں سے اس کی ماں کے خط واپس آ گئے۔ ایک دو سال بعد واپس آیا تو بتایا کہ وہ بوسنیا میں تھا، پھر وہ غائب ہو گیا اور اب وہ اس بس میں نظر آیا۔ سمیر بیچ سفر میں اتر جاتا ہے، اس کی سیٹ کے پاس والی بوڑھی عورت چلاتی ہے کہ اسکا بیگ بس میں ہی رہ گیا، سمیر کا بھتیجا لپک کر جاتا ہے اور یہ کہہ کر بیگ لے آتا ہے کہ یہ میرے چچا کا ہے۔ اس کی دادی بیگ کھولنے کی ناکام کوشش کرتی ہے، اس میں سے ٹک ٹک کی آواز آتی ہے۔ سمیر بس سے اتر کر کچھ دور کھڑا ہو کر بیگ میں رکھے ٹائم بم کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگتا ہے لیکن وہ بم نہیں پھٹتا۔ پوتا کہتا ہے کہ شاید سمیر چچا اپنا بیگ لینے گھر آ جائیں، وہ کہتی ہے ''ہو سکتا ہے'' سمیر کی ماں بیگ کو کلیجے سے اس طرح لگائے ہوئے تھی جیسے وہ اس کا بیٹا سمیر ہو۔

رومانی کہانیوں میں، محمد الغربی عمران کی کہانی ''صنعا مجھے نہیں جانتا'' شاعرانہ انداز میں لکھی گئی ہے جس میں ہیرو اپنے وطن واپس آتا ہے اور اپنی کالج کے زمانے کی محبوبہ کی تلاش میں ہے۔ محبوبہ کی تلاش اور اپنے وطن کے مانوس مناظر آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں گویا دونوں ہی اس کا کھویا ہوا پیار ہوں۔ ایک اور رومانی کہانی 'نقاب والی' ہے۔ زیاد صالح الفقیہ کی یہ کہانی سادہ بیانیہ انداز کی ہے جس میں محبت کامیاب ہو جاتی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک غریب لڑکا اپنے محلے میں بچوں کو کہانیاں سنایا کرتا تھا، ایک متمول گھرانے کی بچّی زرگہ بھی کہانی سننے آتی تھی جو سن بلوغت کو پہنچ کر پردہ کرنے لگی لیکن اس کی یاد لڑکے کے دل میں بسی رہتی ہے۔ لڑکا بہتر زندگی اور کام کی تلاش میں محلہ چھوڑ گیا، محنت مزدوری کرتا رہا اور آخرکار لڑکیوں کے اسکول کے پاس جنرل اسٹور کھول لیا اور مالی طور پر آسودہ ہو گیا۔ ایک دن وہ اپنی دکان پر آئی ہوئی عبائے اور نقاب میں ملفوف زرگہ کو پہچان لیتا ہے، ان دونوں کا معصوم سا رومان پروان چڑھتا رہا، زرگہ شریف لڑکیوں کی طرح اپنے والدین کو سب کچھ بتا دیتی ہے اور ان کا رومان کامیاب ہو جاتا ہے۔

ان یمنی کہانیوں کے کچھ کردار اور مناظر ہمارے ذہن میں دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ انسانی رشتوں کے تانے بانے میں پروئی یہ کہانیاں ظاہر ہے کہ یمنی کلچر کی عکاس ہیں لیکن کچھ اجنبی نہیں لگتیں۔ میں ظاہر ہے وہاں کے کلچر عکاسی ہے اور انسانی رشتوں کے تانے بانے ریشمی دھاگے بھی ہین، نفسیاتی الجھنیں بھی ہیں سیاسی حالات کا پس منظر بھی ان کہانیوں میں شامل ہے۔

■

Ms. Azra Naqvi, Farhat Kada, Sir Syed Nagar, Aligarh - 202002 (UP)

مشترکہ تہذیب کے فروغ میں چشتی صوفیا کا حصہ

حبیب نثار

صوفیا نے سرزمین ہند کی تہذیب اور تمدن کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا ہے۔ صوفیا کے چار معروف سلسلے ہیں اور ہر سلسلے سے تعلق رکھنے والے صوفی نے اپنے اپنے طریقہ سے یہاں خدمت انجام دی ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جیسے گل دستے میں کوئی ایک ہی گل سرسبد ہوتا ہے اسی طرح ہندوستان میں چشتی صوفیا نے یہاں کی تہذیب، یہاں کی ثقافت کو بنا نے سنوارنے میں اہم حصّہ لیا ہے۔ ان صوفیا نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ ملک کو 'کثرت میں وحدت' اور 'رنگا رنگی میں یک رنگی' کا پیغام عملی طور پر دیا ہے۔

ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کا آغاز حضرت معین الدین اجمیری کے اسم عالیٰ سے ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے اور ہم آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب اپنے پیر کے حکم سے حضرت راجستھان، اجمیر شریف تشریف لائے اس وقت آپ تنہا تھے (بعض تذکروں میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ آپ کے مریدین اور معتقدین بھی ہمراہ تھے) حضرت معین الدین اجمیری کا یہ کارنامہ ہے کہ آپ نے اپنے حسن سلوک سے، اپنی تعلیمات سے، اپنے تعلقات سے ایک جہاں کو فتح کرلیا۔ یہ حقیقت ہم سب جانتے ہیں کہ آپ تبلیغ کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آپ نے اس سرزمین پر انسان دوستی کا ایسا مظاہرہ فرمایا کہ یہاں کی عوام سے آپ کو غریبوں کو سرفراز کرنے والا 'غریب نواز' کا خطاب ملا۔

حضرت معین الدین اجمیری کے عہد میں ہندوستان کے سرحدی علاقے پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ ہندوستان، عرب، ایران اور ترکستان سے آنے والے صوفیا علما کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہلے پہل مختلف قوموں کے صوفیا و علما کا اجتماع ہوا اور یہیں وہ زبان اختراع ہوئی جسے آج ہم اردو کے نام سے جانتے ہیں۔ تاریخ کے بوسیدہ اوراق کی ورق گردانی سے اجتناب کرتے ہوئے یہ عرض کرنا ہے کہ دراصل ہندوستان کی خانقاہوں (چبوتروں) پر تین اہم عناصر وجود میں آئے اردو، مشترکہ تہذیب اور ہندوستانی موسیقی۔

ہندوستانی موسیقی اور اردو، دو ایسے عناصر ہیں جنھوں نے ہندوستان کی قومی یک جہتی کو پروان چڑھایا۔ سرزمین ہندوستان پر یوں تو ہر سلسلے کے صوفیا نے اردو میں اپنی نگارشات یادگار چھوڑی ہیں لیکن چشتی صوفیا کی خدمات بہ نسبت دوسروں کے زیادہ ملتی ہیں۔

خانوادہ معین الدین اجمیریؒ کے صوفیا نے آپ کی تعلیمات کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا یہی وجہ ہے کہ حضرت بختیار کاکیؒ کے بعد حضرت فریدالدین گنج شکر نے اس روایت کو آگے بڑھایا فروغ دیا۔ چشتی صوفیا کے پیامِ یک جہتی کی اس سے زیادہ اور کیا مثال ہوسکتی ہے کہ حضرت فریدالدین گنج شکر کی قلمی نگارشات سکھوں کے گرو گرنت صاحب کا حصّہ ہیں۔ دراصل چشتیہ صوفیا کے پیام حقانیت اور انسان دوستی نے یہاں کے عوام کے دلوں کو فتح کیا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان صوفیا نے صرف اپنا ہی پیغام دیا ہو یا دین کی تبلیغ کی ہے انہوں نے جب اس سرزمین پر قدم رکھا تو یہاں کی صالح روایات کو بھی گلے لگایا۔ حضرت شکر گنج کے یہ دو شعر دیکھیے:

راول دیول ہمی نجا نے
پھا ٹا پنہا روکھا کھا ئے
ہم درویشنہ ایہی ریت
پا نو لو ریں ہور مسیت [1]

حضرت گنج شکر کے یہ سیدھے سادھے شعر ہیں لیکن غور فرمایئے تو دراصل صوفیا کے دستور عمل کو ان چار مصرعوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ راول اور دیول کا ذکر اس لیے اہم ہے کہ ایسے ہی مشترکہ عناصر کی یکجاہی سے قومی یک جہتی تشکیل پاتی ہے۔ حضرت فریدالدین گنج شکر سے متاثر ہوکر حضرت بہاءالدین باجنؒ فرماتے ہیں:

راول دیول ہم نہ پو چنہ
لو جہ لڑائی ہم نہ بو جنہ
بیٹے اچھے ٹھنڈی چھا نہ
جیسے کچہہ دیوئے سو ہی کھا نہ [2]

راہ حقیقت میں پانچویں منزل ترک احتیاج اور توکل کی ہوتی ہے اور چھٹی منزل محبت اطمینان اخلاص اور مراقبے کی ......چشتی صوفیا نے راہ حقیقت طے کرتے ہوئے ان دو منزلوں پر زیادہ زور دیا ہے کہ اس سے انسان دوستی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ حضرت فریدالدین گنج شکر اور حضرت بہاء الدین باجن نے اپنے اشعار میں انہی کیفیات کا بیان کیا ہے۔ شاہ بہاء الدین باجن، مقامی تہذیبی اثرات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ نعت شریف لکھتے ہوئے انھوں نے ہندو اساطیر سے استفادہ کیا ہے۔ ایک شعر دیکھیے:

محمدؐ جگ کا موہن رے
مصطفے جگ کا موہن رے [3]

جب ہم دوسری قوم کے تہذیبی عناصر کا احترام کرتے ہیں تو دراصل اپنی تہذیب، اپنے عقائد، اپنے طریقہ زندگی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔

دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور مضبوط بنیادوں پر قائم تھی۔ مسلمانوں کی حکومت میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ علما اور صوفیا اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے پر توجہ زیادہ مبذول فرماتے لیکن جب ہم چشتی صوفیا کی خدمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دکن کے وہ صوفیا جن کا تعلق خانوادۂ بندہ نواز سے ہے۔ ہندی اور ہندو تہذیب اور فکر و فلسفہ پر زیادہ توجہ فرمارہے ہیں یہی وجہ ہے کہ حضرت میرانجی شمس العشاق کے یہاں 'پنچ بھوگ' کا ذکر ملتا ہے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت برہان الدین جانم (970-1007ھ) کے یہاں ہندوستانی الاصل

فلسفہ اور ہندو اساطیر کا بیان ہوا ہے۔

برہان الدین جانم نے اپنی مثنوی ارشاد نامہ (996ھ) میں سمندر منتھن کا مضمون باندھا ہے۔ ہندو اساطیر میں 'سمندر منتھن' کا ذکر پرانوں میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ رامائن اور مہابھارت میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ سمندر منتھن کے نتیجہ میں جب امرت کے بجائے زہر برآمد ہوا تو اسے شیو شنکر نے پی لیا۔ شیو شنکر جنھیں ہم شیو کے نام سے جانتے ہیں۔ برہان الدین جانم فرماتے ہیں:

منتھن کر تجہ گھڑ یا ہوئے
جوں کے جھا را مائی دھوئے 4
یوں چا رونن میں پڑ یا بندھن
اس تھے گھڑ یا من منتھن 5

برہان الدین جانم کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنے والد کے حکم پر تین برس سفر میں گزارے اور مختلف صوفیوں اور سنتوں سے ملاقاتیں کیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ کی تخلیقات میں ہندو اساطیر اور ہندی تہذیب کے نقوش سب سے زیادہ ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم 'سکھ سہیلا' میں پنڈتوں کے پران پڑھنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ شعر دیکھیے:

پڑ پڑ پنڈت جنم گنوایا مورکھ رور ہیں سن ریچ
پُران پستک دیکھ' دھنڈولیں' بسے نرالا نیچ 6

اپنی ایک اور نظم میں جانم نے شیو کا ذکر کیا ہے:

بوج کر لیو کنت اپنا رے لال
بن شیو میرا کوئی نا کرے سنبھال 7

برہان الدین جانم کے فرزند حضرت امین الدین علی اعلیٰ نے بھی اپنی نظموں میں 'شیو' اور 'پاربتی' کے وسیلے سے مضامین بیان کیے ہیں۔ جیسے:

آدم ہوا سو پا ربتی
اتم ناری پاک سنتی 8

حضرت امین نے یہاں حضرت آدمؑ اور حوا کے ہمراہ شیو اور پاروتی کا ذکر کیا ہے۔ اس سے زیادہ اعلیٰ قسم کے مشترکہ تہذیبی نقوش اور کیا ہو سکتے ہیں۔ یہ وصف خصوصی صرف اردو کو حاصل ہے ہندوستان کی کوئی اور زبان اس طرح کے مشترکہ تہذیبی نقوش کو جاوداں زندگی عطا کرنے کا دعوا نہیں کر سکتی۔ حضرت امین الدین کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے تلاوت الوجود میں پہلی مرتبہ چار عناصر کے بجائے پانچویں عنصر کا بھی اضافہ فرمایا۔ آپ کے والد نے بھی پانچ عنصر کا ذکر 'ہوا' کے طور پر فرمایا ہے لیکن آپ نے 'خالی' یا 'آکاش' کا ذکر کیا اور انسانی وجود کے مطالعہ میں پہلی مرتبہ پانچواں عنصر شامل ہوا۔ حضرت امین نے اپنی اس فکر کو ایک منضبط صورت عطا کی اور پانچ عناصر پچیس گن کے نام سے مکمل دستور العمل مرتب فرمایا۔

حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے اس کارنامے کو استادِ محترم پروفیسر مجاور حسین رضوی 'فکری سطح' پر 'ہم آہنگی' پیدا کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

''فکری سطح پر بھی ہم آہنگی کی یہ کوشش بے حد اہم اور معنیٰ خیز ہے۔ اور اس تصور کے ڈانڈے 'لنگ آیت' فرقے کے عقائد سے ملتے ہیں۔ یہ وہ اہم موڑ ہے جس کی نشاندہی اس وجہ سے بھی ضروری سمجھی گئی کہ قاضی محمود دریائی اور شاہ علی جیو گام دھنی، بہاء الدین باجن کے یہاں لسانی پہلو نمایاں ہے۔ روایات، تلمیحات اور اصطلاحات ہیں۔ لیکن فکری سطح پر ہم آہنگی کی یہ کوشش قومی یک جہتی کے شعور کو ارتقائی شکل دینے والی ہے۔''9

حضرت میرانجی شمس العشاق، حضرت برہان الدین جانم اور حضرت امین الدین علی اعلیٰ نے فکری سطح پر جس انداز میں ہندوستانی تہذیب اور ہندو اساطیر کو اپنایا اور اسے ایک نئے اسلوب اور آہنگ کے ساتھ اپنی تخلیقات میں پیش کیا انھی عناصر نے ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی بنیادوں کو استحکام بخشا ہے۔ خانوادہ حضرت امین کے صوفی شاہ تراب چشتی ترونا ملی نے اسی روایت کو آگے بڑھایا اور اپنی نظم 'من سمجھاون' میں 'مہادیو' اور 'پاروتی' کے وسیلے سے موضوع کو وسعت عطا کی ہے 10 اور اپنی دوسری نظم گیان سروپ 11 میں برہما کو جبرئیل، وشنو کو میکائیل اور مہیش کو اسرافیل و عزرائیل سے مشابہ قرار دیا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ ہندوستان میں جن صوفیا نے مشترکہ تہذیب کے نقوش اپنے لسانی اجتہادات میں پہلے پہل بیان کیے ان میں پہلا اسم عالی حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کا ملتا ہے۔ آپ ہی کے اسلاف میں ایک نام ہمیں حضرت شاہ شاہد معروف کا ملتا ہے۔ جن کے اجداد پاک پٹن پنجاب سے الہ آباد، وہاں سے بیجاپور اور کرنول ہوتے ہوئے حیدرآباد تشریف لائے اور ضلع میدک کے ٹیکمال کو اپنی آخری آرام گاہ قرار دیا۔ حضرت شاہ شاہد ٹیکمالی نے بلا تفریق مذہب اپنی تعلیمات اور تلقین کا سلسلہ اپنایا یہی وجہ ہے کہ آپ کے مریدوں میں شام لال شاہدی اور چندر بھان میکش شاہدی کے نام ملتے ہیں۔

ہندوستانی موسیقی، ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی ایک بہت ہی مضبوط اور مستحکم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی آبیاری مسلمان صوفیا نے کی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر خسرو کی اختراعات کا ذکر صرف خانقاہی ادب ہی میں ملتا ہے، درباروں میں لکھی گئی تاریخی کتب میں تین سو برس تک ان کارناموں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ قدیم ہندوستان میں گیت اور بھجن گانے کا رواج تھا۔ جب ہم ہندوستانی موسیقی کی مشہور و معروف صنف نغمہ 'خیال' کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا ارتقا سہلا، جکری، حقیقت اور نقش کے ذریعہ ہوا ہے۔ یہی وہ گیت ہیں جن کے ذریعہ تین سو برس تک یعنی حضرت امیر خسرو (چودھویں صدی عیسوی) سے حضرت امین الدین علی اعلیٰ (سترھویں صدی عیسوی) تک مشترکہ تہذیب کی بنیادوں کو استحکام بخشنے کا فرض ادا کیا گیا۔ ہندوستان میں چشتی صوفیا کا یہ ایسا کارنامہ ہے جسے سنہری حروف میں لکھا جانا چاہیے۔

حوالے:

1. ابن فرید شیخ بہاوالدین باجن اور ان کا گجری کلام، ص 72
2. ایضاً
3. ایضاً
4. برہان الدین جانم 'ارشاد نامہ' مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی، ص 168
5. ایضاً ص 180
6. برہان الدین جانم 'سکھ سہیلا' مخطوطہ مخزونہ اندھرا پردیش مینوسکرپٹ لائبریری، جامعہ عثمانیہ شاملات نمبر 587
7. بحوالہ تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر جمیل جالبی جلد اول ص 209، جنوری 1984
8. ڈاکٹر حسینی شاہد 'امین الدین علی اعلیٰ اور ان کے خلفا کی اردو خدمات' ص 286
9. پروفیسر سید مجاور حسین رضوی 'اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر' ص 109
10. شاہ تراب چشتی 'من سمجھاون' مرتبہ سیدہ صفیہ ص 2، 1964
11. شاہ تراب چشتی 'گیان سروپ' مرتبہ پروفیسر نورالسعید اختر، ص 70 مطبوعہ رسالہ نوائے ادب، جنوری 1970

Dr. Habib Nisar, Dept. of Urdu, University of Hyderabad (Tln)

رفعت سعید قریشی

غارہائے ایلورہ

فن سنگ تراشی کا ایک قابل قدر کارنامہ

جس طرح آرٹ کے ماہرین و ناقدین نے فنِ تعمیر، سنگ تراشی اور مصوری پر ہمیشہ خصوصی توجہ دی ہے اسی طرح فن کاروں نے بھی اپنی ہنرمندی پر غیر معمولی دسترس حاصل کرکے آرٹ کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی۔ ہنر مندوں کے اس عزم اور ذوق عمل نے سرزمین دکن کو جس عظیم ورثہ سے مالا مال کیا ہے وہ شہر اورنگ آباد (دکن) سے تقریباً 29 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایلورہ کے مشہور غار ہیں یہاں پتھروں کے سینے میں تصورات کے پیکر تراشنے والے فن کاروں نے اپنے کمال فکر کے جو انمٹ نشان چھوڑے ہیں ان کا ہر نقشِ عمل یقیناً ایک شاہکار ہے۔ جن سیاحوں نے ایلورہ کی سیاحت کی ہے انھوں نے اپنے سفرناموں میں اسے ایک عجوبہ قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ غارہائے ایلورہ کا شمار عالمی ورثہ یعنی World Heritage میں ہوتا ہے۔ تین مختلف عقائد کے پیروکاروں نے یہاں جملہ 34 غار تراشے ہیں۔ جن میں ابتدائی 12 غار بدھ مت، سے تعلق رکھتے ہیں، درمیان کے 17 غار 'ہندو مت' اور آخر کے 5 غار 'جین مت' کے ہیں ان غاروں میں تراشی گئی مورتیاں اپنی مخصوص فن سنگ تراشی کی بدولت آسانی سے شناخت کی جاسکتی ہیں۔ 'بدھ مت' کی سنگ تراشی کے نمونے نسبتاً زیادہ قدیم ہیں۔ سانچی، بارہوت، بھاجہ، اجنتا، کانڈن کارلا اور امراوتی کی مورتیاں اور کاریگری اس کا ثبوت ہیں۔ ان غاروں میں ہم مہاتما بدھ کی قد آدم یا پھر اس سے بھی بہت بلند مورتیاں دیکھتے ہیں۔ مہاتما بدھ جنھوں نے بدھ مذہب کی بنیاد ڈالی، ایک انتہائی رحم دل انسان تھے، بحیثیت شہزادہ وہ جب بھی اپنے محل سے باہر نکلے، انھوں نے غم زدہ انسانیت کا مشاہدہ کیا۔ کبھی کسی ضعیف العمر کی بے بسی دیکھی تو کبھی کسی مریض کی تکلیف کو محسوس کیا اور کبھی انسانی موت کا نظارہ کیا۔ بالآخر انھوں نے پایا کہ انسانی زندگی غموں کا مجموعہ ہے۔ آہ! یہ زندگی کس قدر تکلیف دہ ہے۔ اسی غم حیات کی ترجمانی غالب نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اور اب مہاتما کو یہی صرف فکر لاحق تھی کہ کس طرح انسان کو غموں سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ جو لوگ حادثاتِ دنیا کو قریب سے دیکھتے ہیں اور اس کی تکلیفوں کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں ان کے سینے میں یقیناً ایک دردمند دل ہوتا ہے۔ اس دردمند دل کو لیے شہزادہ سدھارتھ نے جنگل کی راہ لی اور مراقبے کیے۔ مہاتما بدھ کی زندگی کے اس حصے کو ایلورہ کے غاروں میں بڑی مہارت اور فن کی تمام تر باریکیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انھیں یہاں مختلف 'آسنوں' میں دکھایا گیا ہے۔ کبھی مراقبہ میں اور کبھی درس دیتے ہوئے۔ غرض ماہر سنگ تراشوں نے یہاں بدھ کی ہر مورتی کو اس قدر ماہرانہ چابکدستی کے ساتھ تراشا ہے کہ ہر مورتی ایک شاہکار کی صورت میں نظر آتی ہے۔ چہرے کی غیر معمولی جاذبیت اور ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی سی لکیر یوں محسوس ہوتی ہے گویا ہونٹوں سے نغموں کا رس ٹپک رہا ہو۔

'بدھ مت' کی نمائندگی کرنے والے غاروں میں ہم دو طرح کے غار دیکھتے ہیں جو دو مختلف دور کی تخلیق ہیں۔ ان میں اک 'ہن یانا' کہلاتا ہے اور دوسرا 'مہایانا'۔ اسی طرح استعمال کی نوعیت کے اعتبار سے بھی انھیں دو اقسام میں دیکھا جاتا ہے۔ ایک چیتیا یعنی عبادت گاہ اور دوسرا وہارا یعنی اقامت گاہ۔ وہارا غاروں میں غار نمبر 5 سب سے بڑی اقامت گاہ ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں بنائی گئی۔ یہ اقامت گاہ 117 فٹ لمبی اور 58 فٹ چوڑی ہے۔ غار نمبر 6 بھی ساتویں صدی عیسوی کا ایک وہارا ہے۔ یہاں یکشا اور تارا کی مورتیاں بڑے سلیقے سے تراشی گئی بطور خاص ان کی پوشاک اور زیورات کی بناوٹ قابل ستائش ہے۔ دیوار کے سیدھے جانب مہامیوری کی خوبصورت مورتی ہے۔ سر پر تاج، گلے میں نیکلس، کانوں میں آویزے اور ہاتھ میں کنگن، مورتی کو ایک شاہکار کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ یہ پوشاک اور زیورات اس زمانے کے رسم و رواج، وضع قطع اور خوش پوشی کی گواہی دیتے ہیں۔ مندر کے دونوں جانب دوار پالا اس کھڑے ہیں۔ سیدھے ہاتھ میں تسبیح اور بائیں ہاتھ میں کنول کا پھول تھامے اوالوکیتیشورا کی بڑی مورتی ہے اور دائیں جانب کی مورتی غالباً منی دھارا کی ہے۔ بدھ مت کے 12 غاروں میں غار نمبر 10 کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نہ صرف ایک عبادت گاہ ہے بلکہ اقامت گاہ بھی۔ جنوبی ہند میں تراشے گئے چیتیا غاروں میں یہ نسبتاً جدید ہے۔ مقامی لوگ اسے ستار کی جھونپڑی بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس کی چھت لکڑی نما شہتیروں کی طرز پر بنائی گئی ہے۔ اس غار کو وشوکرما کا نام دیا گیا ہے۔ غار کا بیرونی حصہ کافی خوشنما ہے۔ اس میں ایک گیلری ہے۔ غار کے بیرونی حصے میں ایک بڑا استوپ ہے اور اسی سے منسلک مہاتما بدھ کی مورتی بھی۔ اسی طرح یہ 'ہن یانا' اور 'مہایانا' کے خوبصورت آمیزش کے روپ میں بھی دیکھا جاتا ہے۔

غار نمبر 13 سے ہندو مت کے غاروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو غار نمبر 29 پر ختم ہوتا ہے۔ ان غاروں میں غار نمبر 17 جو 'کیلاش' کے نام سے مشہور ہے، ایلورہ کے بھی غاروں میں سب سے اہم اور بڑا ہے۔ یہاں پر فن تعمیر، فن سنگ تراشی اور مصوری کے شاہکار نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ ایک بڑی چٹان پر تراشا ہوا یہ دنیا کا سب سے بڑا غار مانا جاتا ہے جو فن سنگ تراشی اور فن تعمیر کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہی نہیں بلکہ آرٹ کی دنیا کا ایک عجوبہ بھی ہے۔ مشہور زمانہ یہ غار کرشنا اول کے حکم پر تراشا گیا تھا۔ یہ دراصل پٹاڈکل کے اس مندر کے نمونے پر بنایا گیا ہے جو ویروپیکشا کے نام سے مشہور ہے۔ اموگھاورشا چہارم کے تانبے کے کتبات پر بھی کیلاش کا ذکر ملتا ہے۔ ایک پتھر سے تراشے گئے اس عظیم الشان مندر کی بیرونی دیوار پر کچھ محافظ مورتیاں دکھائی

دیتی ہیں گویا یہ کیلاش کی حفاظت کے لیے مامور گئے ہوں۔ اس کے بعد جیسے ہی ہم اندر داخل ہوتے ہیں سامنے کی دیوار پر دیوی گجالکشمی کی مورتی اور چاروں جانب چاردوار پالاس دیکھے جاسکتے ہیں۔ بائیں جانب کی دیوار پر جوسین دکھایا گیا ہے اس کا عنوان 'نیکی کی برائی پر فتح' ہے۔ نیکی اور برائی کی اس جنگ میں دیوی درگا، مہیشا سورمردنی نامی راکشش پر فتح پاتی ہیں اس پینل کے قریب شری وشنو کو اپنے وہاں گروڑا پر بیٹھے دکھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسرا منظر محبت کی دیوی اور دیوتا رتی اور مدن کا ہے جن کے درمیان ایک گنّا دکھایا ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسرا منظر محبت کی دیوی اور دیوتا رتی اور مدن کا ہے جن کے درمیان ایک گنا دکھایا ہے۔ یہ ایک علامتی نشان ہے۔ گنا جو محبت اور مٹھاس کی علامت ہے۔ فن کاروں کا اپنے فن کو اس طرح تمثیلی پیرائے میں پیش کرنا فنکاروں کی طرز جدت کو ظاہر کرتا ہے۔

کیلاش کے اس مرکزی مندر کی دو جانب کی دونوں دیواروں پر ہندومت کے دو مشہور رزمیے یعنی رامائن اور مہابھارت کو بڑی خوبصورتی سے تراشا گیا ہے۔ ہر دو جنگوں کی تفصیلات کو بڑی باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔ مندر کے وسیع و عریض صحن میں ہر دو جانب دو ستون نصب کیے گئے ہیں جو دھوج اسمتھ کہلاتے ہیں۔ کیلاش کی مرکزی عمارت کو ایک رتھ کی شکل دی گئی ہے۔ عمارت کے اس حصے کے دونوں جانب زینے تراشے گئے ہیں جو اوپری منزل کی طرف لے جاتی ہے۔ اس اوپری منزل کے ایک جانب ایوان ہے جس میں نندی نصب ہے اور دوسری جانب وہ مقدس بارگاہ ہے جہاں شیولنگ کی تنصیب کی گئی ہے۔ یہ 16 ستونوں پر ٹکا ہوا ایک بڑا ایوان ہے جس کی دیواروں پر سنگ تراشی اور مصوری کے خوبصورت شاہکار ایوان کو مزید وقار عطا کرتے ہیں۔ کیلاش نے فن تعمیر اور فن سنگ تراشی میں سب پر سبقت حاصل کرلی ہے۔ خصوصاً سنگ تراشی کے شاہکار مجسموں میں راون کا کیلاش پربت کو ہلانے کا سین بڑی مہارت اور خوبصورت سے تراشا گیا ہے۔ اس منظر میں شری شیو اور دیوی پاروتی کو کیلاش پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان کے ساتھ خادمائیں اور کچھ بونے بھی دکھائے گئے ہیں۔ 'اپسرا' اور 'گندھراوا' کی بھی شمولیت ہے۔ اس پینل میں راون اپنے دس سروں کی مدد سے پوری طاقت کے ساتھ کیلاش پربت کو ہلانے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ فنکاروں نے اس منظر کو جس حقیقت پسندی اور اصلیت کا روپ دیا وہ یقینا قابل ستائش اور آرٹ کی دنیا کا ایک بہترین شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ راون کے چہرے کے تاثرات اور جسمانی قوت کی آزمائش کا مظاہرہ، مجسمہ سازی میں حقیقت پسندی ایک اچھی مثال ہے۔ کیلاش پر بیٹھے ہوئے دیوی پاروتی کو کسی قدر فکرمند دکھایا گیا ہے جب کہ شری شیوا اپنے چہرے کے تاثرات سے مطمئن اور بے خوف دکھائی دیتے ہیں۔ ماہر سنگ تراشوں نے اپنے زورِفن سے یہاں عورت کی فطری اور بے میل معصومیت کی کشش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ایسے مناظر دیکھ کر ناظر دیوی، دیوتاؤں کی حکمت و دانش، تقدس اور رموز معرفت سے روشناس ہوتا ہے۔

کسی خاص منظر یا حالت یا واقعہ کو فن سنگ تراشی میں ظاہر کرنا ہو اور وہ بھی اس خیال کے ساتھ کہ دیکھنے والے کے دل پر یہ ایک خاص اثر پیدا کرے، یہ عزم کسی بھی مصور یا سنگ تراش کی اپنے فن کی جدت، لگن، جستجو اور محنت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ واقعہ کو اصلیت کا روپ دینا اور اس میں دلکشی پیدا کرنا ہی کسی فن کار کے فن کی معراج ہے۔ اب اگر ہم اس پینل میں فن کی سادگی پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس منظر میں کہیں بھی کوئی غیر ضروری فیگرس نہیں ہیں۔ اس طرح فن میں طرز ادا کی کوئی

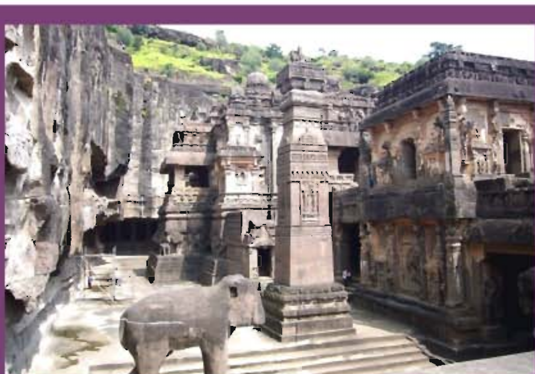

پیچیدگی بھی نظر نہیں آتی اور ناظر منظر کو بخوبی سمجھ لیتا ہے۔

غارہائے ایلورہ پر شعرا نے کئی نظمیں لکھیں۔ ان کی خوبصورت کاریگری پر ایک شاعر عدیل نے اپنے خیالات یوں قلمبند کیے ہیں:

ہزاروں برس کی ہیں یہ مورتیں
مگر ہیں عجب خوشنما صورتیں
جو ہے سامنے کوہ گردوں وقار
اسی کے تلے ہیں ایلورہ کے غار
بنایا عجب طرح کا بت کدہ
جسے دیکھ کر ہیں سب حیرت زدہ

کیلاش کی مرکزی عمارت پر ہاتھی اور گھوڑوں کی ایک قطار دکھائی دیتی ہے۔ انھیں جس قرینے اور سلیقے سے تراشا گیا ہے اس پر شاعر یوں گویا ہے:

قرینے سے ہیں سب بلند و پست
کہیں شیر غراں کہیں فیل مست
چکارے کہیں اور کہیں ہیں ہرن
کہیں ریچھ، بندر، کہیں مرد و زن
غضب کے تھے صناع یہ سنگ تراش
پہاڑوں پر کیں یہ خراش و تراش

کیلاش کی سیر کے بعد ہم ایک اور ہندو غار کی سیر کریں گے۔ یہ غار نمبر 21 ہے جو رامیشورا کہلاتا ہے۔ یہ آٹھویں صدی عیسوی میں تراشا گیا تھا۔ بیرونی دیوار پر ہاتھیوں کی ایک لمبی قطار دکھائی گئی ہے۔ یہیں پر ایک اور اہم اور مشہور مورتی گنگا کے نام سے منسوب ہے۔ فنکاروں نے گنگا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور بالوں کی خوبصورت سجاوٹ سے اس مجسمہ کو ایک شاہکار بنادیا ہے۔ گنگا کے بازو ایک بالشتیہ ہے جس پر گنگا نے اپنا سیدھا ہاتھ رکھا ہے۔ یہ آرٹ کا ایک حسین شہ پارہ ہے۔

غارہائے ایلورہ کے تیسرے اور آخری حصے میں جین مت کے 5 غار شامل ہیں جو کیلاش سے تقریباً 4 فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان غاروں کی پہلی کڑی غار نمبر 30 ہے جو چھوٹا کیلاش کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس کی طرز فن کاری میں کیلاش کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس غار کی لمبائی 130 فٹ اور چوڑائی 80 فٹ ہے۔ سیدھے جانب 3 تیرتھنکاروں کے مجسمے ہیں۔ پہلے تیرتھنکار پدماسن میں دھان مدرا یا مراقبہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے سر پر چھتری ہے اور دونوں جانب خدمت گار ہیں۔ اسی طرح دو اور تیرتھنکار بھی اسی طرز پر دکھائے گئے ہیں۔ اوپری منزل کا مرکزی ہال 16 ستونوں پر ٹکا ہوا ہے۔ ان ستونوں پر خوبصورت نقش تراشے گئے ہیں جو عمدہ اور نفیس کارگری کے حسین شہ پاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس مرکزی ہال میں 22 تیرتھنکاروں کو پدماسن میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے جو مراقبہ میں مصروف ہیں۔ یہیں پر سامنے کی دیوار پر بھگوان پارشوناتھ کی ایک بڑی مورتی ہے۔ بارگاہ کے اندرونی حصے میں شری مہاویر کو ایک تخت پر پدماسن میں مراقبہ کیے ہوئے بتایا گیا ہے۔

بدھ، ہندو اور جین عقائد کے یہ 34 غار برسہابرس سے آرٹ اور فن کے شیدائیوں کو مسلسل اپنی طرف راغب کیے ہوئے ہیں۔ استاد فنکاروں نے اپنے فن تعمیر، مصوری اور سنگ تراشی کے کمال سے ایک انمول شاہ کار تخلیق کیا ہے جو ایلورہ کہلاتا ہے۔ ایلورہ کے ان گمنام فنکاروں کو مرحوم سکندر علی وجد نے اپنی نظم، ایلورہ میں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

عظیم عزم تھے جاں باز نقش کاروں کے
خزاں کی فکر نہ ارمان تھے بہاروں کے
دلوں میں خواب تھے بیدار کوہساروں کے
نظر عقاب کی تیشے تھے برق پاروں کے
تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دیے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں

■

Rifat Sayeed Qureishi, Plot No. 4, Professor Colony, Dehli Gate, Aurangabad (MS)

کیریئر

اردو اور روزگار کے 21 نکات

ثروت خان

آج ہمارے تعلیمی اداروں اور طلبہ دونوں کا واحد مقصد اس طرز پر آکر ٹھہر گئی ہے، جس طرز پر انگریزوں نے اسے قائم کیا تھا ان کا فرمان تھا کہ:

''ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں، بلکہ ہم اس قدر تعلیم کے خواہاں ہیں، جو امورِ معاش سے علاقہ رکھتی ہے۔''

جبکہ بات یہ بھی اہم ہے کہ قدرت نے بچہ کو جن صفات سے نوازا ہے، اس کو مناسب تحریک دینا تعلیم کا پہلا فریضہ ہے اور ان صفات کو اجاگر کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہو، ان کا مہیا کروانا، تربیت ہے، لیکن کیا کریں کہ ہمارے یہاں تو اب تک ناخواندگی کا مسئلہ قوم کا ایسا مسئلہ بنا ہوا ہے، جو اب تک پوری طرح سے حل نہ ہو سکا۔ کسی بھی ملک کے اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کے لیے تعلیم کو فروغ اور اس کے معیار کو قائم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں زبانوں کا مسئلہ اگر ہے بھی تو وہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے — اصل اور اہم بات یہ ہے کہ ہماری Higher Education بڑے دردناک مرحلے پر ہے — ہم سبھی جانتے ہیں کہ اس وقت ہمارے ملک میں نوجوانوں کی تعلیم میں حصہ داری 14 فیصد سے بھی کم ہے۔ یہ تشویشناک پہلو ہے۔ ممبئی یونیورسٹی کے 150 برس مکمل ہونے پر ڈاکٹر من موہن سنگھ نے قبول کیا کہ

''ہندوستان کی دو تہائی یونیورسٹیاں اور نوے فی صد کالج اوسط سے نیچے کے لیول پر کام کر رہے ہیں۔''

اس صورت حال کو منظم کرنے کے لیے گیارہویں پنچ سالہ اسکیم کے تحت 2.800 کروڑ روپے لگا کر بین الاقوامی معیار پر مبنی 14 یونیورسٹیاں کھولنے کا فیصلہ کیا تھا — یہ اور بات ہے کہ ملک میں آئی آئی ایم، یونیورسٹیاں اور متعدد کالج کھلنے کا سلسلہ جاری ہے لیکن زیادہ تر کے پاس اپنی خود کی عمارت تک نہیں ہے — (؟؟؟) — لیکن سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان 'معیاری یونیورسٹیوں' میں اردو طلبہ کے اعداد کا تناسب کتنا ہے اور کتنا ہوگا۔

اس کا جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ آج مکمل طور پر ہم اس بات کا اعتراف نہیں کر سکتے کہ اردو معاشرہ دیگر معاشروں کے ساتھ تعلیمی، سماجی اور اقتصادی اور معاشی طور سے ہم آہنگ ہے یا نہیں، کیونکہ خاص ماحول اور حالات کے تحت اردو طلبا میں چھ تا چودہ برس کی عمر کے بچوں میں اندازاً پچاس فی صد اسکول نہیں جاتے اور باقی پچاس میں بھی پچیس فی صد غریبی اور خاندانی مطالبات کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں — یعنی کچھ عمر میں ہی اسکول چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور باقی پچیس فیصد میں سے اکتا کر یا فیل ہونے کے ڈر سے تعلیم ترک کر دیتے ہیں — آخر میں صرف پانچ فیصد اعلیٰ ثانوی درجوں تک پہنچتے ہیں اور پڑھے لکھوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ایسے میں اردو والوں میں اندازاً پانچ میں سے تین ناخواندہ نکل آئیں گے، جبکہ مقابلہ جاتی امتحانات ہوں یا ٹکنالوجی فیلڈ یا Job oriented کورسیز ہوں — ان سب میں شرکت کی پہلی شرط ہے گریجویشن ہونا — پھر امتحانات اور کورسیز کا معیار بھی بہت بلند ہوتا ہے اور امیدواروں کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے، ایسے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سخت محنت ومشقت کی ضرورت ہوتی ہے اردو طلبا کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ان کی علمی و ادبی صلاحیتیں اول تو ماحول، معاشرہ اور حالات کے سبب دبنے سے ویسے ہی کم ہوتی ہیں، کیونکہ جن پانچ فیصد کا اوپر ذکر آیا ہے، ان میں سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طلبا سائنس، کامرس میں چلے جاتے ہیں، جہاں ذریعہ تعلیم اردو کے بجائے انگریزی ہو جاتا ہے، ان میں سے کچھ انگریزی زبان وادب اور دیگر آرٹس مضامین کی طرف رجوع کر لیتے ہیں۔ باقی بچے اردو میں داخلہ لے لیتے ہیں اور یہیں سے بڑھ جاتی ہے اردو اساتذہ کی ذمے داری اور طلبا کی فکرمندی —

کیونکہ روایتی نظام اور انداز کی طرز پر درس وتدریس دینے

والے اساتذہ کے لیے تعلیمی لیاقت کا معیار یعنی محض بی ایڈ ایس ایس سی، ایس ٹی سی وغیرہ جیسے کورسیز کی ٹریننگ لے کر چھوڑ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اساتذہ کو خود اپنی معلومات میں مسلسل اضافہ کرتے ہوئے، نئی تکنیک سے تعلیم دینے کی خو پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ اردو طلبا میں جوش وخروش اور خود اعتمادی کی تخم کاری کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ اردو طلبا کا یہ یقین کہ as a subject اردو ہماری نیا اس لیے پار لگا دے گی کہ اس کے ساتھ گورنمنٹ کی کچھ ہمدردیاں منسلک ہیں بلکہ انھیں اس بات کا یقین دلانا ہوگا کہ کسی بھی زبان کو اس لیے سیکھنا، اس لیے پڑھنا کہ اس کے سہارے تلاشِ معاش میں ہمواریاں نصیب ہو جائیں گی، غلط ہے۔

دراصل انسان کو بلندی اور کامیابی ہموار راستوں پر چل کر حاصل نہیں ہوا کرتی بلکہ اس کے لیے صبر کے ساتھ دشوار مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہوتا ہے، حوصلہ رکھتے ہوئے کوہ کن بننا پڑتا ہے۔ مجنوں کی طرح جنونی ہونا پڑتا ہے۔ رومانی و جمالیاتی حس کے ساتھ، حقیقت سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اسمارٹ اور قوتِ ارادی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ علم وعمل میں استحکام، فہم میں وجدان و آگہی کی شان و، شعور میں پختگی و رعنائی کے باہم جمنا سے مٹکی بھری جاسکتی ہے — سب کچھ حکومت پر چھوڑ دینا یا محض تقدیر کے سہارے رہنا بھی بے عملی کے مترادف ہے۔ اس لیے چند ایسے نکات پر غور کرنا نہایت ضروری ہے جو موجودہ صورتِ حال میں اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والی ہماری نوجوان نسل کو معاشی اعتبار سے مضبوط بنائے:

(1) الیکٹرانک میڈیا: 800 سے 1000 چینل ہیں — جن میں اردو بولنے والوں کی ضرورت ہے۔

(2) پرنٹ میڈیا: اخبارات ورسائل دورِ حاضر میں اس قدر شائع ہو رہے ہیں کہ شاید ہی اس سے قبل کبھی ہوئے ہوں۔ چنانچہ یہ میدان کھلا ہے۔

(3) پریس، کتابت، کمپوزنگ: یہ میدان بھی خالی سا ہے۔

(4) یونین پبلک سروس کمیشن: حکومتِ ہند کا وہ ادارہ ہے جو مرکزی حکومت کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ عہدوں کے لیے افسران کا انتخاب کرتا ہے، اس کا میڈیم اردو لیا جاسکتا ہے۔ ان سول سروسیز کے امتحان اٹھائیس مختلف قسم کی سروسیز کے لیے ہوتے ہیں جنھیں مجموعی طور سے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروسیز (IAS) کہا جاتا ہے، اسی طرح صوبائی سطح پر بھی اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن کے تحت امتحانات دے کر افسر بنایا سکتا ہے:

(6) درس وتدریس: روایتی انداز کے 'ٹیچر' نہ بنیں۔ اردو کے بڑے ادیبوں کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ تاریخی معلومات میں اضافہ کرنا چاہیے۔ دیگر زبان وادب کا مطالعہ برابر کرتے رہنا ضروری ہے۔ صرف ڈگریاں لے کر کام چلانے سے نہ عزت ملتی ہے نہ شہرت۔

(7) ایک پیشہ ایک روزگار نہیں، بلکہ آمدنی کے دیگر ذرائع بھی استعمال کر کے حیثیت بنائی جاسکتی ہے لیکن اس کے لیے سخت محنت ومشقت لازمی ہے۔

(8) طبی میدان: اردو میڈیم سے یونانی ڈاکٹر بھی بنا جاسکتا ہے اور یونانی دواؤں کا کاروبار بھی کیا جاسکتا ہے۔

(9) ٹرانسلیٹر /مترجم: اردو سے انگریزی ودیگر زبانوں سے اردو/ ہندی۔

(10) خطاط: فن خطاطی کا کورس کر کے اپنا خود کا کام کیا جاسکتا ہے۔

(11) دیگر کورسیز: اردو میں MBA کی ڈگری، فیشن ڈیزائنر کا کورس، ٹیکس ٹائل وغیرہ کے فیلڈ میں جاسکتے ہیں۔

(12) فلم/ نغمہ نگار/ ویڈیو/ آڈیو: اردو غزل گوئی/ قوالی/ چار بیت/ ڈی جے/ بینڈ/ کیٹرنگ گروپ وغیرہ بنا کر پروگرام دیے جاسکتے ہیں۔

متذکرہ 21 نکات کے لیے اردو زبان و ادب کے مطالعے کے ساتھ بے حد ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان انگریزی کی تعلیم کو بھی اہمیت دیں اور دیگر زبانوں کی بھی شد بد رکھیں۔ آل راؤنڈر بنیں اور اس کے لیے صف شکنی اور شہسواری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلند حوصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ نکات اور آئیڈیاز ہیں جنھیں اپنا کر اردو کا طالب علم بہتر نظامِ زندگی کے راز کو پاسکتا ہے۔ فکرِ معاش سے نجات حاصل کرسکتا ہے اور بجائے احساسِ کمتری کے، فخر سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اردو زبان روزگار میں کہیں Hardal نہیں بنتی۔

(13) انٹیریئر ڈیکوریشن: تہذیبی وتاریخی کتب سے آئیڈیاز مستعار لیے جاسکتے ہیں۔ میوزیم اور آرکائیوز میں سنجوئی وراثت سے بھی سیکھا جاسکتا ہے لیکن اس کی نقل میں عقل اور تخیل میں جدت پیدا کر کے کچھ نیا کیا جاسکتا ہے۔

(14) مذہبی مقرر/ ذاکر/ خطیب: بہت سے چینل ہیں، بہت کام ہے۔ میدان تقریباً خالی ہے۔

(15) لکھنؤ اور دہلی دسترخوان کی طرز پر نئے نئے کھانے/ مشروب/ اچار/ مربے/ بٹن وغیرہ میں اردو کی تہذیب وتمدن کا سہارا لے کر Heritage کا روپ دے کر Antic اور یونیک کیا جاسکتا ہے۔

(16) فیشن ڈیزائننگ/ بٹیک: داستانوں، مثنویوں، میوزیموں میں لباس، آرائش وزیبائش کا خوب ذکر ہے، اس میں تخیل کا سہارا لے کر کچھ نیا کیا جاسکتا ہے کیونکہ پرانا ہی آج نیا ہے۔

(17) قرآن/ احادیث/ اردو سکھانا/ ڈپلوما کورسیز/ اسکول کھولنا: ان کو کریئر کے روپ میں اپنایا جاسکتا ہے۔ پاش ایریا میں گھر گھر جاکر، یا خود اپنے گھر پر بھی اس کا بہترین اہتمام کرسکتا ہے۔ صاحبِ حیثیت خاندانوں کو اپنے بچوں کے لیے ان اساتذہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

(18)Organizar کے روپ میں کریئر بنایا جاسکتا ہے۔ پروگرام کروانے کے ذمہ لیں — اردو کی کتب کے علاوہ دیگر زبان وادب کی کتب کے رسم اجرا، مشاعرے، اعزازیے، شامِ غزل وغیرہ کے اہتمام، انتظام کے لیے آن لائن آرڈر لیے جاسکتے ہیں۔ اپنا آفس بھی کھولا جاسکتا ہے۔ ابتدا چھوٹے پیمانے پر کی جاسکتی ہے۔

(19) اشتہار: اشتہار تیار کریں۔ نعرے تیار کریں، تک بندی اور اردو شاعری سے مدد لی جاسکتی ہے۔ جس میں زبان کا سلیقہ بھی شامل ہے۔

(20) قصہ گو/ نظم گو: اردو کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو قصہ گوئی کی طرز پر تیار کر کے بچوں کو دلچسپ انداز میں سنانے والا گروپ بنایا جاسکتا ہے۔ بچوں کی نظمیں بھی اسی انداز میں پڑھ کر سنانے کا رواج عام کیا جاسکتا ہے۔

(21) بیوٹی پارلر/ جڑی بوٹی بزنس: خود اپنا بیوٹی پارلر لیکن روایتی طرز سے علاحدہ یعنی شہناز حسین کی طرز پر سخت محنت اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتے ہوئے صبر طلبی سے۔ جڑی بوٹیوں، نانی دانی کے نسخوں وغیرہ اور کچھ جدید ادویات کا سہارا لے کر کام شروع کیا جاسکتا ہے۔ خوشبو دار صابن، ابٹن، فیس پیک تیار کیے جاسکتے ہیں۔ ایلوویرا کی کھیتی، جڑی بوٹیوں کی کھیتی اپنی چھت پر بھی کی جاسکتی ہے۔ بڑی کمپنیوں سے آرڈر لیے جاسکتے ہیں۔ یعنی اردو پڑھنے والا طالب علم کوئی سا بھی بزنس کرسکتا ہے۔ تجارت میں محنت، ایمانداری اور صبر طلبی مخصوص ہے۔

متذکرہ 21 نکات کے لیے اردو زبان وادب کے مطالعے کے ساتھ بے حد ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان انگریزی کی تعلیم کو بھی اہمیت دیں اور دیگر زبانوں کی بھی شد بد رکھیں۔ آل راؤنڈر بنیں اور اس کے لیے صف شکنی اور شہسواری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلند حوصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ نکات اور آئیڈیاز ہیں جنھیں اپنا کر اردو کا طالب علم بہتر نظامِ زندگی کے راز کو پاسکتا ہے۔ فکرِ معاش سے نجات حاصل کرسکتا ہے اور بجائے احساسِ کمتری کے فخر سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اردو زبان روزگار میں کہیں Hardal نہیں بنتی۔

■

Sarwat Khan, 76. OTC, Scheme, Radison Hotel Road, Malla Talai Udaipur - 313001(Raj)

جلیل احمد

طب میں علاج بالتدبیر کی اہمیت

طب کا مقصد تحفظ صحت و ازالہ مرض ہے، فلسفہ طب امور طبیعیہ سے شروع ہوتا ہے جس سے مراد بدن کے امور جس پر بدن انسان قائم و دائم ہے۔ جسم کی بنیاد میں مادی، صوری وتمامی اسباب شامل ہیں جس کا اعتدال پر پایا جانا ضروری ہے جس پر صحت کا انحصار ہے۔ جسم میں مزاج اور اخلاط اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں، انھی کی غیر اعتدالی کیفیت سے مادہ مرض مناسب ماحول پا کر حاد و مزمن امراض کا سبب بنتا ہے۔ فلسفہ علاج میں یہی کوشش کی جاتی ہے کہ مادہ مرض کا اجتماع نہ ہو اگر ہو جائے تو جلد از جلد اس کا امالہ یا تنقیہ ہو جائے۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو علاج بالتدبیر کافی اہم رول انجام دیتا ہے، جس کی مدد سے ہم طب کے مقصد کو آسانی سے پا سکتے ہیں۔ علاج بالتدبیر جو کئی طریقوں پر مشتعل ہے، جس میں پرہیز، تدبیر (طریقہ)، دوائیں ان تمام بنیادی اصولوں کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

طب یونانی میں علاج و معالجہ کے تعلق سے جن طریقوں کا ذکر طب کی معتبر اور مستند کتابوں میں ملتا ہے ان کی تعداد تین ہے۔ جس کو شیخ الرئیس بوعلی سینا نے اپنی کتاب 'القانون فی الطب' میں ذکر کیا ہے۔ علاج بالتدبیر والتغذیہ، علاج بالدوا، علاج بالید۔ علاج کے طریقوں میں بھی علاج بالدوا و علاج بالید سے پہلے علاج بالتدبیر کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ ظاہر ہے جسم کو زیادہ سے زیادہ دواؤں سے دور اور طبیعت کی زیادہ سے زیادہ معاونت کرنے کے لیے ازالہ مرض کے سلسلے میں علاج بالتدبیر کا ذکر پہلے ہونا ہی چاہیے۔

علاج کے تینوں طریقوں سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر مرض کے ازالے کے لیے ان تمام طریقوں کو استعمال کرنا ضروری ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تینوں امور کے علاوہ کسی چوتھی چیز یا طریقے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انتخاب امور بمطابق مادہ مرض، نوعیت، شدت وکیفیت پر منحصر ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ کسی ایک مرض کے علاج میں کسی ایک یا دو طریقوں کے استعمال سے بھی کام چل سکتا ہے اور بیک وقت تینوں کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

طریقہ انتخابِ امر کی طرف نظر ڈالی جائے تو فلسفہ طب کا بنیادی نظریہ ذہن میں آتا ہے، صحت و مرض کے تعلق سے طب کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر حالت بدن کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوگا بغیر کسی سبب کے کوئی حالت بدن پیدا ہی نہیں ہوسکتی جیسا کہ جسم کی بنیاد میں (امور طبیعیہ) مادی، صوری وتمامی اسباب شامل ہیں بالکل اسی طرح حالت بدن (صحت ومرض) کے لیے اسباب ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ انہی اسباب کی بنا پر صحت قائم رہتی ہے اور جب ان اسباب میں کسی قسم کا خلل واقع ہوتا ہے تو امراض ظہور پذیر ہوتے ہیں، ان اسباب کو طبی اصطلاح میں اسباب ستہ ضروریہ (ہوا، ماکولات ومشروبات، حرکت وسکون بدنی، حرکت وسکون نفسانی، نوم و یقظہ، احتباس و استفراغ) کہتے ہیں۔ حالتِ صحت میں یہ اسباب بدن کی طبعی حالت کو قائم رکھ کر صحت کی برقراری کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ان اسباب میں بے اعتدالیوں کی وجہ سے جب امراض لاحق ہوتے ہیں تو انھیں اسباب میں کمیت وکیفیت کے اعتبار سے تبدیلیاں پیدا کر کے صحت کو واپس لوٹایا جاتا ہے، گو صحت و مرض کے تعلق سے اسباب ستہ ضروریہ کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ اسی اسباب ستہ ضروریہ میں بغرض صحت تصرف کرنے کا نام علاج بالتدبیر ہے۔ لہٰذا اطبا اسباب ستہ ضروریہ میں مناسب تبدیلی وتصرف کو اوّلیت دیتے ہیں، بعدازاں مرض اور مریض کے حالات کے مطابق بعض دیگر تدابیر کا اختیار کرنا پسندیدہ و ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اہم اور ضروری فکر ہر طبیب کی یہ ہونا چاہیے کہ کس طرح جسم انسانی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے اور کم سے کم نقصان، جس کے لیے علاج بالتدبیر ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس اہم طریقے میں کئی تدبیر، دوا، طریقے کا استعمال کر سکتے ہیں، گویا یہ ایسا طریقہ علاج ہے جو ان دونوں ہی چیزوں کے استعمال سے بالاتر ہے اور بنی نوع انسان کے لیے کافی فائدہ مند ہے۔

تدبیر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بھرپور کوشش اور حکمتِ عملی کے ہیں، طب یونانی میں اصطلاحی طور پر بقا صحت یا ازالہ مرض کی غرض سے اسباب ستہ ضروریہ میں مناسب اور ضروری تصرف کرنا علاج بالتدبیر کہلاتا ہے۔ اصل میں یہ ایک ایسا امور علاج ہے جس میں ادویہ (حیوانی و نباتی) آلات اور مخصوص طریقۂ علاج (بیرونی و خارجی) اختیار کر کے طب کے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عموماً کلی اصول (علاج بالضد) کو ذہن میں رکھ کر طریقوں کو کارگر لایا جاتا ہے۔

علاج بالتدبیر کی اہمیت قدیم و جدید دور میں یکساں رہی ہے، کبھی اس کی اہمیت میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ کچھ عرصہ پہلے علاج بالتدبیر کے عمل میں کمی ضرور آئی لیکن

اس کی افادیت آج بھی اپنی جگہ قائم ودائم ہے۔

علاج بالتدبیر کے لیے کئی طریقے دور جدید میں مستعمل ہیں، ان میں بعض لطیف اور سہل مثلاً دلک اور ریاضت، بعض قدرے پیچیدہ ہیں جن سے بعض اوقات جسم میں شدید نتائج رونما ہوتے ہیں مثلاً فصد اور کئی اور بعض طبعی مثلاً تعریق (پسینہ لانا)۔

چنانچہ ابوالقاسم زہراوی کی وصیت ہے کہ جن اطباء کرام کو ان طریقہ ہائے علاج سے مکمل واقفیت نہ ہو وہ ان تدابیر کو اختیار نہ کریں اس کے علاوہ طبعی طریقے اور بھی ہیں، جیسے تعریق اور اسہال وغیرہ۔ ایسی صورت میں ایک طبیب کا فرض بنتا ہے کہ بہتر، سہل اور طبعی طریقے کی طرف اپنی کوشش کا رخ موڑے تا کہ مریض کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکے۔

دور جدید میں مندرجہ ذیل طریقے علاج بالتدبیر کے لیے مستعمل ہیں۔ استفراغ، اسہال، قے، تعریق، تنفیث، ادرار، ادرارِ حیض، ادرارِ لبن، فصد، حجامت، تعلیق، عمل کئی، دلک، ریاضت، حمام، امالہ، حقنہ، ضماد (بذریعہ طلاء و مرہم)، تکمید، نکور، نطول، شیاف، حمول، فتیلہ، ایلام، انکباب، تنویم، تخلخہ، بخور، آبزن، شمومات و پاشویہ وغیرہ۔ ان تمام طریقوں میں حکماء کرام نے آسان و طبعی طریقوں کے استعمال کی ہدایت کی ہے۔ ہر ایک طریقے میں کئی افادیت پوشیدہ ہے جس کا علم مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے۔

استفراغ: اسباب ستہ ضروریہ میں احتباس واستفراغ ایک اہم مقام رکھتا ہے، مقررہ وقفہ تک ضروری مادوں کو جسم میں رکنے کا نام احتباس ہے اور بدن میں موجود ایسے مواد جو جسم کے لیے نقصاندہ ہیں ان کا جسم سے خارج ہونا استفراغ کہلاتا ہے۔ طبیعت کسی نہ کسی طرح فاسد مادوں کو جسم سے باہر خارج کرنے کی کوشش کرتی ہے، اگر یہ کام طبعی طور پر انجام دیں تو اسے طبعی استفراغ کہتے ہیں جیسے پسینہ آنا، قے کا آنا،

دستوں کا آنا، پیشاب کا زیادہ ہونا، حیض کا آنا وغیرہ اور اگر طبیعت فاسد مادہ کے اخراج پر قادر نہ ہو تو ایسی صورت میں دواؤں یا کسی اور ذریعے کا استعمال کر کے مادہ کو اخراج کے قابل بنایا جاتا ہے، اس قسم کے استفراغ کو استفراغ صِناعی کہتے ہیں۔ مرض کی حالت میں طبیعت کمزور ہو جاتی ہے ایسی صورت میں طبیعت کی مدد کر کے فاسد مادہ کو جسم کے باہر خارج کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے تا کہ مادہ جسم سے باہر خارج ہو جائے اور مرضی حالت میں کمی واقع ہو، جس کے لیے بہت سے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں اور اگر طبیعت کے تقاضے کے خلاف بدن سے مواد خارج ہو تو ایسے استفراغ کو غیر طبعی استفراغ کہتے ہیں۔

اسہال: اعضاء طبعیہ اور مفاصل کے مادی امراض میں مسہل زیادہ مفید ہوتا ہے۔ عمل مسہل ایک عام اور کلی استفراغ ہے، جس سے بدن کا تنقیہ ہونے کے بعد امعا کی قوت غاذیہ و قوت مغیرہ بڑھ جاتی ہے جس سے امراض کا مادہ مرض (سمی و فاسد مواد) خارج ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جن امراض میں رطوبت مائی، حدت خون صفراء، غلیظ بلغم اعتدال سے بڑھ جاتی ہے ایسی صورت میں بھی اسہال کا عمل مفید ہوتا ہے۔ تقلیل حرارت کی صورت میں مسہلات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ امالہ مواد، تحلیل اورام، مادہ مرض کی طرف طبیعت کا رخ موڑنے کے لیے، اشتہاء طعام، قوی فشار الدم، جیسی متعدد صورتوں میں اسہال کا طریقہ زیادہ مفید ہے۔

قے: قے سے معدہ کو صفائی حاصل ہوتی ہے اور رطوبت فاسدہ کم ہو جاتی ہے۔ بقول بقراط ہر ماہ دو بار قے کیا جانا چاہیے جس سے معدہ پاک وصاف رہتا ہے لیکن اس طریقے میں کچھ ہدایتوں کا بروئے کار لانا ضروری ہے یا ماہر طبیب کی نگہداشت میں اس عمل کو کرنا ضروری ہے۔ تنقیہ معدہ کے علاوہ دماغی امراض، گردہ، مثانہ، فالج و جگر کے امراض میں بھی مفید ہے۔ جالینوس کے مطابق کثرت قے مضعف معدہ ہے اور آئی ہوئی قے کو روکنا بھی اچھا نہیں۔

تعریق: علاج بالتدبیر میں تعریق (پسینہ لانا) ایک طبعی طریقہ ہے، جس کے ذریعے جسم سے فاسد مواد کا تنقیہ کر سکتے ہیں۔ اس طبعی طریقے کو بغرض علاج استعمال کر کے ازالہ مرض اور صحت کا تحفظ کر سکتے ہیں، اس طبعی فعل کا راست تعلق دماغ سے ہونے کی وجہ سے زیادہ نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔ جسم کے نظام کو متوازن رکھ کر نظام اعصاب اور دماغ، غیر ضروری چیزوں کو باعتبار نوعیت مرض و ضرورت، جسم سے باہر خارج کرتے ہیں۔ حالانکہ تنقیہ بدن کی صورت میں اجزا ضروریہ بھی خارج ہو جاتے ہیں ایسی صورت میں نظام توازن کو برقرار رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اسی لیے طبیعت خود بخود اس کی

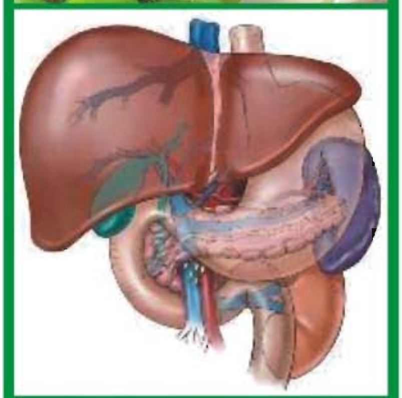

طرف مائل ہو کر نظام توازن میں معین و مددگار رہتی ہے۔

عمل تعریق (پسینہ لانا) کے لیے جسم انسانی میں مخصوص غدود پائے جاتے ہیں جو طبعی طور پر مختلف مقدار مختلف حالات اور ماحول میں پسینے کا اخراج کرتے ہیں۔ یہ غدود جسم میں بکثرت پھیلے ہوئے ہوتے ہیں نیز جہاں بال نہیں ہوتے وہاں عموماً ان کی کثرت ہوتی ہے۔ یہ ایک طبعی عمل ہے جس کے لیے اس کو بہتر اور عمدہ مانا گیا ہے، اس عمل کی وجہ سے جسم کے فاسد مادے کا تنقیہ آسانی سے ہوتا ہے اور جسم کو کسی قسم کے ضرر کا خدشہ نہیں رہتا، مزید یہ کہ اس عمل کا تعلق دماغ سے ہونے کی وجہ سے جسم کا توازن برقرار رہتا ہے، حکماء کرام مزید فائدہ بیان کرتے ہیں کہ جلد سے مادہ فاسدہ کا تنقیہ اور بدن کے تغذیہ میں معرق ادویہ کے استعمال سے توازن کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ تعریق کا ایک بڑا اور اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ جب جلد کی طرف دوران خون معرقات کے ذریعے بڑھتا ہے تو گردوں اور دیگر اعضاء رئیسہ کی طرف دوران خون کم ہو جاتا ہے جس سے ان کے افعال سست پڑ

جاتے ہیں، ان کو راحت اور آرام مل جاتا ہے نیز ان اعضاء میں ورم ہو تو تحلیل ہو جاتا ہے اور اعضاء رئیسہ و شریفہ مضر اثرات سے محفوظ ہو جاتے ہیں اس لیے کہ طبیعت مواد کا تنقیہ بذریعہ جلد طبعی طور پر کرنا چاہتی ہے۔

تنفیث: پھیپھڑوں سے بلغم خارج کرنے کے عمل کو تنفیث کہتے ہیں، اکثر پھیپھڑوں کے امراض میں پھیپھڑوں میں بلغم جمع ہو جاتا ہے ایسی صورت میں اس بلغم کو اخراج کے قابل بنایا جاتا ہے۔ اخراج بلغم کے لیے جو دوائیں استعمال کی جاتی ہیں اسے منفثات بلغم ادویہ کہتے ہیں۔ مثلاً اڑوسہ، اصل السوس، ایرسا۔

ادرار: ادرار سے مراد آہستہ آہستہ کسی چیز کا خارج کرنا، اس عمل کے ذریعے سے جسم میں موجود فاسد مادے کا تنقیہ کیا جاتا ہے۔ ادرار سے مراد خصوصاً بول، حیض اور لبن کا اخراج کرنا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام موسوم کیا جاتا ہے جیسے مدر بول، مدر حیض، و مدر لبن۔ مدر بول کا اہم مقصد خون سے تنقیہ مواد بولیہ ہے۔ ادرار بول کے لیے جو دوائیں استعمال کی جاتی ہیں ان کو مدرات بول کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے مدر حیض و مدر لبن ادویہ مختلف اغراض کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

فصد: یہ بھی ایک قدیم طریقہ ہے، شیخ الرئیس کے مطابق فصد ایک کلی استفراغ ہے جو اخلاط (عروق میں بند) کی زیادتی کو اعتدال کے ساتھ کم کرتا ہے۔ فصد کے ذریعے سے خون کے امتلا اور مادہ مرض کی کمیت و کیفیت میں کمی کی جاتی ہے اور طبیعت کی مدد ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کا رخ مرض کی طرف راغب ہوتا ہے اور ازالہ مرض میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔

حجامت: مقام ماؤف پر باریک باریک نشتر لگا کر ایک پیالہ نما شکل کے آلے سے فاسد خون یا مادہ مرض کا استفراغ کیا جاتا ہے۔ طب نبوی میں اس طریقے کا خاص ذکر ہے اور اس طریقے کے استعمال کے لیے آپؐ نے تاکید کی ہے۔ حجامت کے ذریعے سے جوڑوں کے آس پاس جمع شدہ مادے کو ڈھیلا کر کے نکالنے میں اور امالہ میں مدد لی جاتی ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں حجامت مع الشرط اور حجامت بلا شرط حسب ضرورت طریقے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

تعلیق (جونک لگانا): کسی مقام پر جونک لگانے کے عمل کو عملِ تعلیق کہتے ہیں۔ جونک پانی میں رہنے والا ایک مشہور کیڑا ہے جو خون چوستا ہے جس سے خون کا استفراغ ہوتا ہے۔ عمل تعلیق میں خون کا استفراغ حجامت کی بہ نسبت زیادہ اور فصد کی بہ نسبت کم ہوتا ہے۔ اس عمل کو خاص طور سے ان مقامات پر استعمال کیا جاتا ہے جہاں فصد اور حجامت کا طریقہ استعمال کرنے میں کچھ دقت ہو۔ ان تینوں طریقوں میں خون کی مقدار الگ الگ تناسب و جلد کے الگ الگ طبقات سے خارج ہوتی ہے جس جگہ کا استفراغ مقصود ہو وہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔

عمل کئی (داغنا): بارد مزاج اشخاص میں تقویت کے لیے، فاسد مواد کا دوسرے اعضا تک پھیلنے سے باز رکھنے کے لیے، غلیظ فاسد مواد کو تحلیل کرنے کے لیے، سیلان الدم و جریان الدم کو بند کرنے لے لیے، لحم فاسد کو پگھلانے لے لیے اس طریقے کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ غانغرانہ، الم، جریان الدم وغیرہ میں مفید ہے۔ لیکن آپؐ نے اپنی امت کو اسے استعمال سے منع کیا ہے۔

دلک: دلک سے مراد مالش کرنا جس کے لیے اکثر سیال یا روغن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ متعدد اغراض کے لیے متعدد روغن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ دلک سے اعضا کو تقویت ملتی ہے اور دوائی اجزا کے انجذاب کے ذریعے جسم سے شحمی مادہ اور دیگر فضلات کی تحلیل میں مدد ملتی ہے۔ دلک کے ذریعے سے سخت اعضا کو نرم اور نرم اعضا کو سخت بنایا جاتا ہے۔ الم و تحلیل ریاح کے لیے یہ طریقہ خاص کر مفید ہے۔ دلک سے دوران خون تیز ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ طریقہ فضلات جلد کے اخراج میں اور زخموں کے تیزی سے مندمل کرنے میں مفید ترین طریقہ علاج قرار دیا گیا ہے۔

ریاضت: ریاضت اعضا کی ارادی و غیر ارادی حرکات کو کہتے ہیں جس میں تنفّسی حرکات بڑھ جاتی ہیں جس کی وجہ سے دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے۔ روحانی خون میں اضافہ ہو جاتا ہے جس سے ہر عضو کو غذا حاصل کرنے کا موقع بآسانی مل جاتا ہے۔ جسم کے فضلات دخانی شکل میں زیادہ مقدار میں خارج ہوتے ہیں۔ اس عمل میں جلد ایک اہم رول ادا کرتی ہے، مسامات کشادہ ہو جاتے ہیں، جس سے اخراج فضلات میں مدد ملتی ہے۔ اعضا کی مختلف قوتوں جاذبہ، ماسکہ، دافعہ، ہاضمہ، محصولہ میں اضافہ ہوتا ہے، بدنی رطوبات رقیق ہوکر اعضا کے جوہر میں نفوذ کرتی ہیں جس سے اعضا کی بہتر نشوونما و دیگر فائدے حاصل کیے جاتے ہیں۔

حمام: حمام بہت سے مزمن مرض میں مفید ہے، بطور خاص سمن مفرط، نقرس، وجع المفاصل، فالج، امراض جگر و گردہ، قئ الدم اور نعث الدم جیسی بیماریوں کے علاوہ تھکان اور اضمحلال دور کرنے کا موثر طریقہ قرار دیا گیا ہے۔ حمام کے ذریعے سے فضلات بدن کو آسانی سے خارج کر سکتے ہیں۔

امالہ: اجتماع مواد اور اس کے استفراغ میں امالے کا طریقہ خاص کر مفید ہے۔ جس میں مادہ کے رخ کو کسی دوسری جانب یا طبعی راستے کی طرف پھیر دیا جاتا ہے جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ فائدے کا حصول ہوتا ہے۔

حقنہ: مبرز کے راستہ کسی دوا کو داخل کرنا حقنہ کہلاتا ہے۔

ضماد (بذریعہ طلا و مرہم): نیم منجمد ادویہ بطور علاج لیپ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

تکمید، تکور، نطول، شیاف، حمول، فتیلہ، ایلام، انکباب، لخلخہ، تنویم، بخور، آبزن، شمومات، پاشویہ، یہ سارے خارجی طور پر استعمال کیے جانے والے علاج کے طریقے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ امراض کے علاج و معالجے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اور کم سے کم نقصان کے لیے علاج بالتدبیر کو فوقیت دینا چاہیے اور علاج بالتدبیر میں عمل تعریق تمام طریقوں میں افضل، فائدہ مند اور آسان ہے، اطباء کرام اپنی عملی زندگی میں اس طریقے کو استعمال کر کے تحفظ صحت اور ازالہ مرض کے مقصد کو پا سکتے ہیں۔

■

Dr. Jaleel Ahmed, H.O.DD/o Kulliyat, Z.V.M. Unani Mediacal College & Hospital, New Modikhana, K.B. Hidayatullah Road, Azam Campus, Camp, Pune- 411001, Mob.: 09028794620, E-mail.drjaleelahmedsiddiqui@gmail.com

سلمیٰ بی کولور

ہندوستانی فلموں میں اردو غزل کا جادو

ہندوستان کی سرزمین میں 'غزل' اُردو تہذیب کی نمائندہ شاعری کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہے۔ اردو کی شعری اصناف میں غزل ہر شاعر کی پسندیدہ صنف ہے۔ اردو میں سب سے پہلے رنگین غزلیں لکھی گئیں اسی رنگینی و دلکشی کے سبب ہندی فلموں میں بھی اُردو غزل بہت مقبول ہوئی اور فلموں کو بھی مقبولیت عطا کی۔ مختلف ادوار میں غزل ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے عاشقانہ مضامین کی تنگنائے سے نکل کر ہر قسم کے مضامین بیان کیے جانے کے قابل ہوگئی تو مضامین میں تنوع ہی اس کی مقبولیت کا سبب بنا ہے۔ غزل کم سے کم لفظوں میں بڑی سے بڑی بات کہہ دینے کا ہنر جانتی ہے۔ اُردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی لکھی اور پڑھی جا رہی جو صنف سخن اس طرح عوام وخواص کے اعصاب پر چھائی ہو اس کا معیار متعین کرنا بھی آسان نہیں۔ بقول وسیم بریلوی:

''غزل کی فکر انگیز لفظی و معنوی تعمیم ہی آج اسے ایسے مقام پر لائی ہے کہ دیگر اصناف سخن اسے رشک سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ اُردو شاعری کے ہر دور کا بڑا شاعر غزل گو ہی ہو اہے۔ شاید اس لیے کہ غزل سے بڑھ کر کوئی دوسری صنف سخن انسانی مزاج کی ہر لمحہ بدلتی کیفیات کو اتنے واقعاتی انداز میں موضوع فکر بنا ہی نہیں سکتی۔''

(آنکھوں آنکھوں رہے: وسیم بریلوی، ص8)

بیسویں صدی میں غزل نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ وہیں سینما فلموں کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکی بلکہ اُردو غزل ہندی سینما کا اٹوٹ حصہ بن گئی۔ 'غزل اُردو شاعری کی آبرو' اُردو شاعری کی روح، اُردو شاعری کا عطر، اُردو کی پاکیزہ صنف سخن اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر جہاں ہر زبان وادب کے فنکاروں کی منظور نظر بن گئی ہے وہیں ہندی فلموں کی جان بنی ہوئی ہے اور فلموں کو ہر دلعزیز بنانے میں بھی اس نے اہم رول ادا کیا ہے۔ فلم کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پورے ملک میں بلکہ غیر ممالک میں بھی مذہب وملت اور زبان کی تفریق کے بغیر لوگ فلمی غزلیں سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ خلیق انجم صاحب کہتے ہیں کہ:

''نثر تو پڑھے لکھے لوگوں تک محدود رہتی ہے لیکن غزل نے مشاعروں، موسیقی کی محفلوں، فلموں، ریڈیو ٹیلی ویژن کے ذریعے ان ہندوستانیوں کے دل میں بھی اپنے لیے جگہ بنائی جو پڑھنے لکھنے کی نعمت سے محروم ہیں۔''

ہندی سینما میں جس غزل کو برتا گیا ہے وہ اُردو زبان وادب سے الگ نہیں ہے اکثریت اردو شعرا کی ہے جنھوں نے ہندی سینما میں قلم فرسائی کی ہے چاہے وہ کسی بھی سطح کی کیوں نہ ہو۔ جو کچھ لکھا ہے سینما فلم کے تقاضوں کے پیش نظر ہی لکھا ہے۔ اردو غزل کے اشعار کا استعمال سینما میں نہ صرف غزلیہ کلام کے طور پر ہوا ہے بلکہ گیتوں، قوالیوں، مکالموں وغیرہ میں بھی خوب خوب برتا گیا ہے، اس لیے ہندی سینما کی آفاقی مقبولیت اُردو غزل سے ہے۔

محبوب خان کی فلم 'دکن کوئن' 1936 میں سریندر نے غالب کی یہ غزل گائی تھی:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

پریم پال اشک نے لکھا ہے کہ فلم 'نیکی اور بدی' 1949 میں مومن کی غزل:

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اور 1940 میں ایس ایف حسین کے زیر ہدایت اور فلم کارپوریشن آف انڈیا کے جھنڈے تلے فلم 'قیدی' آئی تھی۔ اس میں غالب کی دو غزلیں شامل کی گئی تھیں۔ اس کے موسیقار بھیشم دیو چٹرجی تھے:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اور:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اسی فلم 'قیدی' میں فیض احمد فیض کی نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ' کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں نور جہاں نے اپنی سریلی اور میٹھی آواز میں گایا ہے جس کا آڈیو/ویڈیو ریکارڈنگ 'ہندی گیت مالا ڈاٹ نیٹ' میں موجود ہے۔

1954 میں غالب کی حیات پر 'مرزا غالب' کے عنوان سے فلم بنی جس میں ثریا اور طلعت محمود نے مرزا غالب کی غزلیں گا کر اُردو والوں کے دلوں کو لوٹ لیا۔ غالب کی یہ غزلیں نہ صرف اُردو والوں پر بلکہ غیر اُردو داں حضرات اور زبان وادب سے تعلق نہ رکھنے والوں پر اثر کر گئیں۔ اس فلم

کی غزلیں ہیں

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک
نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرماجائے ہے مجھ سے
دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

فلم 'اپنا دیش' 1949 میں پشپا ہنس اور موسیقار پرشتم نے دو غزلیں گائی تھیں۔ فلمی دنیا میں اور اُردو والوں سے پشپا ہنس کا تعارف غالب کی انہی غزلوں کی گلوکاری سے ہوا تھا۔ وہ غزلیں تھیں:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

غالب کے کلام کو، کے ایل سہگل اور سریندر کے علاوہ ثریا، طلعت محمود، محمد رفیع اور پشپا ہنس نے مختلف فلموں میں اپنی آواز کے جادو کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقول پریم پال اشک ہندی سنیما میں سب سے زیادہ غزلیں غالب کی پیش کی گئی ہیں ان فلموں کی تعداد 7 ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی غزلوں کے کئی منتخب اشعار بے شمار ہندی فلموں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ کے ایل سہگل کی آواز میں غالب کی یہ غزلیں پرائیویٹ طور پر ٹوئین ریکارڈ کمپنی والوں نے بھی پیش کر کے مرزا اسداللہ خاں غالب کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ہندی سنیما کے کئی شعرا نے محمد قلی قطب شاہ، غالب اور میر کی غزل کے مطلع اور مصرعوں کو اور کبھی مصرعوں کے ٹکڑوں کو لے کر تضمین بھی کی ہے۔ غزلوں کے ردیف اور قافیے کو بھی اپنی غزلوں میں برتا ہے۔ طرحی مصرعوں پر اسی زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ ان میں مجروح سلطان پوری، حسرت جے پوری، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، راجیندر کرشن، قمر جلال آبادی، نقش لائلپوری، انجان، شیلیندر اور شہریار وغیرہ اہم ہیں۔ مثال کے طور پر 1950 کی فلم 'آرزو' میں مجروح سلطان پوری نے غالب کی یہ غزل:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

کی ردیف وقافیے کو بلکہ مصرعے کے ٹکڑوں کو برتا ہے۔

مومن کی شہرۂ آفاق غزل کا یہ شعر جس پر غالب اپنا دیوان نچھاور کرنے پر آمادہ ہوئے تھے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

صرف ایک لفظ کو کم کر کے حسرت جے پوری نے پورا شعر فلم 'لو اِن ٹوکیو' 1966 کے گانے میں استعمال کیا تھا، اور میری شاہِ خوباں او میری جانِ جاناں... تم میرے پاس ہوتے ہو کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ مومن کی اسی غزل کا ایک اور شعر:

حالِ دِل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دِل سے جدا نہیں ہوتا

فلم 'رستم سہراب' 1963 میں:

پھر تمھاری یاد آئی اے صنم
ہم نہ بھولیں گے تمھیں اللہ قسم

بیت کے دوسرے شعر کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کی غزل:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

فلم 'دلہن ایک رات کی' 1966 میں موسیقار مدن موہن، لتا منگیشکر کی آواز کے ساتھ اداکارہ 'نوتن' پر فلمایا گیا ہے۔ فلم داستان 1972 میں محمد رفیع کی آواز میں ساحر لدھیانوی نے مصرعہ اولیٰ اقبال کا لیا ہے:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے

اس کے علاوہ کئی ہندی فلمی گیتوں میں علامہ اقبال کے کلام کو استعمال کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف دوم کے مشہور طنزیہ ومزاحیہ اردو کے شاعر سرسید احمد خان کے ہم عصر اکبرالہ آبادی کی غزل:

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

اکبرالہ آبادی کی غزل کے مطلع کے دونوں مصرعوں کے آخری ٹکڑوں کو 'تھوڑی سی جو پی لی ہے'/'چوری تو نہیں کی ہے' کو جوڑ کر ایک خوبصورت گیت بنایا گیا ہے فلم 'نمک حلال' 1982 کا گیت امیتابھ بچن پر فلمایا گیا ہے۔ ہدایت کار پرکاش مہرا فلمساز ستندر پال کشور کمار کی آواز میں موسیقار بپی لہری ہیں گیت کے بول انجان کے لکھے ہوئے ہیں۔ 'نمک حلال' فلم کا گیت ہے:

تھوڑی سی جو پی لی ہے چوری تو نہیں کی ہے
وہ جولی وہ شیلا وہ رانو جانو کوئی تو۔ ۔ ۔

آزادی سے قبل فیض احمد فیض نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کے لیے چند غزلیں اور نظمیں دی تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے کئی شعرا نے فلموں کے لیے اپنی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔ ان میں مخدوم محی الدین، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی وغیرہ نے اپنی پوری زندگی فلموں کے لیے وقف کردی تھی۔ فیض کی دو غزلیں اور ایک نظم جس کا ذکر فلم 'قیدی' کے ضمن میں لیا جا چکا ہے۔ فلم 'رومیو اور جولیٹ' 1947 موسیقار حسن جس کی گلوکارہ زہرہ بائی امبالے والی اور موسیقار خیام ہیں:

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

یہ اپنے زمانے کی بہت ہی مقبول غزل ہے۔ آج بھی اس کے سننے والوں کی کمی نہیں ہے۔ فلم 'جانور' 1965 موسیقار شنکر جے کشن، آشا بھونسلے کی آواز میں فیض احمد فیض کی غزلوں اور نظموں کے اشعار بہت ہی رومانی منظر کے ساتھ فلم میں پیش کیے گئے ہیں۔ اداکار شمی کپور، راج شری ہیں، اشعار ہیں:

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے۔ ۔ ۔

مخدوم محی الدین کی بڑی خوبصورت، کانوں میں رس گھولنے اور دل کو موہ لینے والی نظمیں اور غزلیں ہندی فلموں کے لیے فلمائی گئی ہیں۔ فلم ساز ہدایت کار اور اداکار چندر شیکھر نے

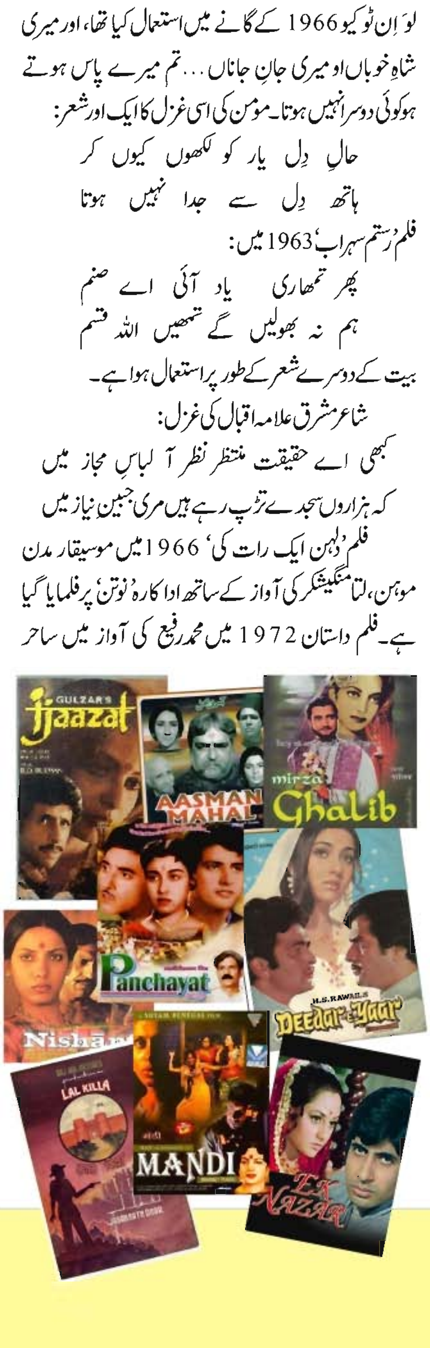

بھی اپنی فلم 'چاچا' 1964 میں مخدوم محی الدین کا کلام پیش کیا تھا جو کافی مقبول رہا ہے:

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرف وفا پیار ان کا خدا
پیار ان کی چتا
دو بدن
اوس میں بھیگتے چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صرف ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر
ایک پل کے لیے رک گئی
ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں/ نور و ظلمت میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
مے کدوں کے دراڑوں نے دیکھا انھیں
ازل تا ابد/ یہ بتا چارہ گر/ تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے
اک چنبیلی کے منڈوے تلے
دو بدن...

فلم 'گمن' 1978 میں مخدوم کی یہ غزل:

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر...

بہت مقبول عام ہوئی۔ 1981 کی فلم 'بازار' میں ساگر سرحدی نے خیام کی موسیقی سے آراستہ لتا منگیشکر اور طلعت عزیز کی آواز میں نامور ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کا کلام پیش کر کے بقول پریم پال اشک ''اپنے اعلی ادبی شعور کا ثبوت پیش کر دیا'':

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی

اسی فلم 'بازار' میں جگجیت کور نے مرزا شوق کی غزل:

دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے
کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے

دلکش آواز میں گائی ہے۔

بہزاد لکھنوی نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کی اور دہلی و بمبئی کے ریڈیو اسٹیشنوں پر اسکرپٹ رائٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ تقسیم وطن کے بعد وہ پاکستان ریڈیو کراچی سے وابستہ ہو گئے اور صبح کے نشریات میں دس سال تک نعت خوانی کرتے رہے، اس کے علاوہ انھوں نے فلموں کے لیے گیت بھی لکھے فلم 'آگ' 1948 کا یہ مقبول گانا 'نا آنکھوں میں آنسو نا ہونٹوں پہ ہائے' موسیقار رام گانگولی اور شمشاد بیگم نے گایا تھا۔ آج بھی لوگوں کی یادوں میں محفوظ ہے۔ اسی فلم کا ایک اور نغمہ جسے مکیش نے اپنی جادو بھری پرسوز آواز میں پیش کیا تھا آج تک ہٹ ہے۔ گیت کے بول ہیں:

زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں

فلم 'ادا' کے لیے بہزاد لکھنوی کا لکھا ہوا گیت:

جسے دل میں بسانا چاہا تھا اسے دل میں اپنے بسا نہ سکے
پر اب یہ تمنا ہے دل کی ہمیں یاد بھی اس کی آ نہ سکے

طلعت محمود نے گایا تھا اور کافی مشہور ہوا تھا

مجاز لکھنوی اردو کا شاعر جو علی گڑھ یونیورسٹی میں اُردو سے بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دہلی ریڈیو اسٹیشن کی میگزین آواز کے سب ایڈیٹر رہے۔ ان کی چند ہی غزلیں اور نظمیں فلموں کی زینت بنیں نغموں کو سننے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جواں مرگ شاعر اگر حیات ہوتا تو اُردو شعر و ادب اور فلمی دنیا کو کس کس طرح سے نوازتا۔ 1953 میں فلم 'ٹھوکر' میں موسیقار سردار ملک نے طلعت محمود کی آواز میں مجاز لکھنوی کی مشہور نظم 'اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں' فلم 'پیاسا' 1957 جو بے حد مقبول رہی ہے۔ مجاز لکھنوی کی غزل کو گرودت پر فلمایا گیا تھا۔ اس کے موسیقار سچن دیو برمن تھے۔ غزل کا شعر ہے:

رودادِ غم الفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

فلمساز و ہدایت کار کے۔ اے عباس کی فلم 'آسمان محل' 1965 میں، موسیقار جے پی کوشک کی آواز مہندر کپور و جے مجمدار، مجاز لکھنوی کی نظم 'مجبوریاں' میں:

آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا
سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا...

استعمال کی گئی تھی۔

فلم 'لال قلعہ' میں بہادر شاہ ظفر کی غزلیں محمد رفیع نے گائی تھیں موسیقار ایس این ترپاٹھی تھے۔ یہ فلم معمولی ہونے کے باوجود غزلوں کی وجہ سے مقبول ہوئی۔ حالانکہ ایک مشہور غزل جو 'نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں...' جو غالباً ظفر کے دیوان میں شامل ہے وہ مضطر خیر آبادی کی ہے۔ وہ بھی فلم 'لال قلعہ' میں فلمائی گئی ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیار میں

1983 کی فلم 'منڈی' میں بہادر شاہ ظفر کی غزل پربتی ساگر کی آواز میں موسیقار ونراج بھاٹیہ نے مجرا گیت کے طور پر پیش کی ہے۔ 1974 میں پاکستان کی فلم 'ٹائیگر گیانگ' میں بھی ظفر کی یہی غزل فلمائی گئی ہے۔ شمشیر برہنہ مانگ غضب بالوں کی مہک پھر ویسی ہی/ جوڑے کی...

ساگر سرحدی اور شیلندر نے بڑی ہی خوبصورتی سے میر کی غزل کو اپنی فلم 'میں نشے میں ہوں' میں استعمال کیا تھا:

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں

1972 میں ساگر سرحدی کی زیر ہدایت فلم 'ایک نظر' بنی تھی۔ اس فلم کے گانے میں میر تقی میر کی غزل کی تضمین کی گئی ہے وہ ہے:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

1981 کی فلم 'بازار' میں نامور موسیقار خیام نے میر کی غزل لتا منگیشکر کی آواز میں:

دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

استعمال کی ہے۔

مجاہد آزادی شری کرشن کے معتقد، حسرت موہانی کی شہرۂ آفاق غزل:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

1982 کی فلم 'نکاح' میں سید غلام علی کی آواز میں بڑی خوبصورت طرز ادا کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ دکن میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے جن کی مشہور غزل فلم 'نشانت' 1975 میں پربتی ساگر کی آواز موسیقار و ونراج بھاٹیا نے پیش کیا تھا:

پیا باج پیالا پیا جائے نا
پیا باج اک تل جیا جائے نا

اس غزل کے موضوع اور طرحی مصرع میں شکیل بدایونی نے ایک غزل فلم پنچایت 1958 کے لیے لکھی تھی بول تھے:

تیری یاد دل سے بیا جائے نا
اک پل بھی تجھ بن جیا جائے نا

مجروح سلطان پوری نے فلموں کے لیے کافی تعداد میں گانے لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ فلم 'ابھیمان' 1973 کا ایک گانا جو، جیا بہادری پر فلمایا گیا ہے۔ مجروح سلطان پوری کے بول تھے: پیا بنا پیا بنا پیا بنا بسیا باجے نا باجے نا' اس گیت کے بول تقریباً اسی غزل سے لیے گئے ہیں بس گانے کی ترتیب

مجروح سلطان پوری کی ہے۔

اُردو کے متوسط دور کے شاعروں میں امیر مینائی بہت اہم ہیں۔ 1982 کی فلم 'دیدار یار' میں ان کی غزل کو بہت خوبصورتی سے ٹینا مونیم اور رشی کپور پر فلمایا گیا تھا۔ موسیقار لکشمی کانت پیارے، آواز کشور کمار اور لتا منگیشکر کی تھی، غزل کے اشعار:

سرکتی جائے ہے رخ سے نقاب آہستہ آہستہ
نکلتا آرہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ

امیر مینائی کی یہ غزل بے حد خوبصورت اور جدت طرازی کا نمونہ ہے۔ اس غزل کو فلم کے علاوہ بھی کئی فنکاروں نے اپنے البم میں پیش کیا ہے۔ فلم 'نیکی اور بدی' کی غزل 'تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو' کے علاوہ 'مومن خاں مومن کی غزل:

مجھ پہ طوفاں اٹھائے لوگوں نے
مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

اور داغ دہلوی کی غزل:

سبق ایسا پڑھا دیا تونے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تونے

فلم 'تہذیب' 2003 میں موسیقار اے آر رحمن نے سجاتا بھٹاچاریہ کی آواز میں پیش کیا ہے۔

فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین کی طرح شہریار بھی اُردو کے ان شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کی شعری تخلیقات کو فلموں میں استعمال کیا گیا۔ مظفر علی کی فلم 'امراؤ جان' کی کل چھ غزلیں:

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے
دل چیز کیا ہے آپ میری جان لیجیے
ان آنکھوں کی مستی کے افسانے ہزاروں ہیں
جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی سی لگتی کیوں ہے
یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے
زندگی جب بھی تیری بزم میں لاتی ہے ہمیں

اسی ایک فلم نے انھیں ہندوستان کے گھر گھر میں پہنچادیا ہے۔ سال 1979 کی فلم 'گمن' پہلی فلم تھی جس میں ان کی دو غزلیں موسیقار جے دیو، آواز ہری ہرن:

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو
سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

یہ دونوں غزلیں کافی مشہور ہوئیں گمن، امراؤ جان انجمن ان کی خاص فلمیں ہیں۔ انھیں 2008 کا گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا ہے۔

فلم 'انداز' 1949 میں آواز، لتا منگیشکر کی، موسیقی نوشاد علی کی، فلم ساز، محبوب خان، شاعر مجروح سلطان پوری تھے۔ 'اُٹھائے جا اُن کے ستم اور جے جاؤ یونہی مسکرائے جا' آنسو پیے جا۔ فلم 'دستک' 1970 میں اداکارہ ریحانہ سلطانہ، سنجیو کمار، آواز لتا منگیشکر، موسیقی، مدن موہن، فلم ساز راجندر سنگھ بیدی شاعر مجروح سلطان پوری:

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اُٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
اب کیا مثال دوں میں تمہارے شباب کی
اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو
اپنا پرایا مہرباں نا مہرباں کوئی نہ ہو

وغیرہ مجروح کی بے شمار غزلیں ہندی فلموں کی زینت بنی ہیں۔

گلزار متحدہ ہندوستان کی سرزمین ضلع پنجاب بمقام دینا، جہلم سے اردو زبان کی سوغات ساتھ لیے بمبئی آئے۔ سال 2003 کی فلم پنجار گلزار، غزل:

ہاتھ چھوٹے بھی تو رشتے نہیں چھوٹا کرتے
وقت کی شاخ سے لمحے نہیں ٹوٹا کرتے

سال 1988 کی فلم 'اجازت' کی گلزار کی غزل:

خالی ہاتھ شام آئی ہے، خالی ہاتھ جائے گی
آج بھی نہ آیا کوئی خالی لوٹ جائے گی

بہت مقبول ہیں۔

سال 1983 کی فلم 'ارتھ' شاعر کیفی اعظمی کی غزل:

جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں
دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں

کے علاوہ ایک اور غزل 'تم اتنا جو مسکرا رہے ہو' بہت مشہور ہوئی۔

ممتاز ترین مقبول عام شاعر و فلمی نغمہ نگار اور نثر نگار ندا فاضلی 'کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا' کی وجہ سے مشہور ہیں۔ سال 1999 کی فلم 'سرفروش' میں ان کی غزل:

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھیے زندگی کیا چیز ہے

بہت مقبول ہوئی۔ سال 1981 کی فلم 'آہستہ آہستہ' میں ندا فاضلی کا کلام موسیقار خیام نے آشا بھوسلے کی آواز میں:

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
زمیں ملی ہے مگر آسماں نہیں ملتا
جسے بھی دیکھیے وہ اپنے آپ میں گم ہے

پیش کیا گیا ہے۔ سال 1990 کی فلم 'آج' میں سدرشن فاکری کا کلام چترا سنگھ اور جگجیت سنگھ نے پیش کیا ہے:

زندگی میں جب تمہارے غم نہیں تھے
اتنے تنہا تھے کہ ہم بھی ہم نہیں تھے

سال 1985 کی فلم 'اعتبار' میں حسرت جے پوری کا کلام بھوپیندر سنگھ اور آشا بھونسلے نے پیش کیا ہے:

کسی نظر کو تیرا، انتظار آج بھی ہے
کہاں ہو تم کہ یہ دل بے قرار آج بھی ہے

نغمہ نگار کیف بھوپالی کی فلمی غزلیں خاص طور پر فلم 'پاکیزہ' کے گیتوں کے لیے مشہور ہیں:

آج ہم اپنی دعاؤں کا اثر دیکھیں گے
تیر نظر دیکھیں گے زخم جگر دیکھیں گے

ابتدائی فلموں میں اُردو کلاسکی شعرا کے کلام اور منتخب غزلوں سے کام لیا کرتے تھے۔ پھر جب آزادی کے بعد ہندوستان میں نئی کھیپ فلمی دنیا سے وابستہ ہوئی تو ان میں بھی اکثر شاعروں نے اُردو کے کلاسکی شعرا کے کلام کی تقلید میں غزلیں کہیں، کبھی اشعار کو منتخب کرلیا جاتا کبھی مطلع یا طرحی مصرعے کو تضمین کیا جاتا کبھی ردیف اور قافیے کو یا مصرعے کے آدھے ٹکڑے کو گیتوں کا حصہ بنا دیا جاتا۔ اس طرح تقلید میں ترقی ہوتے ہوتے اُردو کی بے شمار غزلیں ہندی فلمی گیت کا اٹوٹ حصہ بن گئی ہیں۔ اس کے علاوہ چند شعرا نے فلموں کے لیے اپنی طبع زاد تخلیقات کو پیش کیا ہے۔ گذشتہ پچاس سالوں میں غزلیات کے موضوعات میں جو وسعت و گہرائی پیدا ہوئی اس کے اثرات سے فلمی غزل گو شعرا بچ نہ سکے۔ فلمی غزلوں میں اُردو زبان و بیان کے ذریعے انسانی زندگی کے حوادث کا اظہار معنی خیز و پر اثر انداز میں ہوا ہے۔ ان غزل گو شعرا کا لہجہ سادہ اور معصوم ہے اور رویہ عوام پسند ہے۔ انھوں نے اُردو غزلوں اور گیتوں میں ہندی اور انگریزی کے الفاظ کو اس طرح شامل کرلیا ہے کہ غزل کی خصوصیات کو زک نہیں پہنچی بلکہ اس کی نغمگی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

■

Saleema Bi Kolur, Dept. of Urdu wa Farsi,
Karnataka Arts College, Dharwar - 580001 (KS)
Email.: saleema.kolur7@gmail.com

تبصرہ و تعارف

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (1204 تا 1857)

مصنف: اختر اورینوی
صفحات: 347، قیمت: 124 روپے، سنہ اشاعت: 2014 (بار دوم)
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 25
مبصر: ساجد ذکی فہمی، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ادبی اعتبار سے اختر اورینوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی سرمائے کی بدولت وہ ادبی دنیا میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔

'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (1204 تا 1857)' دراصل مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے، جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی تھی۔ مواد کے اعتبار سے یہ کتاب کافی اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف نے فقط بہار میں اردو زبان و ادب کے ارتقا پر بحث کرنے کے بجائے 'مقدمہ' میں ایک طویل گفتگو فلسفۂ زبان و اقوام، اردو زبان کے آغاز کا پس منظر اور اردو زبان کے ارتقا پر کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوٹوک انداز میں انھوں نے فیصلے بھی صادر فرمائے ہیں۔ مثال کے طور پر خالص زبان کے متعلق اکثر یہ تحریر پڑھنے میں آتی ہے کہ اس سے مراد وہ زبان ہے جس میں دوسری زبان کے الفاظ شامل نہ ہوئے ہوں، لیکن اختر اورینوی اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس عالم نیرنگ میں نہ تو خالص نسلوں اور قوموں کا کوئی وجود ہے، نہ خالص کلچر کا اور نہ خالص زبان کا۔ نسل، قوم، کلچر اور زبان یہ سب ہمیشہ سیال حالت میں ہیں، تھے اور رہیں گے۔ ان میں ہر آن میل جول، خلط ملط، لین دین ہوتا رہتا ہے۔'' (ص 19)

اسی طرح وہ ریختہ کے متعلق اپنے نظریات پیش کرتے ہوئے اسے تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

''میں ریختہ یعنی قدیم اردو کو صرف ایک شکل تسلیم نہیں کرتا بلکہ میرا یہ نظریہ ہے کہ جتنی 'بھاشائیں' ہند میں تھیں، اتنی ہی ریختائیں بنیں۔ ان مختلف ریختاؤں کے عہد کو ''اردوئے قدیم کا عہد کہنا چاہیے... اس کے بعد اردوئے وسطیٰ کا عہد آتا ہے۔ پھر اس دور کی تکمیل کے بعد معیاری اردو کی منزل آتی ہے اور اردوئے معلیٰ کا دور شروع ہو جاتا ہے۔'' (ص 45)

بہرحال ان باتوں کے علاوہ کئی ایسے نکات ہیں جن پر انھوں نے مدلل انداز میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یوں تو پوری کتاب فقط دو ابواب پر مشتمل ہے۔ اول 'بہار میں اردو زبان' اور دوئم 'بہار میں اردو ادب' لیکن ان دونوں ابواب میں کئی ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ مثلاً پہلے باب میں چار ذیلی عنوانات (i) عہد عالمگیر میں لسانی یکسانی (ii) کھڑی بولی ریختہ (iii) قدیم اردو اور صوفیاء کرام (iv) انگریزی دور میں اردو زبان۔ لیکن باب دوئم میں 48 (اڑتالیس) ذیلی عنوانات قائم کرتے ہوئے بہار میں اردو ادب کے ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب کے تحت اردو ادب کے فروغ میں صوفیاء کرام کی خدمات کے ذکر کے ساتھ تذکرہ نگار شعرا اور نثر نگاروں کی بھی ایک طویل فہرست پیش کی گئی ہے۔ اس باب میں ایسے شعرا کی تفصیلات بھی درج ہیں جنھوں نے مختلف شہروں سے ہجرت کے بعد عظیم آباد میں سکونت اختیار کی اور زندگی کے آخری ایام تک وہیں مقیم رہے۔ ان شعرا میں میر محمد باقر حزیں، اشرف علی خاں فغاں، میر ضیاء الدین ضیا اور شاہ رکن الدین عشق وغیرہ شامل ہیں۔ مصنف کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ کتاب میں شعرا کی تفصیلات کے ساتھ ان کے کلام کا ایک مختصر سا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔

کتاب کے اختتام پر کتابیات اور اشاریہ سے پہلے 'بہار میں اردو ادب کے عام میلانات' کا عنوان قائم کرتے ہوئے مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس زمانے میں اردو زبان و ادب نے بہار کی سرزمین میں اپنے بال و پر پھیلانے شروع کیے، اس وقت وہاں کے شعری اور نثری فن پاروں پر صوفیانہ اور مذہبی رنگ پوری طرح غالب تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ صوفیا نے دین اسلام کی تبلیغ کے لیے عوامی زبان کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا تھا، کیوں کہ انھیں اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانی تھی۔ لہٰذا معیاری کے بجائے عوامی زبان ہی تبلیغ کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔

یہ کتاب پہلی بار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے ہی منظر عام پر آئی تھی اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی کونسل نے ہی شائع کیا ہے۔ کتاب کی طباعت کافی عمدہ ہے۔ قیمت بھی کم ہے۔

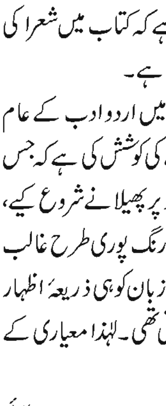

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی
صفحات: 307، قیمت: 113 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: طفیل علیمی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

سلام اردو ادب کی ایسی صنف ہے، جسے ابتدا ہی سے ناقدین اردو ادب نے نظرانداز کیا۔ جبکہ اردو کے قدیم شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد سلطنت سے تعلق رکھنے والے شعرا کے کلام میں سلام کے نمونے ملتے ہیں۔ محمد شاہی دور کے مرثیہ گو شعرا خادم دہلوی اور جانفشاں دہلوی کی تخلیقات میں بھی سلام کے نمونے دستیاب ہیں۔ اردو کے تمام بڑے شعرا خواہ وہ مرثیہ گو ہوں یا غزل گو، انھوں نے سلام کہے ہیں۔ ان میں ولی، شاکر ناجی، فضل علی فضلی، مصطفی خاں یکرنگ، ضاحک، قائم چاندپوری، مصحفی، رنگین، جرأت وغیرہ شامل ہیں۔ میر و سودا کے عہد تک پہنچتے پہنچتے سلام کی ادبی حیثیت نمایاں ہو چکی تھی اور بہادر شاہ ظفر کے عہد میں سلام مقبول صنف سخن بن چکا تھا۔ ظہیر، ظفر، غالب، سالک، افسوس، عارف اور مولوی محمد باقر کی طرح کئی شعرا کے سلام موجود ہیں۔ ضمیر و خلیق اور دبیر کے کلام میں اس صنف سخن کا اچھا خاصا ذخیرہ دستیاب ہے۔ عظیم مرثیہ گو میر انیس نے بھی اس صنف سخن کی طرف خاص توجہ کی اور صنف مرثیہ

کی طرح صنف سلام کو بھی بام عروج تک پہنچا دیا۔

زیر تبصرہ کتاب ''انیس کے سلام'' علی جواد زیدی نے ترتیب دی ہے۔ کتاب میں علی جواد زیدی کا مبسوط اور پر مغز مقدمہ شامل ہے، جس میں انھوں نے سلام کی روایت اور تاریخ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ کتاب میں 102 سلام ہیں، ان میں تحت اللفظ کے 44 اور سوز کے 58 سلام ہیں۔ 14 نوحے، 3 تضمینیں اور ایک ایک مناجات اور مخمس منقبتی شامل ہیں۔

انیس کی سلام گوئی پر اظہار خیال کرتے ہوئے علی جواد زیدی مقدمہ میں رقم طراز ہیں: ''انیس کے سلام میں ایسے بہت سے اشعار ہیں، جو غزلوں میں کھپ سکتے ہیں، لیکن سلاموں کے تغزل میں جو مبصرانہ اور مفکرانہ شان ہوتی ہے، مضامین کی تازگی اور شگفتگی پر جو زور ہوتا ہے اور غزل سے قریب مگر خالص تغزل سے ممتاز رکھنے کی جو ارادی کوشش ہوتی ہے، وہ سلاموں کو ایک انفرادی، اخلاقی آہنگ دیتی ہے۔ سلاموں سے اردو کو اخلاقی شاعری کا اچھا خاصا ذخیرہ ملا ہے اور وہ لحن ملی ہے، جو بعد میں چکبست کی غزلوں اور حالی کی نظموں میں اصلاحی مقاصد کی تکمیل کے کام آئی۔ انیس خلوت کی زبان میں گفتگو نہیں کرتے ہیں، وہ اشاراتی اور کنایاتی زبان سے زیادہ کام نہیں لیتے، کیونکہ ان کا عشق ذاتی نہیں، بلکہ ایسا عشق ہے جس کی لذت عام ہے اور جس کا مزا اسی عمومیت میں ہے۔''

کتاب میں 102 سلام شامل ہیں، جنھیں دو خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تحت اللفظ میں 44 اور سوز میں 58 سلام شامل ہیں۔ دو خانوں میں تقسیم ہونے کے باوجود اس میں انیس کے کچھ ایسے سلام بھی ہیں، جو ایک مشترکہ رنگ کے حامل ہیں اور کئی سلام ایسے ہیں، جو تحت اللفظ اور سوز دونوں طریقوں سے پڑھے جاسکتے ہیں۔

زیر نظر مجموعے میں کچھ ایسے سلام بھی شامل ہیں، جو انیس کے ساتھ ساتھ دوسرے شعرا سے بھی منسوب ہیں۔ حالانکہ علی جواد زیدی نے کتاب کی ترتیب دیتے وقت کافی چھان پھٹک کی ہے، تقریباً 16 ایسے سلام شامل مجموعہ ہیں، جن کے بارے میں قطعی اور یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ انیس کے سلام ہی ہیں چونکہ یہ 16 سلام مونس سے منسوب ہیں اور تین سلام خلیق کے نام سے بھی منسوب ہیں۔ علی جواد زیدی لکھتے ہیں کہ ''ان 19 سلاموں میں کم از کم آٹھ ایسے ہیں، جو خاندانی روایت پر مبنی مجموعے 'تجلیات انیس' میں بھی نہیں۔ خارجی اور کئی اندرونی شہادتوں سے بھی اشتباہ کو تقویت پہنچتی ہے۔''

مرتب نے اس کا خیال رکھتے ہوئے ایسے سلاموں کی نشان دہی کی ہے، جن کے تخلیق کاروں کے نام اب بھی مشتبہ ہیں۔

زیر تبصرہ مجموعے سے قبل 'گلدستۂ انیس' اور 'تجلیات انیس' کے نام سے انیس کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، لیکن ان سب میں سب سے زیادہ جامع و مانع مجموعہ علی جواد زیدی کا ترتیب دیا ہوا 'انیس کے سلام' ہے۔ اس مجموعے کا بنیادی ماٗخذ ریاست محمود آباد کے کتب خانے میں موجود انیس کے سلاموں کا نادر مجموعہ ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع اس کتاب کی طباعت میں عمدہ کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔

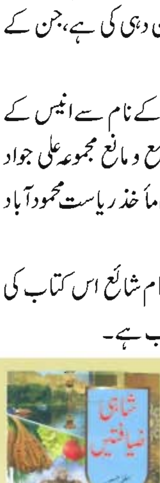

شاہی ضیافتیں

مصنف: سلمیٰ حسین

صفحات: 148، قیمت: 125 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 25

مبصر: طلعت جمال

یہ کتاب کل پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ جناب پون ورما صاحب نے سلمیٰ حسین کی کتاب پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ '' یہ کتاب واقعتاً ہماری تاریخ اور ہماری تہذیب کا روشن آئینہ ہے۔''

مغلوں کا شجرہ نسب 1494 سے 1862 تک مغل دور حکومت کا مختصر و مکمل خاکہ ہے۔ دیباچہ کے زیر عنوان اس حقیقت کا انکشاف کہ سلطنت مغلیہ کے حکمراں اصلاً ترکی نژاد تھے، لیکن ان کی رگوں میں ایرانی، تورانی اور ہندوستانی خون بھی دوڑ رہا تھا۔ ہندوستانی مسالے ایران و ترکی سے لیے گئے تھے۔ خشک میوے اور زعفران کے تال میل سے ایسے کھانے ایجاد ہوئے جو نہ صرف دیکھنے میں خوش رنگ بلکہ انتہا سے زیادہ خوش ذائقہ بھی تھے۔ مغل بادشاہوں کے کارنامے دیباچے میں نہایت ہی سلیقے و خوبصورتی اور مکمل طریقے سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ مصنف نے لکھا ہے کہ مغل بادشاہوں کے کھانے میں مسالوں کا استعمال بہت مختصر ہوا کرتا تھا۔ زیرہ، دھنیا، ادرک، کالی مرچ، دارچینی، لونگ اور سفوف جیسے مسالوں کے استعمال سے کھانے تیار کیے جاتے تھے۔ بادام، پستہ، اخروٹ، خشک زرد آلو، آلو بخارہ اور کشمش جیسے خشک میوے سے کھانے تیار کیے جاتے تھے۔

مصنف نے مختصر مگر جامع طور پر مغل بادشاہوں کے سوانح حیات اور ان کے کارنامے بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر سے لے کر آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اور ان کی شاہی ضیافتوں کا حال دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ محترمہ موصوف نے لکھا ہے کہ کھانا پکانے کا پانی جمنا اور دریائے چناب سے لایا جاتا تھا۔ تھوڑی مقدار میں گنگا کا پانی اور بارش کا پانی بھی شامل کرنے کے بعد پانی کا یہ ذخیرہ باورچی خانے میں محفوظ رکھ دیا جاتا تھا۔

'کھانا پکانے کے چند اصلاحات' کے تحت مصنف نے لکھا ہے کہ دم دینے کا طریقہ یہ ہے کہ نیم پختہ یا پختہ کھانے کو ہانڈی میں رکھ دیا جاتا ہے۔ ہانڈی پر ڈھکن رکھ کر اسے چاروں طرف گندھے آٹے سے بند کر دیا جاتا ہے تاکہ بھاپ باہر نہ نکل پائے۔ ڈھکن پر ہلکے جلے انگارے رکھے جاتے ہیں۔ نیچے چولھے میں بھی آنچ دھیمی ہونا چاہیے۔ یہ طریقہ ایران سے لایا گیا تھا، جسے ہندوستان میں عام کر دیا گیا۔ اس طرح پکوان خوشبو سے بھرا نہایت ہی لذیذ ہو جاتا ہے۔ گوشت اور خشک میوے کا پلاؤ جسے میوالی پلاؤ کہتے ہیں عام گھروں میں آسانی سے بنایا جاسکتا ہے۔ محترمہ نے لکھا ہے کہ بابر کے عہد کے پکوان آٹھ قسم کے ہوتے تھے۔ کتاب میں اس عہد کے ظروف کا بھی ذکر موصوفہ نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ ظروف کی چند تصاویر بھی دکھلائی گئی ہیں۔ سب سے بڑی اور اہم بات جس کا اس کتاب میں مصنف نے ذکر کیا ہے وہ یہ کہ شہنشاہ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سوانح کے ساتھ ضیافتوں کا ذکر نہایت مختصر مگر جامع انداز میں درج کیا گیا ہے جو موجودہ نسل کے تاریخ کے طلبا و طالبات کے لیے بہترین معلومات فراہم کرتی ہے۔

مصنفہ نے صفحہ 133 پر بہادر شاہ ظفر کے کھانوں کا ذکر کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ شاہ کا دسترخوان صرف مرچ مسالوں کا کھیل نہیں تھا بلکہ طب یونانی کے تانے بانوں میں بنا ہوا کرتا تھا۔ مسالوں اور خشک میووں کے تال میل سے متنوع، لذیذ اور معطر ہوا کرتا تھا۔ ہرن کے گوشت کا کباب، مرغ مُسلّم، تلے اور بھنے تیتر، بٹیر، دہی اور مسالوں میں ڈوبی مچھلی اور گوشت کے پکوان، رات بھر ہلکی آنچ پر پکے بھیڑ کے سینے کا گوشت، بکری کے شوربے میں پکائی گوبھی مسلم وغیرہ بہت سارے قسم کے پکوان سے ان کا دسترخوان سجا رہتا تھا۔

آخر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی کوششوں کو مبارکباد دینا چاہوں گی کہ کم قیمت پر اچھی اچھی کتابیں شائع کر کے اردو زبان کو فروغ دے رہی ہے۔

بھولی بسری کہانیاں

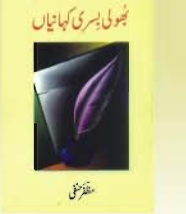

مصنف: مظفر حنفی

صفحات: 440، قیمت: 230 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ممتاز الحق، E-227 ابوالفضل انکلیو II، نئی دہلی

مظفر حنفی کی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے ادب سے ہوا مگر سنہ پچاس کے آس پاس انھوں نے بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا اور ابتدا افسانہ نویسی سے کی اور تقریباً ایک دہائی تک اس میدان میں جس سنجیدگی اور انہماک کا مظاہرہ کیا اس کے پیش نظر اس وقت کے اکابرین ادب نے انھیں مستقبل کے ایک کامیاب افسانہ نگار کے طور پر دیکھا۔ مظفر حنفی نے 1950 سے 1962 کے دوران کل ستاون چھوٹے بڑے افسانے لکھے اور اسی دور میں یہ برصغیر کے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے بھی۔ البتہ یہ کتابی صورت میں ذرا دیر سے پیش کیے جا سکے۔ ان کا پہلا مجموعہ 'اینٹ کا جواب' تھا جو 1967 میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ 'دوغنڈے' 1969 میں اور تیسرا مجموعہ 'دیدۂ حیراں' 1970 میں شائع ہوا۔ 'بھولی بسری کہانیاں' انھیں تینوں مجموعوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے گویا یہ افسانوں کی کلیات ہے۔

مظفر حنفی کے یہ افسانے اپنے دور کے افسانوی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں اس میں سادہ لیکن دلکش زبان میں اپنے ماحول اور گرد و پیش میں پھیلی ہوئی زندگی کی داستانیں لکھی گئی ہیں۔ انھوں نے مقصد کو پس پشت ڈال کر کہانیوں کو رنگین اور دلآویز بنانے کی کوشش نہیں کی ہے ان کا مشاہدہ باریک ہے وہ زندگی کی ناہمواریوں پر کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ دو ٹکے کا آدمی، منت کی چادر جیسی کہانیوں میں انھوں نے سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ افسانہ 'ایمان کی بات' کا مرکزی کردار نذیر بابا کافی متاثر کن ہے۔

مظفر حنفی کے ان افسانوں کو ان کے عہد میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ 'اینٹ کا جواب' کا پیش لفظ فراق گورکھپوری نے لکھا ہے 'دوغنڈے کا تعارف' کرشن چندر نے پیش کیا ہے اور 'دیدۂ حیراں' پر اظہارِ خیال کنہیا لال کپور نے کیا ہے ان اکابرین کے علاوہ رشید امجد، عابد سہیل، کلام حیدری، رتن سنگھ، پروفیسر اکبرالدین صدیقی، ڈاکٹر عبدالودود، نثار احمد فاروقی، غلام مرتضیٰ راہی، اور ضیا حسنی وغیرہ نے ان افسانوں کی سادگی، برجستگی، واقعیت نگاری کہانی کی مقصدیت اور اس کے طنزیہ انداز بیان کا اعتراف کھلے دل سے کیا ہے۔

'بھولی بسری کہانیاں' کی سبھی کہانیاں مجموعی طور پر مشاہدات و تجربات پر مبنی ہیں اور حقیقت آمیز فضا میں سانس لیتی ہیں۔ ان کے موضوعات گرد و نواح سے اخذ کیے گئے ہیں اور ان میں زندگی کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔

ابتدائیہ میں مظفر حنفی نے لکھا ہے کہ میرے سابقہ افسانوی مجموعوں پر جو تبصرے اور تنقیدیں کی گئی ہیں ان میں زمانۂ تصنیف کو نظر انداز کر کے موجودہ افسانوی روش کے پیمانے پر ناپ تول کے بعد رد و قبول کے فیصلے کیے گئے جبکہ کسی تخلیق کی صحیح قدر و قیمت اس کے زمانۂ تصنیف کو ذہن میں رکھ کر آنکی جانی چاہیے۔

حقیقت یہی ہے کہ موجودہ افسانوی رجحانات اور تنقیدی رویوں کی روشنی میں ان پچاس ساٹھ سال پیشتر لکھی گئی کہانیوں کے ساتھ ہم انصاف نہیں کر سکتے۔

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

آسان اصول شاعری

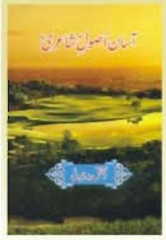

مصنف: دلکش بدایونی

صفحات: 182 قیمت: 175، سنہ اشاعت: 2015

مطبع: نعمانی پرنٹنگ پریس، بارود خانہ گولہ گنج لکھنؤ۔

مبصر: ایاز احمد، ریسرچ اسکالر

روم نمبر 311، ستلج ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اردو شاعری میں زمانۂ قدیم سے استادی و شاگردی کی روایت رہی ہے، لیکن بیسویں صدی کے نصف آخر تک آتے آتے یہ روایت تقریباً ختم ہو گئی۔ نتیجتاً ہمارا شعری نظام بے راہ روی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ فی زمانہ ہر گلی کوچے میں آپ کو دو چار شاعر ضرور مل جائیں گے، لیکن اصول شاعری کا علم رکھنے والے خال خال ہی نظر آئیں گے۔ اردو میں اصول شاعری اور (صنائع بدائع یا فصاحت و بلاغت) پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دلکش بدایونی نے 'آسان اصولِ شاعری' لکھ کر اس کمی کو اپنے طور پر پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

دلکش بدایونی نے اس کتاب میں علم عروض پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ عروض کی مبادیات پر جس قدر تفصیل سے انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے، اس سے فن پر ان کی مضبوط گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے عروض کی ایک ایک باریکی پر نہایت دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ فن عروض کی تاریخ پر بھی ان کی نظر ہے، جس کا اندازہ کتاب میں شامل عروض کی مختصر تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہوتا ہے۔

علم عروض کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اس فن کی بنیادی چیزوں مثلاً بحر، ارکانِ بحر اور ارکان کے اجزا کو نہایت تفصیل کے ساتھ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ ارکان اور ان کے اجزا کو واضح کرنے کے لیے نقشہ جات تیار کیے گئے ہیں تاکہ ایک مبتدی کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ علم عروض میں ایک مشکل امر زحافات کے عمل کو سمجھنا ہے۔ فاضل مصنف نے اس پیچیدہ عمل کو بھی اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ قاری کی دلچسپی از خود بڑھتی جاتی ہے۔ بحروں کے بیان میں موصوف نے پہلے ایک سالم بحر پھر اس کی مزاحف بحروں کو درج کیا ہے۔ ہر بحر میں اشعار کی تقطیع کر کے تقطیع کے اصولوں کو عملی شکل میں پیش کیا ہے۔ نیز تقطیع کے لیے خوبصورت اشعار بھی درج کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اردو بحروں کے ساتھ ساتھ مماثل ہندی بحریں بھی پیش کر دی گئی ہیں، جس سے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہندی عروض سے بھی کماحقہٗ آگاہی ہو جاتی ہے۔

اشعار کی تقطیع کرتے وقت صاحبِ کتاب نے ایک ایک حرف کی بھرپور وضاحت پیش کی ہے کہ تقطیع کرتے وقت کس طرح کوئی حرف ساقط کر دیا جاتا ہے یا کس طرح اضافتوں کو ایک مستقل حرف کی حیثیت دے دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ رباعی کے چوبیس اوزان کو علاحدہ نقشہ بنا کر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں بھی احتیاط سے کام لیتے ہوئے شجرۂ اخرب اور شجرۂ اخرم کے لیے الگ الگ نقشے بنائے گئے ہیں۔

علم عروض میں قافیہ و ردیف کی اہمیت مسلّم ہے۔ صاحب کتاب نے اس باب میں کافی طویل بحث کی ہے۔ قافیہ اور اسقام قافیہ پر مصنف نے بڑی کارآمد گفتگو کی ہے، لیکن ردیف کے ضمن میں بحث طویل ہونے کے باوجود چیستاں ہو کر رہ گئی ہے اور مصنف موصوف غیر ضروری مباحث میں الجھ گئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر قاری کو ایک طرح کی اکتاہٹ کا احساس ہونے لگتا ہے۔

محاسنِ شعر اور معائبِ سخن پر بھی مختصراً گفتگو کی گئی ہے، نیز صنائع لفظی و معنوی کا بھی ذکر کیا گیا ہے، تاہم اس باب میں تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ محاسن و معائب پر بات

کرتے ہوئے کم سے کم مثالیں پیش کی گئی ہیں بلکہ بعض اصطلاحات کے لیے تو مثالیں درج ہی نہیں کی گئی ہیں۔ اسی طرح صنائع کے ذیل میں بھی مثالوں کی عدم موجودگی کھٹکتی ہے۔ضرورت تھی کہ اس طرف خاطر خواہ توجہ دی جاتی۔

عروض سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک نہایت قیمتی اور علمی تحفہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ مصنف کی یہ کاوش علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

علیم اللہ حالی حیات اور شعری و تنقیدی خدمات

مصنف: ڈاکٹر فہیم احمد

صفحات: 260، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ 4

مبصر: غلام صمدانی

ریسرچ اسکالر، جے این یو، نئی دہلی

پروفیسر علیم اللہ حالی اردو زبان و ادب کے معتبر و مشہور تنقید نگار، شاعر اور صحافی ہیں۔ 1966 میں انھوں نے تدریسی میدان میں قدم رکھا اور 2001 میں مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کے صدر شعبہ اردو کے عہدے سے سبکدوش ہوئے، تا حال تخلیقی، تنقیدی اور دیگر ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔علیم اللہ حالی صحافتی میدان میں بچپن سے ہی دلچسپی رکھتے ہیں انھوں نے کئی رسالوں کی سربراہی و ادارتی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا ہے اور فی الوقت ایک رسالہ ’انتخاب‘ نکال رہے ہیں، تنقیدی تحریروں کے ذریعے برصغیر میں اہم نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں، شاعری میں بھی وہ استادانہ ملکہ رکھتے ہیں۔

’علیم اللہ حالی: حیات اور تنقیدی و شعری خدمات‘ میں فہیم احمد نے حالی کی پوری ادبی زندگی کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے انھوں نے حالی کی ابتدائی تحریری نمونوں کا عمدہ مطالعہ پیش کیا ہے، خاص طور سے بچوں کا رسالہ ’پیارا‘، دیواری اخبار ’عذرا‘، شادی کے موقع پر لکھی گئیں تہنیتی نظموں، متعدد رسالوں کے اداریے اور ملک و بیرون ملک میں دیے گئے انٹرویو سے ماخوذ اقتباسات کے ذریعے حالی کی شخصی، ادبی، سیاسی، سماجی اور انتظامی جہات کی تعیین میں عمدہ تحقیق کی جتن کی ہے۔ اس کتاب میں حالی کی جملہ تخلیقات و تالیفات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور حالی کے زمانے کے حالات و ادبی رجحان کے پس منظر میں ان کی تخلیق و ادبی نقطۂ نظر کا تنقیدی اور تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فہیم احمد نے اس کتاب میں سات ابواب قائم کیے ہیں، ہر باب کا موضوع مستقل اہمیت کا حامل ہے۔ پہلا باب ’پروفیسر علیم اللہ حالی: نقوش حیات‘ ہے، اس میں حالی کے حسب و نسب اور ذاتی زندگی کے تدریجی مراحل کو مختلف حوالوں کی روشنی میں بخوبی اجاگر کیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ’ترقی پسند تحریک کا زوال اور آفتاب تازہ کا ورود‘ ہے اس میں ترقی پسند تحریک کے زوال کے بنیادی اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے بدلتے ہوئے حالات اور روایتی و جدید ادبی سرمائے کو پیش نظر نہیں رکھا، نہ ہی تغیراتی تجسس کو محسوس کیا، محض شدت پسندانہ سکہ بند نظریات سے مغلوب رہے اور ماضی کے ادبی سرمائے کو غیر ضروری سمجھنے لگے۔ اس دور میں علیم اللہ حالی نئے فکری ابعاد اور اور جداگانہ شعری لہجے کی بازیافت سے روایت و انحراف کے درمیان توازن کی راہ کیسے نکالتے ہیں اس کا بہت مختصر جائزہ اس باب میں لیا گیا ہے۔

’بہار میں جدید شعر و ادب کا تشکیلی دور‘ تیسرے باب میں اس عنوان کے تحت بہار کے قدیم و جدید شعرا و ادبا کی اردو زبان و ادب کی خدمات کا جائزہ تحقیقی طریقے سے لیا گیا ہے، وہاں کی آب و ہوا میں پروان چڑھنے والے ادبی ماحول کا بھی ذکر ہے۔ ڈاکٹر فہیم احمد نے دبستان عظیم آباد کا دیگر دبستانوں سے تقابل کرتے ہوئے اسے دہلی اور لکھنؤ کے دبستان کے ہم پلہ قرار دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ دبستان عظیم آباد کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

چوتھا باب ’علیم اللہ حالی کی تخلیقات و تالیفات: ایک تعارف‘ ہے، اس باب میں حالی کی جملہ تخلیقی و تنقیدی تحریروں کے مجموعے و کتب کے ساتھ ساتھ صحافتی خدمات کا تعارفی خاکہ پیش کیا ہے، ان میں شعری مجموعے سنگ میل: 1971، سفر جلتے دنوں کا: 1978، نخل جنوں: 1989، مضامین کے مجموعے: احتساب: 1981، اعتبار: : 1986، پاکستان کے سفر کی روداد، ہم مسافر جہاں پہنچے: 1994، تنقیدی تحریروں اور صحافتی شذرات کا مجموعہ شاہیں: 1996، اور ایک مونوگراف پرویز شاہدی: 2000 کا جامع تعارف ہے، ڈاکٹر فہیم احمد نے ان تمام مجموعوں کے مشتملات کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ ان کے مواد و موضوعات تک بآسانی رسائی حاصل ہو سکتی ہے، اس باب کے آخر میں حالی کے تازہ ترین مضامین کا مجموعہ ’فرد و فن‘ کا بھی ذکر ہے جس میں کل انتیس مضامین ہیں، زیر تبصرہ کتاب کے اس باب کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ ان سبھی مجموعوں میں موجود نظموں، غزلوں اور مضامین کی تفصیل کے ساتھ صفحات کی تعداد اور دیگر معلومات کو فہیم احمد نے بالتفصیل بیان کیا ہے۔

پانچواں باب ’علیم اللہ حالی بحیثیت شاعر‘ ہے، اس میں حالی کی شعری تخلیقات پر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار تنقیدی اور تجزیاتی طریقے سے کیا ہے اور شاعری میں حالی کا مقام متعین کرتے ہوئے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ حالی غزل کے مقابلے میں نظم گوئی میں مہارت رکھتے ہیں نیز آزاد شاعری کی جانب وہ زیادہ مائل ہیں۔

چھٹا باب ’علیم اللہ حالی بحیثیت نقاد‘ ہے اس باب میں حالی کے تنقیدی افکار و خیالات کے چند گوشوں پہ تحقیقی نمونے موجود ہیں، اردو تنقید میں حالی کی اہمیت و اعتبار پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ حالی کے تنقیدی مضامین نہ صرف اردو ادب کے تنقیدی مسائل کا حل پیش کرتے ہیں بلکہ تنقید کے نئے طریقہ کار اور جدید افکار و نظریات کی بنیاد فراہم کرتے ہیں اور قاری کو مختلف تنقیدی جہات پہ غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ حالی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ’اعتبار‘ کے بارے میں فہیم صاحب نے لکھا ہے کہ ’’یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جن کے مطالعہ سے مختلف موضوعات پر ان کی گرفت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔‘‘

’علیم اللہ حالی کی صحافتی خدمات‘ ساتواں اور آخری باب کا موضوع ہے، اس باب میں ڈاکٹر فہیم احمد نے سب سے پہلے ’بہار‘ میں اردو صحافت کی تاریخ پر مختصر اور جامع روشنی ڈالی ہے اس کے بعد تقسیم ہند کے بعد بہار سے شائع ہونے والے اردو رسائل و جرائد کی فہرست کو ترتیب دیتے ہوئے موجودہ دور میں اشاعت پذیر رسائل، جرائد اور اخباروں کو بھی ضبط تحریر میں لایا ہے، فہیم احمد بھی چونکہ مدرس اور ادیب کے ساتھ ساتھ ایک صحافی ہیں، اس میدان میں تقریباً دس بارہ سالوں کا تجربہ رکھتے ہیں لہٰذا انھوں نے صحافیانہ طریقہ جستجو کو بروئے کار لاتے ہوئے حالی صاحب کے زمانہ طالب علمی کی تحریروں سے لے کر موجودہ دور کی تحریروں تک رسائی حاصل کی اور ان کی جملہ صحافتی تحریروں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

اگرچہ اس کتاب میں حالی صاحب کی شعری و نثری تحریروں سے طویل اقتباس کی مقدار زیادہ ہے لیکن مصنف نے مختصر اور جامع طریقے سے چند ایسے نکات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ آئندہ ان پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب بنیادی ماخذ اور مشعل راہ ثابت ہوگی۔

اُردوشاعری میں گیتانجلی

شاعر: انور جلال پوری
صفحات: 160 قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دلشاد کالونی، دہلی
مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف علامہ اقبال اسٹریٹ سنبھل

اردو کے معروف شاعر 'انور جلال پوری' کی تحریر کردہ 'اردو شاعری میں گیتانجلی' بنگلہ زبان کے مایۂ ناز شاعر 'رویندر ناتھ ٹیگور' کی گیتانجلی کے مفہوم کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ جس کو انور صاحب نے بڑی ہی لیاقت و مہارت کے ساتھ اردو کا قالب پہنایا ہے۔

کتاب کے آغاز میں اور میرا قلم' عنوان کے تحت خود مصنف کے ذریعے تحریر شدہ ان سطور سے ہوتا ہے جن میں کتاب کی غرض و غایت اور اس کی اہمیت و افادیت کے ساتھ ہی عالمی ادب میں اس کے مقام و مرتبے کی نشاندہی کرائی گئی ہے۔ اس کتاب کے اصل متن کے خالق رویندر ناتھ ٹیگور کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تراجم پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد ترجمے کے فنی تقاضے اور اس کی باریکیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد فلسفہ و روحانیت میں ڈوبے ہوئے کلام کا منظوم ترجمہ جس کی نزاکت و باریکی کو اہل فکر و قلم خود ہی سمجھ سکتے ہیں اور انور صاحب کی صلاحیت و ہنر کی داد دے سکتے ہیں۔

اس کتاب میں شاعر نے 103 نغموں کے اندر رویندر ناتھ ٹیگور کی فکر اور ان کے کلام کے مفاہیم کو پیش کیا ہے۔ کتاب میں پیش کی گئی نظموں کے لیے مصنف نے نیاز فتح پوری اور فراق گورکھپوری کے اردو تراجم کو بنیاد بنایا ہے۔ ان میں اکثر نغمے روحانیت اور فلسفۂ حیاتِ انسانی سے پُر ہیں۔ ٹیگور خود ایک اعلیٰ فلسفی و روحانی شاعر ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں اعلیٰ درجے کی رفعت و بلندی اور ندرت و بانکپن ہے جس کو مترجم نے بڑی ہی ہوشیاری و چابکدستی کے ساتھ اردو کے شعری قالب میں ڈھال دیا ہے۔ جو ان کے ایک قادر الکلام شاعر اور کامیاب مترجم ہونے کی عمدہ مثال ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے ٹیگور کی جن نظموں کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ ان میں خدا شناسی کے طور پر۔ تو میری زندگی کی روح ہے، وہ سارے لوگ، میرے مالک مری ہستی، میں تجھ کو چاہتا ہوں، مرا دل سوکھ کر، خدائے آسماں تو ہے، تو ہی آسماں، تری بخشش، تو ہے خورشید، مجھے ہے فخر ہے۔ معرفت کی حیثیت سے۔ تری مرضی بنایا تو نے، مرے مالک میں کیا جانوں، اجازت ہو تو لمحہ بھر، ارے ناداں تو خود کیوں، مرے محبوب آخر تم کہاں ہو، مرے مالک نے، اے مرے دیوتا مجھ کو، رواں ہے میری رگ رگ میں، وہی ہے جو، انسانی زندگی کے حوالے سے۔ تم اس سے پہلے، وہ بچہ ہر جگہ، محبت کے سفر پر، جلاؤ روشنی دل کی، تمھارے ہاتھ کا کنگن، مجھے غم ہے۔ اور دنیاوی تقاضوں کے ترجمان کی شکل میں ان نظموں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بستی ہے بے کسوں کی، سفر کا وقت بھی لمبا، جو بادل آسماں پر ہیں، کہاں جاتے ہو تم، بہت مضبوط ہیں بندھن، تمھارا دل تھکا ہے، سمندر کے کنارے ہی، وہ پیاری نیند، فرشتہ موت کا، اے مری موت آ کر، مجھے معلوم ہے اک روز، میں چھٹی پا گیا ہوں، میں اس دنیا سے جب۔ ان کے علاوہ کتاب میں شامل اور بھی نظمیں بڑی اہم اور قابل مطالعہ ہیں۔

یہ کتاب روحانی و اخلاقی اعتبار سے بہت اہم دستاویز ہے۔ انور صاحب کے فن و علم کی جتنی بھی داد دی جائے وہ کم ہی ہے کہ انھوں نے دوسرے شخص کے مفہوم کو اتنی چابکدستی اور حسن و سلیقے کے ساتھ منظوم اردو کا جامہ پہنایا ہے کہ یہ نظمیں ترجمہ نہ ہو کر بذات خود اردو ہی کی نظمیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سادگی، سلاست، روانی کے ساتھ ہی فنی و عروضی خوبیاں بھی ہیں اور تقریباً ہر ایک نظم کی ہی بحر مترنم ہے۔ جس سے پڑھنے والے ہر ایک شخص پر ایک عجب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو ان نظموں کے خالق کا مقصد بھی رہا ہے۔ چونکہ ٹیگور خود روحانیت کے شاعر تھے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں فنی نکات ہونے کے ساتھ ہی مفاہیم کی بلندیاں بھی ہیں۔ جن کو بحسن و خوبی انور صاحب نے اردو نظموں میں سمو دیا ہے۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ہر اعتبار سے قابل مطالعہ ہے۔ اگر چہ نام 'اردو شاعری میں گیتانجلی' زیادہ مناسب نہیں ہے۔ اور اس نام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری میں گیتانجلی کے جو تراجم ہوئے ہیں اس کتاب میں ان کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ یہ کتاب انور صاحب کے اپنے ہی زور قلم کا نتیجہ ہے۔ کاغذ و طباعت کے اعتبار سے یہ کتاب پوری طرح معیاری ہے۔ اور سرورق بھی معنی خیز ہے۔

ادبی تھیوری، شعریات اور گوپی چند نارنگ

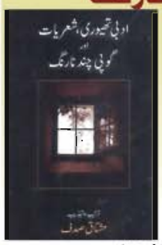

مرتب: مشتاق صدف
صفحات: 384، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: جابر زماں
134 ستلج ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

اردو تنقید میں تھیوری کی بحث کا آغاز حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری (1893) سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد بڑی تبدیلی ترقی پسند تحریک کے زمانے میں آئی۔ آزادی کے بعد جدیدیت کے نظریاتی مباحث نے اسے نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ ترقی پسند عہد میں مارکسزم کے زیر اثر ادب کی انقلابی لَے پر توجہ مرکوز کی گئی اور جدیدیت نے مقصدیت کے ساتھ متن کے سماجی سروکار کی نفی کی۔ تغیر ناگزیر عمل ہے۔ وقت اور حالات تبدیل ہوتے ہیں۔ صورت حال بدلتی ہے۔ اسی کے زیر اثر ادب میں تازہ افکار آتے ہیں اور نئی شعریات کی تشکیل کرتے ہیں۔ تنقید اور تھیوری اسے نظریاتی اساس فراہم کرتی ہے۔ ادھر دو تین دہائیوں سے ہماری ثقافتی صورت حال تبدیل ہوئی ہے۔ لوگوں کی ضرورتیں بدلی ہیں۔ یہ تبدیلی کہیں واضح اور کہیں دھندلی نظر آتی ہے۔ جدیدیت نے جس طرح کے ادبی ماڈل پر اصرار کیا تھا وہ تبدیل ہو چکا ہے۔ تھیوری 'نیو کریٹی سزم' سے آگے کے مراحل طے کر چکی ہے۔ ناقدین نے اس تبدیلی کو 'مابعد جدیدیت' سے تعبیر کیا ہے۔

اردو میں جن ناقدین نے مابعد جدید مباحث کی جانب توجہ دی ان میں گوپی چند نارنگ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ گوپی چند نارنگ کی تنقید کے طویل سفر کے کئی سنگ ہائے میل ہیں۔ ان کے روش نقد پر سنجیدگی سے لکھنے والے کے سامنے سب سے بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ وہ کس پہلو پر گفتگو کرے اور کسے چھوڑے۔ گوپی چند نارنگ کی ہر تحریر کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ ضرور فراہم کرتی ہے جو فکر و فہم کو برانگیخت کرنے کا باعث بنتی ہے۔ جاننے کی جستجو کا جذبہ ان کے یہاں ہمیشہ تازہ دم اور سرگرم کار رہتا ہے۔ نفسیاتی سطح پر یہ چیز انھیں یوں بھی خوش آتی ہے کہ ان کا ذہن لچک دار ہے۔ وہ جہاں کہیں اصول سازی کی طرف راغب ہوئے ہیں اس میں تبدیلی کی گنجائش ضرور رکھی ہے۔ اس طرح پروفیسر نارنگ تحکم اور مطلقیت سے ہمیشہ اپنا دامن بچا کر چلتے ہیں۔ نارنگ صاحب کی تنقید کی سب سے بڑی قوت اس کا طرزِ استدلال ہے۔ جسے نئے علوم کے حوالوں سے مستحکم بنانے کا ان کا اپنا انداز ہے۔ گوپی چند نارنگ کسی نظریے یا تھیوری پر نہ تو پوری طرح کبھی کاربند نظر آئے اور نہ کبھی کسی تھیوری کو انھوں نے کلی صداقت پر محمول کیا ہے۔ یہی وہ متبادل صورت ہے جو انھیں ان کے دیگر معاصر نقادوں سے جداگانہ شناخت عطا کرتی

ہے۔ پس ساختیاتی مباحث کی بنیاد پر جن ترجیحات کو تنقید کے ایک نئے ماڈل کے طور پر انھوں نے پیش کیا ہے۔ اس میں عالمی ادبی فکر کے ساتھ اپنی زمین اور ثقافت کا حوالہ بھی مندرج ہے۔ گوپی چند نارنگ نے تھیوری کے افہام وتفہیم میں ایک عرصہ صرف کیا ہے۔ اس دوران ان کے بہت سارے مضامین اور کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اب انھیں مابعد جدید ناقدین میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہ بات پوری ادبی برادری تسلیم کرتی ہے۔ یہ ضروری تھا کہ ان کے اس کارنامے کو شرح صدر کے ساتھ قبول کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا جائے۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے ادبی اور سماجی تنظیم 'سالویشن' نے نومبر 2012 میں ایک سمینار کا انعقاد کیا۔ یہ کتاب اس سمینار میں پڑھے جانے والے مقالوں پر مشتمل ہے۔ نئی نسل کے سنجیدہ شاعر اور ناقد ڈاکٹر مشتاق صدف، پروگرام آفیسر [اردو] ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی؛ اس کے مرتب ہیں۔ کتاب کے آغاز میں انھوں نے ابتدائیہ بھی تحریر کیا ہے جو تھیوری اور شعریات کے ارتقائی مدارج کے ساتھ نئی تھیوری کے اہم مباحث کو روشن کرتا ہے۔

کلیدی خطبہ کے عنوان سے ابوالکلام قاسمی کی وہ تقریر شامل ہے جو انھوں نے سمینار کے افتتاح میں کی تھی۔ اس میں تھیوری اور شعریات کے تئیں نارنگ صاحب کی سنجیدہ کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'کیا آگے راستہ بند ہے؟' کے عنوان سے گوپی چند نارنگ کی تحریر شامل ہے۔ جو نئی ادبی صورت حال کو واشگاف کرتا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے مشعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں جدیدیت کے نظریات اور نئے ماحول میں ان کی معدوم ہوتی شناخت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی اہم کتاب 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' کے عنوان سے ابھی ماضی قریب میں شائع ہوئی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں غالب کو نئے انداز سے دریافت کیا ہے۔ غالب نے جس نئی شعریات کو وضع کیا تھا اسے بودھ فلسفہ اور شونیتا کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے پہلے اردو میں اس حوالے سے اتنی عالمانہ گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ انتظار حسین نے اپنے چند سطری مضمون میں اس کتاب کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔

'گوپی چند نارنگ: ایک عہد ساز دانشور' کے عنوان سے اصغر ندیم سید کا تفصیلی مقالہ ہے۔ اس میں انھوں نے مورخ، محقق اور نقاد کے مابین تفریقی نکات کا ذکر کرتے ہوئے نارنگ کو اردو کا ایسا مورخ قرار دیا ہے جنھوں نے تنقید وتحقیق سے متعلق رہتے ہوئے ادبی تاریخ کو تہذیب وثقافت کے وسیع دائرے میں پرکھنے کی سعی کی ہے۔ 'نئی تھیوری کا تخلیقی رخ' کے عنوان سے نظام صدیقی کا مقالہ ہے جس میں انھوں نے سلیس اسلوب میں اپنے تحفظات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ نئی تھیوری کے امتیازات اور نارنگ کی اولیات سامنے آجاتی ہیں۔ شافع قدوائی نے پروفیسر نارنگ کی نظریہ سازی کے اختصاصی پہلوؤں کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ یہاں بھی ساختیات اور پس ساختیات قضایا کا ذکر ہونا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ دوران بحث متن کے تہذیبی وسماجی سیاق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ شافع قدوائی نے اپنے مطالعہ کو محاوروں اور کہاوتوں کی ثقافتی معنویت تک محدود رکھتے ہوئے اسی تناظر میں نارنگ صاحب کے نظریۂ تنقید کی وضاحت کی ہے۔ شہزاد انجم نے 'پروفیسر گوپی چند نارنگ: ایک عہد ساز نقاد' کے عنوان سے ان کی علمی وادبی فتوحات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ حقانی القاسمی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ گوپی چند نارنگ کی 'مابعد جدیدیت' کی اساس مشرقی افکار میں پوشیدہ ہے۔ وہ مغرب کی پوسٹ ماڈرنزم سے مختلف ہے۔ اس دائرے میں تمام زندہ ادبی افکار شامل ہیں۔ اس لیے اس 'نظر' کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ یہ فکر اتنی وسیع ہے کہ آنے والے دیگر نظریات اس کی وسعت میں ضم ہوجائیں گے۔ مولا بخش نے اپنے مقالے میں 'فکشن شعریات' کا جائزہ اس طور پر لیا ہے کہ پروفیسر نارنگ کی تنقید میں بیانیہ کی مختلف ساختوں اور اس کے اقسام پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے دوران بحث نارنگ کے تنقیدی متن کا جائزہ لیتے ہوئے اصل متون کو بھی پیش نظر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا مقالہ فکشن کے فنی نکات کو بھی واضح کرتا ہے۔

میر انیس اس دور سے متعلق تھے جب لکھنؤ بلکہ پورا ہندوستان سیاسی بحران سے دوچار تھا۔ ان کے مرثیوں میں لکھنوی تہذیب کی تصویریں اس طرح پیوست ہیں کہ انھیں جدا کرپانا مشکل ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اپنے مقالوں میں انیس تنقید پر خاص توجہ دی ہے۔ 'واقعۂ کربلا' کے استعاراتی وثقافتی پس منظر کا جائزہ انھوں نے نئے انداز میں لیا ہے جس نے اس مقالے کی اہمیت وافادیت میں اضافہ کیا ہے۔ اس میں مرثیہ اور واقعۂ کربلا کو تہذیبی تناظر میں دیکھنے کی اولین کوشش ملتی ہے؛ بلکہ یہ کہا جائے کہ نارنگ کے اس مضمون نے تہذیبی مطالعات کو نئی جہت عطا کی تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ مشتاق صدف نے گوپی چند نارنگ کی اسی جہت کو مطالعہ کا موضوع بنایا ہے اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ نارنگ کی تحقیقی/تنقیدی اور علمی جہات کا احاطہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ شمیم طارق، فرحت احساس، ناصر عباس نیر، قدوس جاوید، راشد انور راشد، کوثر مظہری، وسیم بیگم اور ہادی رہبر کے مضامین بھی شامل ہیں۔ ساتھ ہی غضنفر کا خاکہ 'نارنگ کے نورنگ' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تمام مضامین ومقالات معاصر تھیوری اور پروفیسر نارنگ کی مختلف علمی جہات کا احاطہ کرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب 'نارنگ مطالعات' میں اہم پیش رفت ثابت ہوگی۔ کتاب اپنی ترتیب وتزئین کے اعتبار سے بھی قابل دید ہے۔

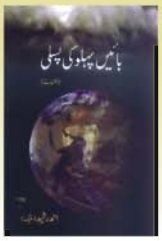

بائیں پہلو کی پسلی

مصنف: احمد رشید (علیگ)

ضخامت: 164 صفحات، قیمت: -/175 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: نوشاد منظر

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'بائیں پہلو کی پسلی' میں اکیس افسانے شامل ہیں جن میں کہانی بن گئی، ویٹنگ روم، بائیں پہلو کی پسلی، بھورے سید کا بھوت، ایک خوب صورت کے علاوہ مداری، نیلم، دھواں دھواں خواب، حاشیہ پر اور وہ لمحہ وغیرہ افسانے قابل ذکر ہیں۔ 'احمد رشید کی افسانہ نگاری' کے عنوان سے مشہور ومعروف تخلیق کار وناقد پروفیسر صغیر افراہیم کی تحریر بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

'بائیں پہلو کی پسلی' کا پہلا افسانہ 'کہانی بن گئی' ہے۔ یہ پوری کہانی ایک ایسی عورت کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے جو جوانی کے بہار سے بڑھاپے کی خزاں کی طرف قدم بڑھا چکی ہے۔ کہانی کا راوی وہی عورت ہے۔ یہ کہانی مکالماتی انداز میں لکھی گئی ہے۔ افسانے میں دو مرکزی کردار ہیں جن کے درمیان افسانوں کی صورت حال پر طویل گفتگو ہی دراصل اس کہانی کا اہم حصہ ہے، احمد رشید نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انسان کی نفسیاتی اور جذباتی فکر کو پیش کیا ہے۔

افسانوی مجموعہ میں شامل ایک افسانہ 'بائیں پہلو کی پسلی' ہے۔ جو اس کتاب کا عنوان بھی ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ کہانی ہے۔ عورت کے ارتقا اور موجودہ وقت میں اس کے سماجی، سیاسی حالات کو افسانہ نگار نے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ راوی خیالوں میں گم اپنے وجود کی تلاش اور عورتوں کے ساتھ ہو رہے ظلم وزیادتی بلکہ ناانصافی کے وجوہات کی تلاش میں ہے۔ افسانہ نگار نے اسے تاریخی تناظر میں پیش کیا ہے۔ کہانی کا آغاز کائنات کی تخلیق سے ہوتا ہے۔ راوی نے عورتوں کی تخلیق اور جنت سے نکالے جانے کے

واقعات کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ عورتوں کی تخلیق، جنت سے نکالا جانا، اپنی محبت کے لیے برسوں جنگل جنگل گھومنا، قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل، ہم جنسوں یعنی بھابھی، دیورانی، ساس، نند اور دوسرے رشتے داروں کے ذریعے ہو رہے ظلم کی وجوہات تلاش کرنے میں سرگرداں ہے۔ راوی ان چیزوں سے پریشان ہی نہیں حیران بھی ہے، اس کا خیال ہے کہ اگر عورت خوبصورت ہے تو اس میں اس کی کیا خطا ہے۔ قتل تو قابیل نے کیا مگر سارا الزام عورتوں پر آ گیا۔ راوی کی حیرت میں اس وقت اضافہ ہو جاتا ہے جب اسے یہ خیال آتا ہے کہ، اس ظلم کے پیچھے جنس مخالف یعنی مرد ہی نہیں بلکہ ہم جنس یعنی عورتیں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ رشتوں کا قتل ہو رہا ہے، بھابھی، نند اور ساس کا ظلم حد سے تجاوز کر گیا ہے، یہی نہیں اس عورت ذات کی دشمن تو خود اس کی ماں ہے جو رحم مادر میں ہی ان معصوموں کا قتل کر دیتی ہے۔ جہیز کے نام پر ظلم میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ عورتوں کو زندہ درگور کر دینے سے بھی لوگ باز نہیں آتے۔ مگر اچانک اسے خیال آتا ہے کہ اس ظلم و جبر سے نجات دلانے کے لیے ایک شخص (یہاں افسانہ نگار کا اشارہ حضرت محمدؐ اور ان کی تعلیمات کی جانب ہے) آیا۔ حضورؐ کی ایک حدیث ہے کہ لڑکیاں خیر و برکت لے کر آتی ہیں۔

افسانہ نگار کا نقطہ یہاں واضح ہو جاتا ہے۔ وہ موجودہ دور میں لڑکیوں کی مجموعی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عورتوں کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا اور اگر کچھ ملا بھی تو مرد بن کر۔ افسانہ نگار نے مرد اور عورت کے رشتے کو بھی پیش کیا ہے۔ افسانہ نگار کا خیال ہے کہ رشتوں میں پیدا ہو رہی تلخی کی اصل وجہ عورتوں کا نوکری کرنا ہے۔ جب میاں بیوی دونوں نوکری کرتے ہیں تو مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کئی بار ازدواجی زندگی بھی خراب ہو جاتی ہے اور رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ احمد رشید نے موجود دور کے ایک اہم مسئلہ کو پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں جس اعتدال کی ضرورت تھی اس کا پورا پورا خیال بھی رکھا ہے۔

مجموعہ میں شامل ایک افسانہ 'فیصلے کے بعد' ہے۔ یہ افسانہ آزادی نسواں پر زور دیتا ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار شفق ہے جو آزادی نسواں کے لیے جدوجہد کو اپنی زندگی کا مقصد اول بنائے ہوئے ہے، وہیں دوسرا کردار آفتاب ہے، جو کھلا ذہن رکھنے کے باوجود شفق کے نظریے سے اتفاق نہیں رکھتا۔ کہانی کار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے آزادیِ نسواں کی حمایت اور مخالفت کو دو کرداروں کے ذہن سے پیش کر دیا ہے مگر اپنا نظریہ واضح نہیں ہونے دیا کہ آخر ان کا جھکاؤ کس جانب ہے۔

'بائیں پہلو کی پسلی' میں شامل ایک افسانہ 'ایک خوبصورت عورت' ہے۔ یہ افسانہ فساد میں تباہ ہوئی ایک عورت کی داستان معلوم ہوتا ہے۔ پوری کہانی مکالماتی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ افسانے کا ایک کردار خیر اور دوسرا شر کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ کہانی ایک ایسے سماج کے اردگرد گھومتی ہے جہاں کی عوام کے لیے ہر بات تفریح ہے۔ اسے خیر و شر سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس کہانی کا ایک کردار وہ شرابی ہے جو بظاہر شرابی اور جواری کے ساتھ ساتھ تمام قسم کی برائیوں میں ملوث نظر آتا ہے مگر اس کے اندر انسانی اقدار زندہ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جب کوئی حادثہ بالخصوص فساد رونما ہوتا ہے تو شرفا آنسو تو ضرور بہاتے ہیں مگر مدد کے لیے آگے نہیں آتے۔ وہ کہتا ہے کہ لوگ مذہب مذہب کی رٹ لگاتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔ دراصل یہ کہانی عورتوں کے استحصال کو بیان کرتی ہے۔ شرابی کا یہ کہنا کہ جسم کے بھوکے لوگ عورت کی آبرو ریزی کرتے وقت یہ تک خیال نہیں کرتے کہ اس کا مذہب خواہ کوئی بھی ہو بنیادی طور پر وہ ایک عورت ہے جو کسی کی بیوی، کسی کی بہن یا کسی کی بیٹی اور ماں ہے۔ افسانہ نگار نے سماج کے ان لوگوں پر بھی طنز کیا ہے جو فساد کے نام پر سیاست تو کرتے ہیں مگر ماحول کو سازگار بنانے کی کوشش نہیں کرتے تاکہ فساد دوبارہ نہ ہو۔

مجموعی طور پر احمد رشید (علیگ) کے افسانوں کا مجموعہ 'بائیں پہلو کی پسلی' میں شامل بیشتر افسانوں کا تعلق عورتوں کے استحصال سے ہے۔ احمد رشید (علیگ) نے موجودہ عہد کے مسائل کو اپنی فنی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ قاری پر فیصلہ صادر نہیں کرتے۔ کتاب کی طباعت اچھی ہے اور قیمت مناسب ہے۔

نکاتِ سخن

مصنفہ: ذکیہ رخشندہ

صفحات: 184، قیمت: 108 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: مصنفہ

مبصر: ڈاکٹر معصوم شرقی، آر ایل بی لین پی او، 743194

حسرت موہانی کی گراں قدر تصنیف 'نکاتِ سخن' ایک عرصہ سے کمیاب رہی ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک باصلاحیت ریسرچ اسکالر ذکیہ رخشندہ نے انتہائی مشکل موضوع کو اپنی تحقیق کا محور بنایا اور نہایت سنجیدگی سے متذکرہ کتاب کے دو حصے 'معائبِ سخن' اور 'نوادرِ سخن' کو از سر نو مدون کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔

حسرت کی ذات ادبیات و سیاسیات کی تاریخ میں کئی اعتبار سے اہم اور قابل لحاظ ہے۔ حسرت کی تصانیف و تالیفات کی فہرست طویل ہے لیکن 'نکاتِ سخن' نظریاتی تنقید پر مبنی ایک وقیع اور بے نظیر تصنیف ہے جو نا قابل فراموش ادبی کارنامہ ہے۔

پیش نظر کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مقدمہ، حسرت کی سوانح، شخصیت، سیاست، شاعری اور ادبی خدمات کا مفصل ذکر ہے۔ باب دوم میں 'نکاتِ سخن' کے دو ابواب یعنی 'معائبِ سخن' اور 'نوادرِ سخن' پر تحقیق و تدوین کا کام بطریق احسن انجام دیا گیا ہے۔ 'نکاتِ سخن' کے ساتھ ساتھ مرتب نے ایک وقیع اور جامع مقدمہ شامل کیا ہے جس سے حسرت موہانی کی شخصیت کے خد و خال واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چونکہ متن کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اس لیے مرتب نے متن شامل کر کے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے نیز متن کی وضاحت کے پیش نظر جگہ جگہ کارآمد حواشی اور دیگر نکات بھی درج کر دیے ہیں جن سے کتاب کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔ سب سے آخر میں حواشی (مصادر و مراجع) کی فہرست بھی شامل کر دی گئی ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی اور ڈاکٹر احمد محفوظ نے 'نکاتِ سخن' پر تقریظ قلمبند کی ہے۔

'نکاتِ سخن' (نظریاتی تنقید) پر کچھ کہنے سے قبل فاضل مرتب نے مشرقی شعریات کے شانہ بشانہ عربی اور فارسی تنقید پر مدلل انداز میں اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ محمد ضیاء الدین انصاری کے بموجب:

''مشرقی تنقید میں کسی نظریے کی مربوط اور منظم شکل نہیں دکھائی دیتی۔ تنقید نگار محض اپنے وجدان سے کلام کے حسن و قبح کو پرکھتا ہے اور اس کے معانی و بیان، الفاظ و محاورہ کی صحت و عدم صحت اور بلندی خیال کو واضح کر دیتا ہے۔'' (ص 48)

اگرچہ حسرت نے نئے شعرا کی رہنمائی کے لیے 'نکاتِ سخن' کی ضرورت محسوس کی تھی لیکن اس سے ان کے تنقیدی نظریات کا واضح علم ہوتا ہے۔ حسرت کی تنقیدی و فنی خدمات کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ذکیہ رخشندہ نے 'نکاتِ سخن' کو 'مشرقی طرز تنقید' کے زمرے میں رکھتے ہوئے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھیں افسوس بھی ہے کہ 'مقدمہ شعر و شاعری' اور 'شعر العجم' کی طرح 'نکاتِ سخن' کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کی وہ مستحق ہے۔ واضح ہو کہ بے پناہ مقبولیت کی بنا پر اپنے دور میں 'نکاتِ سخن' کے چھ ایڈیشن شائع ہوئے۔

قارئین کو عبارات کی بھول بھلیوں سے بچانے کے لیے اصل متون اور تدوینی متون میں نمایاں فرق دکھایا گیا ہے۔ نیز حاشیوں اور حوالوں کے اندراجات کے لیے جو روش اپنائی گئی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

'نکاتِ سخن' سرورق سے آخر تک مطالعے کا متقاضی ہے۔ یقین ہے کہ یہ کتاب قارئینِ ادب کے درمیان شرفِ قبولیت حاصل کرے گی۔

عارف عزیز- ایک تجزیہ

مرتبین: انعام اللہ خاں لودھی، مرضیہ عارف
صفحات: 384، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: عارف عزیز
مبصر: پروفیسر آفاق حسین صدیقی، 37 پانی کی چکی، پرانا قلعہ، بھوپال

'عارف عزیز- ایک تجزیہ' صحت مند صحافت کے علم بردار اور علم و ادب کے مختلف میدانوں کے شہ سوار عارف عزیز کے حالاتِ زندگی کے جائزے، ان کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کے محاسبے ان کی صحافتی خدمات کے محاکے اور علم و ادب کے میدان میں ان کی گوناگوں کاوشوں کے تجزیے پر مشتمل دستاویز ہے۔ تین سو چوراسی صفحات میں پھیلی ہوئی یہ کتاب عارف عزیز صاحب کے سوانحی خاکے، ان کو تفویض کیے گئے چوبیس اعزازات کی تفصیلات، مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ان کے ستانوے مقالات کی تفصیلی فہرست کے علاوہ مرتبین انعام اللہ خاں لودھی اور ڈاکٹر مرضیہ عارف کے پیش لفظ اور پروفیسر خالد محمود کے پرمغز مقدمے کے ساتھ خراجِ تحسین کے طور پر کہی گئی تین شعری تخلیقات اور اکیاون تحریروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کتاب گیارہ ذیلی عنوانات میں منقسم ہے۔ گیارہویں ذیلی عنوان 'تخلیقات کا آئینہ' کے تحت مختلف اصنافِ نثر میں لکھی گئی عارف عزیز صاحب کی گیارہ تحریریں شامل ہیں۔ مقدمے میں خالد محمود نے عارف عزیز سے اپنے گہرے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی شخصی صفات پر روشنی ڈالی ہے اور کتاب کے مشمولات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ دس ذیلی عنوانات میں سے ایک میں عارف عزیز کے بارے میں مشاہیر اور اُن کے احباب کی آرا درج ہیں۔ نو ذیلی عنوانات شامل ہیں جن میں سے دو 'مسافر حرم' اور مساجد بھوپال'، سہ روزہ 'دعوت' نئی دہلی اور رسالہ 'معارف' سے ماخوذ ہیں۔ یہ تفریق اس لیے ہے کہ بعض اہل قلم کے ایک سے زیادہ عنوانات کے تحت لکھی گئی تحریریں شامل کتاب ہیں۔

'شخصیات کے خد و خال' کے ذیلی عنوان کے تحت سات مضامین ہیں، ان میں عارف عزیز کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ان کے کردار و سیرت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے میں شامل تمام تحریریں اگرچہ عارف عزیز کے کردار و سیرت کی امتیازی صفات پر روشنی ڈالتی ہیں لیکن دو مضامین 'عارف عزیز- میدان صحافت میں استقامت کی ایک مثال' (کوثر صدیقی) اور 'میرے ابو' (ڈاکٹر مرضیہ عارف) خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ ان دونوں مضامین کی روشنی میں عارف عزیز ایک سچے مسلمان اور کھرے انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں غالباً یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مذکورہ دونوں صفات کسی بھی فرد کے لیے باعث افتخار ہیں۔ اسی سلسلے میں کتاب میں ذیلی عنوان 'رپورتنگ اور انٹرویو نگاری' کے تحت شامل عارف عزیز صاحب کے بارے میں اشفاق مشہدی صاحب ندوی سے خالد عابدی صاحب کی بات چیت کا عنوان 'داتار کھے آباد اں ساقی تری محفل کو' دیا گیا ہے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں ایک قلندر صحافی نے دوسرے قلندر صحافی کی شخصیت کے بہت سے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے جو عام نظروں سے پوشیدہ تھے۔

کتاب کے ذیلی عنوان 'صحافت کا کارِ جہاں' کے تحت پندرہ تحریریں شامل ہیں۔ صحافت، عارف عزیز کی علمی خدمات کا اصل میدان ہے۔ اس کے علاوہ یہ میدان مختلف النوع علمی ادبی کاوشوں کو بھی اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے مضامین کی فہرست طویل ہونا لازمی تھا۔ ان تمام مضامین میں عارف عزیز کی صحافتی خدمات کا جائزہ ان کی اخبارات میں شائع شدہ تحریروں کی خصوصیات کی روشنی میں لیا گیا ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے دور میں جب عام طور پر صحافت حصول زر کا ذریعہ، نام و نمود اور شہرت حاصل کرنے کا وسیلہ بن گئی ہے اور مصلحت پسندی، مصالحت، جانب داری، اور بے اصولی کا شکار ہو کر اپنے اصل مقصد اور منصب سے دور ہوتی جا رہی ہے عارف عزیز صاحب اپنی دیانت دارانہ کارکردگی سے اردو کی صحت مند صحافت کا بھرم قائم کیے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے کہ کتاب کے گیارہویں حصے میں عارف عزیز کی گیارہ تحریروں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ یہ تمام تحریریں صحافت کے ساتھ خاکہ نگاری، تنقید نگاری، انشائیہ نگاری، کالم نگاری، انٹرویو نگاری، سفرنامہ نگاری، خودنوشت، رپورتنگ، تحقیق جیسے مختلف میدانوں میں ان کے قلم کی جولانی کی غماز ہیں۔ ان تحریروں پر نظر ڈالنے سے جہاں عارف عزیز کی صحافت اور علم و ادب سے متعلق مختلف موضوعات پر مضبوط گرفت کا پتہ چلتا ہے وہیں عوامی، معاشرتی، تہذیبی، تمدنی، معاشی، مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور علمی و ادبی معاملات پر اور حالات پر ان کی گہری نظر اور سنجیدہ غور و فکر کا اندازہ ہوتا ہے اور عارف عزیز بھوپال کے خواجہ حسن نظامی کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ صوری اور معنوی لحاظ سے دلکش اور مفید کتاب 'عارف عزیز- ایک تجزیہ' کی اشاعت کے لیے عارف عزیز مبارکباد کے اور اس کتاب کے مرتبین شکریے کے مستحق ہیں۔

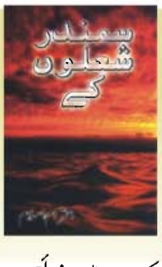

سمندر شعلوں کے

مصنف: احترام اسلام
صفحات: 128، قیمت: 150، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: انجمن پرکاشن، الہ آباد
مبصر: صباعنبرین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

'سمندر شعلوں کے' احترام اسلام کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو کہ اردو میں شائع ہوا ہے۔ اس سے پہلے مجموعۂ 'غزل' ہے تو ہے' اور 'حاضر ہے احترام' ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ احترام اسلام کی شاعری میں فکر و فن کی نمود ملتی ہے۔

احترام اسلام کی شاعری میں زندگی کے مسائل کو بہت دل کش اور خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ زندگی کی حقیقت کو اس کے تمام حقائق کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذہنی انتشار، کمزور عقائد، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، پامال قدریں، احساس کمتری میں مبتلا ہو جانے کی کیفیت، زندگی سے فرار، ذہنی سکون کا فقدان جیسے تمام موضوعات پر انھوں نے قلم اُٹھایا ہے۔

انسانی زندگی وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے جیسے جیسے وقت بدلتا جا رہا ہے ویسے ہی انسانی زندگی کے تقاضے بھی بدلتے جا رہے ہیں اور بدلتے ہوئے یہ تقاضے اس کی زندگی کے کینوس پر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ آج اس دوڑتی بھاگتی زندگی میں انسان کو کہیں سکون نہیں ملتا وہ مشینی انداز میں زندگی گذار رہا ہے۔

ماڈرنائزیشن کے نام پر ان تمام روایتی قدروں کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا گیا ہے جو خلوص، انسان دوستی اور آپسی بھائی چارے کی بنیادوں پر استوار تھیں۔ ان احساسات کو بہت خوبصورت اشعار میں پیش کیا گیا ہے۔

ٹوٹتی جاتی ہیں قدریں ارتقا کے نام پر　　راہ پر آئے ہے یا دنیا بھٹکتی جائے ہے
مٹ رہی ہے اک مکمل نسل اس ارمان میں　　کاش ہم بھی کہہ سکیں جنت نشاں ہے زندگی

ذہنی انتشار، گھٹن کے اس ماحول میں آج ذہنی سکون نہیں ہے۔ زندگی کے مسائل کو حل نہ کر پانے کی صورت میں ہونے والا فرسٹریشن یا ذہنی دباؤ آج ایک بڑا سوال بن کر سامنے ہے جو انسان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر سے جینے کی خواہش کو بھی ختم کرتا جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں انسان موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور یہ وہی حد ہے جہاں ہمیں رشتے ٹوٹتے بکھرتے نظر آتے ہیں۔ ان تمام حالات کو احترام صاحب نے بڑی ذمے داری کے ساتھ بیان کیا ہے:

گھٹن بھرا نفس نفس لہو لہو سی زندگی　　ہمارا عہد تھا کہ بس عذاب ہی عذاب تھا
جب خود ہی ریزہ ریزہ ہوئے جا رہے ہیں لوگ　　بکھرے تعلقات کو کیوں کر سمیٹ پائیں
پیاسی نگاہ ذہن پریشان مردہ روح　　ہر شخص اضطراب کا پیکر دکھائی دے

آپ بھی میری طرح سمندر شعلوں کے پی جائیں مگر
میری ہی صورت آپ کے ہونٹوں پر بھی سلگتی پیاس تو ہو

احترام صاحب کے مجموعۂ کلام میں زندگی اور اس کی حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ امید ہے یہ مجموعۂ کلام قارئین میں مقبول ہو کر اردو ادب میں اضافے کا باعث بنے گا۔

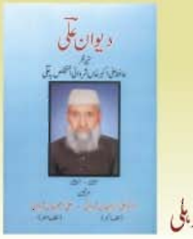

دیوان علی

مرتبین: ڈاکٹر علی اکرم خاں شروانی و علی اسلم خاں شروانی
صفحات: 500، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: مرتبین
مبصر: محمد مقیم، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

حافظ محمد علی اکبر خاں شروانی 1890 میں علی گڑھ کے قصبہ حسن پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان انتہائی دیندار تھا۔ آپ کے دادا اور والد محترم نامور حافظ تھے۔ محمد علی اکبر خاں شروانی نے اپنے والد محترم ہی سے حفظ کیا تھا۔ آپ کی طبع موزوں تھی اور روانی بلا کی تھی۔ 24 اپریل 1976 کو حافظ محمد علی اکبر خاں شروانی اپنے چہیتوں کو داغ مفارقت دے کر مالک حقیقی سے جا ملے۔ ورثے میں انھوں نے جو سرمایۂ سخن چھوڑا اسے ان کے لائق بیٹوں علی اکرم خاں شروانی اور علی اسلم خاں شروانی نے 2014 میں شائع کرا کے مرحوم کی روح کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس خراج عقیدت سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ دیوان علی کے مرتبین کس قدر علم دوست اور ادب پرور ہیں، اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ مرتبین کو اپنے والد مرحوم حافظ محمد علی اکبر خاں شروانی کے تخلیقی اثاثے کی اہمیت کا احساس تھا اور انھوں نے اسے نہ صرف سنجو کر رکھا بلکہ دیر سے سہی لیکن صفحۂ قرطاس کو بھی آراستہ کیا۔ اس اہم سرمایے کو عام کرنے کے لیے مرتبین کو بہت بہت مبارک۔

دیوان علی کی قرأت کے بعد مجھے پروفیسر صغیر افراہیم کے درج ذیل قول سے صد فی صد اتفاق ہے کہ:

آسمان ادب پر بعض ایسے درخشاں ستارے بھی طلوع ہوتے ہیں جن کی روشنی ہم تک اس وقت پہنچتی ہے جب وہ غروب ہو کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہوتے ہیں لیکن جب ہم اس روشنی کی تابندگی اور ضوفشانی کی جھلک پاتے ہیں تو ہماری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور بسا اوقات ہمارے دل میں یہ خواہش بیدار ہوتی ہے کہ کاش اس منبع نور کا دیدار ہمیں اس وقت ہوا ہوتا جب یہ اپنی نورانی کرنوں سے روئے زمین کو منور کر رہا تھا۔

لہٰذا حافظ محمد علی اکبر خاں شروانی آسمان فکر و سخن کا ایسا ہی ضیا پاش اور منور ستارہ ہے جس کا کلام منبع نور ہے اور اپنی نورانی کرنوں سے زمین ادب کو منور کر رہا ہے۔ حافظ صاحب کی تخلیقی قوت اور طبع رواں کا اندازہ ان کے کلام کی وسعت، معیار و مقدار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ گوناگوں خیالات و افکار کا ایک دریا موجزن ہے جس کے سوتے روایت سے پھوٹتے ہیں لیکن معاصر رویوں اور احساسات و جذبات کی موجیں بھی انگڑائیاں لیتی ہیں جن سے ندرت اور تازگی ہویدا ہوتی ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ایک فن کار 500 سے زائد غزلیں کہے اور ایسی کہے کہ مقدار اور معیار قاری کو تحیر میں مبتلا کر دے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ مطلع اور مقطع کے بیچ دو شعر اور غزل مکمل۔ غزل میں اشعار کی یہ قلت شاعر کی موزونیت، فکر سخن اور روانی طبع پر احتجاج کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

قافیوں کی تلاش، ردیف کا انتخاب، نادر استعارات و تشبیہات کے علاوہ جگہ جگہ قرآنی آیات کا استعمال شاعر کی خوب سے خوب تر کہنے کی جستجو کا ترجمان ہے۔

شروانی صاحب کے غزلیہ کلام میں نعتیہ اور منقبت کے اشعار کا غلبہ ہے۔ مجموعی طور پر وہ خیال بند شاعری کے لب و لہجے کے رسیا نظر آتے ہیں۔ شاعر کے میلانات کی وضاحت کے لیے چند اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

لوٹا ہمیں تو نقش کف پائے یار نے　　کیا چال تھی کہ راہ کو روزن بنا دیا
اعجاز کیمیا ہے محبت کے ہاتھ میں　　جس مِس کو مَس کیا اسے کندن بنا دیا
میں نے تنہائی میں جو تیرے تصور سے کہا　　غیر کی محفل میں کیوں کر اس کا چرچا ہو گیا
رویا تھا میں کبھی کہ غریب الوطن ہوا　　اب لوگ رو رہے ہیں کہ جاتا ہوں گھر کو میں

زیر نظر دیوان علی میں پانچ سو سے زائد غزلوں کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، مناجات، مرثیہ، مخمس، مسدس، مثنوی، رباعی، سہرا، منظوم خطوط کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی موضوعات پر نظمیں اور غزلوں اور قصائد پر مشتمل فارسی کلام بھی شامل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دیوان اردو ادب کے سرمایے میں ایک گراں قدر اور قابل توجہ اضافہ ہے۔ ایک بار پھر مرتبین کو مبارک باد اس امید کے ساتھ کہ یہ کلام ادب کے سنجیدہ حلقوں میں سر آنکھوں پر لیا جائے گا۔

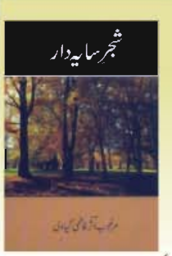

شجر سایہ دار

مصنف: مرغوب اثر فاطمی گیاوی
صفحات: 165، قیمت: 200 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، اودے گیری کالج، اودگیر 413517، لاتور (مہاراشٹر)

مرغوب اثر فاطمی کا تعلق ریاست بہار کے خطے 'گیا' سے ہے۔ اثر صاحب محکمۂ پولس میں ڈی ایس پی کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ بچپن سے شعر و ادب کا ذوق ہے۔ ملازمت کی مصروفیات نے اثر صاحب کو سنجیدگی سے شعرگوئی کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں دیا۔ گاہے گاہے کچھ لکھتے رہے اور اپنے اندر کے شاعر کو زندہ رکھا۔ سبکدوش ہوئے تو ان کے اندر کا شاعر پوری قوت کے ساتھ باہر آ گیا۔ اثر صاحب کی تخلیقی صلاحیتیں اب پورے شباب پر ہیں۔ 2012 میں 'منزل دشوار' نامی شعری مجموعہ منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے دو سال بعد ہی 'شجر سایہ دار' کے عنوان سے ان کا دوسرا مجموعہ بھی قارئین کے ہاتھوں میں آ گیا۔

'شجر سایہ دار' میں 27 نظمیں، 80 غزلیں اور 27 قطعات شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں پہلے مجموعہ کلام پر مشاہیر کی آرا اور تبصرے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ نظمیں پابند بھی ہیں، معریٰ بھی ہیں اور آزاد بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرغوب اثر کو نظم کی تمام ہیئتیں مرغوب ہیں۔ موصوف کی نظمیہ شاعری میں قدیم و جدید دونوں اسالیب نظر آتے ہیں۔ تمام نظمیں ابہام اور

پیچیدگی سے پاک ہیں۔ان کے مافی الضمیر کو سمجھنے میں ذہنی مشقت کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اگر چہ نظمیں بھی قابل لحاظ تعداد میں کہی ہیں لیکن ان کا میلان طبع غزل گوئی کی طرف زیادہ ہے۔ مرغوب اثر کی غزلیہ شاعری بھی واضح اور صاف ہے۔ مرغوب اثر نے حیات وکائنات کے مختلف موضوعات پر شعر کہے ہیں۔ سماجی ناہمواری، سیاسی آلودگی، دہشت گردی، تنگ نظری اور تعصب، اخلاق و کردار، تہذیب وتمدن، غرض ایسے کئی موضوعات ان کی غزلوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ان کے قطعات بھی گوناگوں مضامین کے حامل ہیں۔مختلف غزلوں سے لیے گئے چند اشعار درج ذیل ہیں جن سے مرغوب اثر فاطمی کے خیالات، جذبات اور احساسات کا اندازہ ہوتا ہے:

ہمیں نہیں تو یہ کون ومکان کس کے لیے ۔۔۔ زمین کس کے لیے آسمان کس کے لیے

زہے نصیب جگہ تھوڑی چشم تر میں ملی ۔۔۔ سلگتی دھوپ میں اک سرد سائبان تو ہے

میرے جنونِ شوق پہ سورج بھی دم بخود ۔۔۔ میری ہی سمت سایۂ دیوار کردیا

خندہ پیشانی کے پیچھے مصلحت ۔۔۔ گاؤں تک شہری طریقے آگئے

کوئی تو چیز ہے فہم وگماں سے بالاتر ۔۔۔ کہ اہل علم بھی اکثر فریب کھاتے ہیں

ان اشعار میں ذوق تجسس بھی ہے اور تلاش جہد کی تڑپ بھی ہے۔ رجائی لہجہ بھی ہے اور انسانی وجود کی اہمیت کی طرف لطیف اشارہ بھی۔ جنونِ شوق کا ذکر بھی ہے اور ترکِ مشقت پر طنز بھی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرغوب اثر کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے اور وہ بہت سارے موضوعات کو بڑی تیزی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ وہ اقدار کی شکست وریخت پر نوحہ کناں ہیں۔ زندگی کے تلخ وترش تجربات سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس کا اظہار بھی انھوں نے اپنے طرز و اسلوب میں کیا ہے۔ان کی غزل میں طنز بھی ہے اور جھنجھلاہٹ بھی۔ وہ ماحول اور معاشرہ کو پاک وصاف اور صراطِ مستقیم پر دیکھنا چاہتے ہیں۔اس آرزو کے ساتھ جب وہ اپنے اطراف وجوانب پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کا روحانی کرب شعر کی شکل میں زیب قرطاس ہوجاتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ کی عکاسی کے علاوہ ان کی غزل میں سوز محبت کی چنگاریاں بھی ہیں اور حسن وجمال کی جلوہ گری بھی۔ ہجر ووصال کی حکایتیں بھی ہیں اور عشق کے زمزمے بھی۔ عام فہم اسلوب اثر کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔

مجموعے میں کہیں کہیں الفاظ کا غلط العوام تلفظ اختیار کیا گیا ہے اور اسی کے مطابق مصرعوں کو وزن پہ باندھا گیا ہے۔ فکر وخیال، جذبہ اور احساس قابل قدر ہیں۔اثر معاصر اردو ادب میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ملک گیر پیمانے پر تقریباً سبھی مؤقر جریدوں میں ان کی چیزیں تواتر سے شائع ہورہی ہیں۔الغرض مرغوب اثر فاطمی کا یہ شعری مجموعہ قابلِ مطالعہ ہے۔ اس کا مطالعہ تازگی کا احساس فراہم کرتا ہے۔عرشیہ پبلشرز کی خوبصورت اشاعت نے اسے ظاہری حسن بھی عطا کردیا ہے۔امید ہے کہ قارئین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

متفرقات

مصنف : مظہر حسنین

صفحات : 164، قیمت: 105 روپے

پبلشرز : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر : اشرف لون، 209، جہلم ہوسٹل جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

مظہر حسنین پچھلے کئی سالوں سے ادب، سائنس، ٹکنالوجی وغیرہ جیسے متفرق موضوعات پر لکھ رہے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان کے انھی متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔اس سے پہلے ان کی ایک اور تصنیف ’سائبر دنیا اور اردو‘ قارئین سے داد وتحسین حاصل کرچکی ہے۔

کتاب کو مظہر حسنین نے سائنس، ادب، کریئر، ترسیل و ابلاغ، فلم، متفرقات حصوں میں بانٹا ہے۔سائنس والے حصے کا پہلا مضمون ہے ’نارکوٹیسٹ، اذیت اور جمہوری حقوق‘۔ اس مضمون میں مصنف نے نارکوٹیسٹ کے شروعات کی تاریخ اور اس کے خدوخال کی وضاحت کی ہے۔اس حصے کا دوسرا دلچسپ مضمون ہے ’مچھروں کے خلاف جنگ کتنی کامیاب‘۔ یہ بات نہ صرف مصنف بلکہ میرے لیے بھی کم حیرت ناک نہیں کہ صرف مادہ مچھر ہی انسانوں کو کاٹتے ہیں۔اس کے علاوہ انگلیوں کے نشانات پر ایک معلوماتی مضمون ہے۔مصنف کے مطابق سائنس نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب صرف ہتھیلی کے نشانات سے انسان کی شخصیت، جائے پیدائش، مزاج وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔

دوسرا حصہ ’ادب‘ پر مبنی ہے۔ پہلا مضمون سردار جعفری پر ہے، جس میں مصنف نے سردار جعفری کی ہمہ گیر شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرا مضمون ’اردو ادب پر کربلا کے اثرات‘ ہے۔کربلا کی اردو ادب کو سب سے بڑی دین مرثیہ ہے، جس کا زبان کی سطح پر مطالعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔خصوصاً انیس کے مرثیوں کو اردو ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔اس کے بعد مصنف نے اردو ادب کے ارتقا میں صوفیا کے رول کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ ’کریئر‘ (روزگار) پر مبنی ہے۔اس حصے میں مظہر حسنین نے روزگار سے متعلق بہت سے شعبوں کے بارے میں اپنے دلچسپ انداز میں معلومات بہم پہنچائی ہے۔ان میں کارٹوننگ، ریڈیو جوکی، کمپنی سکریٹری وغیرہ جیسے شعبوں میں روزگار پر اچھی معلومات ہے۔آج کے اس بے روزگاری کے دور میں یہ شعبے روزگار پہنچانے کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

’ترسیل وابلاغ‘ والے حصے میں مصنف نے ٹیلی ویژن اور عوامی ترسیل میں زبان کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ٹیلی ویژن اور زبان والے مضمون میں وہ اس کا ذکر کرنا بھول گئے ہیں کہ کس طرح ہندوستانی پروگراموں میں مغربی پراگراموں کی نقالی کے تحت گالی گلوچ والی زبان در آئی ہے۔مصنف کے نزدیک کمپیوٹر کے لیے ’حاسب‘ کا لفظ ثقیل ہوسکتا ہے لیکن ہم ہمیشہ انگریزی الفاظ کے سہارے نہیں رہ سکتے۔ بلکہ ہمیں انگریزی الفاظ کے اردو متبادل کا استعمال کرنا چاہیے تبھی یہ رواج پائیں گے اور ہماری زبان میں نئے الفاظ آئیں گے۔

کتاب کا پانچواں حصہ ’فلم‘ پر مبنی ہے۔اس حصے میں بالی ووڈ کی مشہور ومقبول فلموں پر تبصرے شامل ہیں۔اس حصے کا پہلا مضمون ’ہندوستانی فلموں میں اردو معاشرہ‘ ہے جو ادھوری معلومات پر مبنی ہے۔اس میں مصنف نے ہندوستان کی ابتدائی فلموں میں مسلم معاشرے کی عکاسی کو موضوع بحث بنایا ہے،لیکن حالیہ برسوں میں بالی ووڈ فلموں میں جس طرح مسلم سماج کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے وہ ایک باضابطہ تحقیق کا موضوع ہے۔ اسی طرح مصنف نے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی فلموں کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ان فلموں میں فراق، فائنل سلوشن، بلیک فرائڈے قابل ذکر ہیں۔ظاہر ہے ان فلموں کے بارے میں لکھنے کا مصنف کا مقصد صرف یہ ہے کہ قاری نام نہاد بالی ووڈ کی ’مین اسٹریم‘ اور ’دبنگ‘ اور عشق بازی کی فلموں سے نکل کر ان فلموں کو دیکھ کر ہندوستان کی اس حقیقت کو بھی دیکھے جس سے ہم دیکھنا نہیں چاہتے۔

کتاب کا آخری حصہ متفرق مضامین پر مشتمل ہے جس میں حالات حاضرہ اور مسلمانوں سے متعلق مضامین شامل ہیں۔

اردو میں معلوماتِ عامہ پر بہت کم کتابیں آتی ہیں۔ایسے میں مظہر حسنین کی یہ کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔

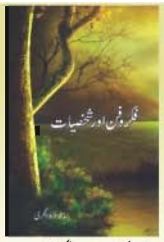

فکرو فن اور شخصیات

مصنف: ساحر داؤدنگری

صفحات: 120، قیمت: 77 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، لکشمی نگر دہلی

مبصر: شاہنواز حیدر شمسی (ریسرچ اسکالر) جامعہ ملیہ اسلامیہ

'فکروفن اور شخصیات' میں ساحر داؤدنگری نے اپنی تنقیدی تحریروں کا جادو جگایا ہے۔ 120 اوراق پر مشتمل اس کتاب میں کل چار ابواب قائم کر کے اس کے تحت 22 مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان مضامین میں 18 شاعری 3 افسانہ نگاری اور 2 صحافت سے متعلق ہیں۔ اس کتاب سے شاعری کی طرف مصنف کا غالب رجحان سامنے آتا ہے اور تاثراتی و جمالیاتی تنقید سے ان کی نسبت جھلکتی ہے۔ مصنف کا یہ طور لائق تحسین ہے کہ انھوں نے اپنے معاصر اور غیر معروف شعرا و ادبا پر قلم اٹھایا ہے۔ کتاب کا پہلا باب چار مضامین پر مشتمل ہے۔ مخمور سعیدی کی غزل گوئی، ڈاکٹر شباب للت کی شاعری میں رومان اور جمالیات، ش بانو ادیب مثبت سوچ کی افسانہ نگار اور فاروق انصاری کے افسانے۔ باب دوم شان بھارتی، سہیل انجم، ذوقی، سلیم انصاری، عمران عظیم/ صابر جہان آبادی سے متعلق ہیں۔ تیسرے باب میں سات مضامین شامل ہیں یہ مصنف کی شعری دلچسپی کا نتیجہ ہیں۔ داؤدنگر مصنف کا وطن ہے اور یہ تمام مضامین داؤدنگری شعرا کے فکروفن پر ہیں۔ باب چہارم میں تین مضمون شامل ہیں۔ منہاج نقیب کی شعری کائنات، عصری تقاضوں کا طبیب: ڈاکٹر مختار نواز اور جواں حوصلوں کا شاعر، ڈاکٹر اعجاز داؤدنگری۔

کتاب کے مطالعے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف کا تنقیدی رویہ پر توازن ہے۔ جہاں ان کی تحریروں کا حسن یہ ہے کہ وہ وسیع المطالعہ ہیں۔ انھیں زبان و بیان پر قدرت ہے۔ ان کی فکر بھی منور ہے اور وہ ادب کی کسی بھی صنف پر ہنرمندی کے ساتھ اظہار خیال میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ متن کے قلب میں اتر کر گہرائی و گیرائی کے ساتھ مفاہیم و مطالب کی جستجو کرتے ہیں اور ایک نیا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔

ساحر داؤدنگری جن مضامین میں با کمال نظر آتے ہیں ان میں ڈاکٹر شباب للت، نیر قریشی گنگوہی، سلیم انصاری، علامہ صابر قادری اور مہتاج نصیب وغیرہ پر شاعری سے متعلق مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ شخصیت و شاعری کی تفہیم کا مزاج پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ شامل مضامین متعلق فن کاروں کے کلام سے براہ راست استفادے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ ساحر داؤدنگری کی ناقدانہ بصیرت کی ایک جھلک آپ بھی دیکھیں شباب للت کی شاعری کے متعلق رقم طراز ہیں۔

''ڈاکٹر شباب للت صاحب نے اپنی شعری روایات کو نہایت توانائی، تازہ کاری اور شادابی کے ساتھ اپنی شاعری میں برتا ہے۔ ان کے شعری رویے سے جہاں تخلیقی آگہی کے نقوش مرتب ہوتے ہیں وہیں زمانے کی سفاکیوں اور عصری صداقتوں کو بے نقاب کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شباب للت صاحب نہایت لگن اور دلجمعی کے ساتھ اپنے شعری سفر کی راہ پر گامزن ہیں۔''

ساحر داؤدنگری کا ادب فہمی کا اپنا شعور ہے، اپنے زاویے ہیں اور اسی سطح سے انھوں نے اپنے عہد کے شعرا، افسانہ نگار و صحافیوں کا جائزہ لیا ہے۔ ایک تخلیق کار بہتر تنقید لکھنے پر اس لیے قادر ہے کہ وہ دوران تخلیق جس کیفیت سے گزرتا ہے اور اپنے تخیلات و تصورات کو جس طرح فنی رچاؤ کے ساتھ شعری پیکر عطا کرتا ہے۔ اس کے سروکار، فطری بانکپن کے ساتھ ایک نئی دنیا خلق کرتے ہیں اور ایک منفرد آواز و انداز کے ساتھ نئے جلوؤں کا سامان کرتے ہیں۔ ساحر داؤدنگری ایک تخلیق کار ادیب ہیں۔ شاعری ان کا فطری مزاج ہے۔

فکروفن اور شخصیات ایک شاعر کی تنقیدی نگارشات ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہ کتاب بے حد اہم ہے۔ اس سے ادب و تنقید کا شعور بھی حاصل ہوگا اور مصنف کے عہد و ادب سے واقفیت بھی ہوگی۔ کتاب 'فکروفن اور شخصیات' موجودہ صحافت کی منفرد آواز سہیل انجم کے نام منسوب ہے اس کی طباعت بھی دیدہ زیب ہے اور قیمت 77 روپے بہت مناسب ہے۔

ثریا داستان

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر اوم پرکاش بنسل، انور سیونی

صفحات: 80، قیمت: 75 روپے، سنہ اشاعت: 2014

مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر

C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی

'ثریا داستان' ڈاکٹر اوم پرکاش بنسل کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں 14 مختصر ترین کہانیاں شامل ہیں۔ مجموعے کی پہلی کہانی 'میری وصیت' ہے جس میں مصنف نے اپنے مافی الضمیر کو بیان کیا ہے کہ وہ پس مرگ اپنے جسد خاکی کا عطیہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کرنا بہتر خیال کرتے ہیں۔

مگر اس مجموعہ کی دو نمایاں کہانیاں 'ناجائز اولاد' اور 'ایک عدالتی فیصلہ' ہے۔ 'ناجائز اولاد' میں ماں کے لیے تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنی اولاد کے ساتھ اتنی ہی محبت کرے جتنا کہ اس کا حق ہے ورنہ بیجا لاڈ پیار سے اس کی زندگی تباہ ہوسکتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ماں کا فرض ہے اپنی اولاد کو مضبوط اور نڈر بنانا، لیکن تم نے اس کو ڈرپوک بنا دیا اور دوسروں کا سہارا لینے کی عادت ڈال دی۔ اس کی خوداعتمادی ختم کردی۔'' (ص 11)

اس کے علاوہ کہانی کے آخری حصے میں مصنف اس پانچ لڑکے کا موازنہ سماج کے کمزور طبقہ سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی مدد کی ضرورت ہے نا کہ بھیک کی''

یہاں مصنف کا اصل جذبہ سامنے آیا ہے جو ہر شخص کی بھلائی اور کامرانی کا خواہاں ہے۔ 'ایک عدالتی فیصلہ' میں مصنف موجودہ وقت کے عدالتی نظام سے شکوہ کناں ہے۔ جہاں سچ کی نہیں بلکہ جھوٹ کی جیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ وکالت کے پیشے سے بھی کافی ناراض نظر آتا ہے۔

واضح ہو کہ اس افسانوی مجموعے کی جان یہی دو کہانیاں ہیں جنھیں 'کتاب نما' نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ دیگر کہانیاں ان کی ہمسری نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ ایک کہانی 'مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا' میں ہندوستان کے مشترکہ کلچر کے انتشار سے وہ پریشان نظر آتا ہے۔ جہاں عرصے سے چلی آرہی خلوص و محبت کا ایک جھٹکے کے ساتھ خاتمہ ہوجاتا ہے جو موجودہ سیاست کا نتیجہ ہے۔

'ایک بوند زہر کی' نامی افسانہ میں بری صحبت کا تیزی سے اثر اور اس کے انجام سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ 'تیرے بنا بھی کیا جینا' میں دو چاہنے والے کی پاک محبت کا ذکر ہے جو کبھی ایک دوسرے سے جدا ہونا نہیں چاہتے۔ 'پرکھ' میں ایک جوان مرد اور حسین عورت کی قربت اور مرد کا اپنے جذبات پر قابو پانے کو دکھایا گیا ہے جو اس کہانی کو انفرادیت بخشتی ہے۔ 'کیا خدا ہے؟' میں ایک اسکولی بچے کے اپنے والدین سے بچھڑنے اور دوبارہ ملنے کا ذکر ہوا ہے۔

اگرچہ مصنف ڈاکٹر اوم پرکاش بنسل انور سیونی ادب کی کوئی معروف شخصیت نہیں ہیں لیکن ان کی تخلیقی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے امید کی جاتی ہے کہ وہ مستقبل میں زیادہ بہتر تخلیقات منظر عام پر لا سکتے ہیں۔

عالمی اردونامہ

مرزا غالب کے عہد شباب کی یکتائے زمانہ تصویر کا اجرا اور نمائش پروگرام کا منظر

پاکستان کی عدالت عظمیٰ کا اردو کو بطور سرکاری زبان اختیار کرنے کا حکم

اسلام آباد: پاکستانی عدالت عظمیٰ نے فوری طور پر اردو کو سرکاری زبان بنانے کے احکامات جاری کردیے ہیں۔ یہ احکامات منگل کو سرکاری اداروں میں اردو زبان کو رائج کرنے سے متعلق دائر ایک کیس کے فیصلے کے دوران سنائے گئے۔ کیس کی سماعت چیف جسٹس جواد ایس خواجہ کی سربراہی میں 3 رکنی بینچ نے کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فیصلے کو بھی چیف جسٹس نے انگریزی کے بجائے اردو میں پڑھ کر سنایا۔ 3 رکنی بنچ نے اپنے فیصلے میں حکومت کو آئین کے آرٹیکل 251 کے تحت فوری طور پر اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے احکامات جاری کیے۔ بنچ نے اس حوالے سے حکومت کو 9 نکاتی ہدایات بھی جاری کی ہیں۔ فیصلے میں کہا گیا ہے کہ آئین پاکستان کے آرٹیکل 251 کے تحت اندرون 15 سال ملک میں انگریزی کی جگہ اردو زبان کو رائج کیا جانا تھا لیکن اب تک ایسا نہیں ہوسکا۔ آئین کا اطلاق ہم پر فرض ہے۔ لہٰذا حکومت فوری طور پر اردو کو سرکاری زبان قرار دے۔ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے سے متعلق درخواست ایک مقامی وکیل کوکب اقبال نے دائر کی تھی۔ فیصلے پر رائے زنی کرتے ہوئے کوکب اقبال نے اسے 'سنہرا فیصلہ' قرار دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 ستمبر 2015

نیویارک میں پہلی سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس

واشنگٹن: ماہرین لسانیات دنیا کی اہم ترین اور مقبول عام زبانوں کے اشتراک سے ایک نئی زبان کی تشکیل پر کام کررہے ہیں تاکہ عوامی سطح پر ابلاغ میں حائل خلیج کو ختم کرکے دنیا میں امن وامان کی سلامتی کو یقینی بنایا جاسکے۔

اس بات کا انکشاف نیویارک یونیورسٹی میں جاری سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کے دوران کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں جدید زبانوں کے شعبے کے پروفیسر فرن پریشل نے اپنے مقالہ میں کیا۔ پروفیسر فرن پریشل کا کہنا تھا کہ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کے درمیان تنازعات میں بڑا عمل دخل ایک دوسرے کو نہ سمجھنا ہے اور عوامی سطح پر قومیں ایک دوسرے کی زبان اور ثقافت کو سمجھے بغیر قریب نہیں آسکتیں، اس لیے ماہرین لسانیات ایک ایسی زبان پر کام کررہے ہیں جس میں ہر زبان کے مشترکہ الفاظ شامل ہوں۔ نئی تشکیل پانے والی یہ زبان چند برسوں میں منظرعام پر آنے کی توقع ہے۔ کانفرنس میں دنیا بھر سے آئے ہوئے ماہرین لسانیات اور اردو زبان کے دانشوروں نے مقالات پیش کیے اور دنیا بھر میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کی ترقی کے لیے کیے گئے کاموں پر روشنی ڈالی۔ مشیگن یونیورسٹی میں ساؤتھ ایشین لٹریچر ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر مئین پوو نے اردو شاعری میں کمپیوٹر کے استعمال کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ دنیا بھر میں ترقی یافتہ قومیں تمام بڑی زبانوں کی کوڈنگ اور ڈی کوڈنگ کررہی ہیں تاکہ وہ مختلف ممالک کے باشندوں کی سوچ کا حقیقی تجزیہ کرسکیں۔ نیویارک یونیورسٹی میں شعبۂ جنوبی ایشیا کی سربراہ اور پروگرام کی رابطہ کار گبیر یلا نے اردو کے فروغ کے لیے میری لینڈ یونیورسٹی کے مالی تعاون سے جاری پروگرام 'اسٹارٹاک' کے بارے میں بتایا کہ اس کا مقصد اردو کمیونٹی کو متحرک کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے امریکہ میں رائج اس زبان کا انتخاب کا گیا ہے جو مروجہ معیار پر پوری اترتی ہو۔ کانفرنس میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے دانشوروں نے اردو شاعری اور ادب کا تحقیقی جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ اردو اور ہندی کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ تقریباً تمام ہی امریکی یونیورسٹیوں نے جنوبی ایشیا پر الگ شعبہ قائم کرلیا ہے جہاں اردو اور ہندی کی تعلیم دی جاتی ہے، تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو اور ہندی میں موجود فرق کو سمجھا جائے اور اس پر الگ تحقیق کی جائے۔ سہ روزہ کانفرنس کے اختتام پر اردو زبان کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا اور اس بات کا فیصلہ کیا گیا ہے کہ یہ کانفرنس ہر سال نیویارک یونیورسٹی میں منعقد کی جائے گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 ستمبر 2015

مرزا غالب کے عہد شباب کی یکتائے زمانہ تصویر کا اجرا اور نمائش

عالمی شہرت یافتہ ادبی تنظیم گزرگاہِ خیال فورم نے 10 ستمبر 2015 بروز جمعرات، لا ئیتوال ہوٹل المطار قدیم، قطر میں 'شام غالب' کے عنوان سے ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا جس میں جناب شجاعت علی کی بنائی ہوئی نوجوان مرزا غالب کی تصویر کا اجراء اور نمایش کی گئی۔

مرزا غالب کو اس سے قبل ان کی نوجوانی کے عہد کے مطابق پینٹ نہیں کیا گیا۔ غالب کی تمام تصاویر اور پورٹریٹ جو آج کتابوں میں یا انٹرنیٹ پر موجود ہیں وہ غالب کی پیری کے زمانے کی ہیں۔ یعنی غالب کے عہد

شباب کے عالم کو کسی مصور نے آج تک اپنی چشم تصور کا نخچیر نہیں کیا۔ انٹرنیٹ پر موجود غالب کی مقبول عام تصویر جس میں مرزا نے گلابی رنگ کا فرغل زیب تن کر رکھا ہے، ایک جرمن مصور کی کاری گری ہے جسے ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی طالب علمی کے دور میں 1920 کی دہائی میں برلن جرمنی میں اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔ اس خیالی تصویر میں غالب کی عمر لگ بھگ ستر برس ہے۔

'شام غالب' کی اس خصوصی نشست میں انڈیا اردو سوسائٹی کے بانی، شاعرِ خلیج جناب جلیل نظامی اور بزم اردو قطر کے سر پرست اعلی، قطر کی معروف سماجی شخصیت اور تاجر جناب عظیم عباس نے بطور مہمان اعزازی، لا یتوال ہوٹل کے جنرل منیجر جناب مرزا عمران بیگ اور انڈیا اردو سوسائٹی کے صدر جناب عتیق انظر نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ یہ شام بزم اردو قطر کے سینئر سر پرست جناب سید عبدالحی کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس کی نظامت بزم اردو قطر کے صدر جناب محمد رفیق شاد اکولوی نے کی۔

اس خصوصی نشست میں شاعر خلیج جناب جلیل نظامی کو دس اراکین پر مشتمل جیوری کے فیصلے کے مطابق 'فخر المتغزلین' کے خطاب سے نوازا گیا۔

روداد نگار: ڈاکٹر فیصل حنیف، بانی وصدر، گزرگاہِ خیال فورم، دوحہ، قطر، 19 ستمبر 2015

ڈاکٹر سید تقی علی عابدی کا شعبۂ اردو دانشگاہ تہران کا دورہ

25 اگست کو ڈاکٹر سید تقی عابدی نے شعبۂ اردو، دانشگاہ تہران کا دورہ کیا۔ ان کی آمد پر صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر علی بیات نے اپنی اور دیگر اساتذہ کی طرف سے دلی خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر بیات نے شعبے کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ تہران میں اردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کے لیے شعبے کے اساتذہ ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جہانِ اردو کے سر برآوردہ دانشوروں اور اسکالروں کی فکری و علمی تعاون اور مشوروں کا استقبال کرتے ہیں۔ اس کے بعد، ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کے اور شعبے کے دیگر اساتذہ کے درمیان مختلف موضوعات پر پرمغز اور علمی مباحثے ہوئے۔ اس وقت شعبے کے استاد محترمہ ڈاکٹر وفا یزدان منش اور ڈاکٹر علی کاووسی نژاد نے مولانا حالی، مولانا شبلی اور سرسید احمد خان کی علمی خدمات کے بارے میں ان سے استفسار کیا، جس پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد دیگر اساتذہ کے ساتھ مین لائبریری کے دورہ کرتے ہوئے، ڈاکٹر صاحب نے اپنی دس کتابیں تحفۃً چیف لائبریرین کی خدمت میں پیش کیں۔ نیز انھوں نے یہ کہا کہ کینڈا سے اپنی ذاتی لائبریری سے چند علمی و ادبی کتابیں ارسال فرمائیں گے۔ خاص طور پر نقوش کے وہ شمارے جو شعبے کی لائبریری میں موجود نہیں ہیں۔ شعبۂ اردو یونیورسٹی آف تہران کا 1991 میں افتتاح ہوا تھا۔ اور اس وقت سے اب تک ہر سال کم از کم 20 ایرانی نوجوان بی اے آنرز اردو زبان وادب کے لیے داخلہ لیتے ہیں۔ نیز اس شعبے میں 2008 سے سالانہ 6 طلبا و طالبات ایم اے اردو زبان وادب کے شعبے میں داخلہ لیتے ہیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر علی بیات، صدر اور اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف تہران، 15 ستمبر 2015

پاکستانی فلم منٹو کی نمائش

کراچی: کچھ ناقدین کا خیال تھا کہ چونکہ پاکستان میں سوانح حیات پر بنی فلمیں ایک نیا تجربہ ہیں۔ لہٰذا، ان کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں۔ ان میں سب سے بڑی مثال فلم 'منٹو' ہے۔ معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی زندگی کے نشیب وفراز پر بننے والی فلم 'منٹو' نے باکس آفس پر کامیابی حاصل کرکے ناکامی کے خدشات کو بالکل ہی معدوم کردیا۔ وی او اے کے نمائندے نے مختلف سنیما گھروں کا دورہ کیا جس کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ فلمی شائقین بڑی تعداد میں 'منٹو' دیکھنے کے لیے سنیما گھروں کا رخ کر رہے ہیں۔ کراچی کے بعد لاہور کی بات کریں تو یہاں بھی گذشتہ ہفتے 'منٹو' کا پریمئر ہوا جس میں فلم کی کاسٹ اور شوبز سمیت مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی معروف شخصیات نے شرکت کی۔ بیشتر ناظرین نے وائس آف امریکہ کو بتایا کہ 'جیو فلمز' کے جاوید بابر نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی جن اداکاروں کو منتخب کیا وہ اپنے کردار میں نگینے کی طرح فٹ بیٹھے۔ زاہد ندیم کی لکھی اور سرمد کھوسٹ کی ڈائریکٹ کردہ 'منٹو' کی کہانی سعادت حسن کی زندگی کے آخری چند سالوں کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ فلم میں منٹو کا مرکزی کردار خود سرمد کھوسٹ نے نہایت خوبصورت انداز میں ادا کیا ہے۔ منٹو کے شاندار پریمئر میں منٹو کی صاحبزادیوں نگہت، نصرت اور نزہت کے علاوہ میشا شفیع، نادیہ افگن، جاناں ملک، حدیقہ کیانی، سید نور، نور بخاری، علی سیٹھی، جاوید بشیر اور دیگر نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 ستمبر 2015

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

کونسل کی مالی اسکیموں کا فائدہ دور دراز کے علاقوں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم
قومی اردو کونسل کی مالی تعاون اسکیم (گرانٹ ان ایڈ) کے تحت میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کی مالی اسکیموں کے فائدے سے دور دراز کے علاقے محروم رہ جاتے ہیں۔ خاص طور پر جنوبی ہند کی ریاستوں سے مالی تعاون کی درخواستیں کم موصول ہوتی ہیں۔ اس لیے کونسل ترجیحی طور پر ان علاقوں کو مالی تعاون اسکیم میں شامل کرنے کی کوشش کرے گی اور اس سلسلے میں مختلف ریاستوں کی اردو اکادمیوں سے بھی مدد لی جائے گی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے گرانٹ ان ایڈ پینل 16-2015 کی میٹنگ میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایسی درخواستوں اور مسودات پر خصوصی توجہ دی جائے گی جن کا تعلق غیر مسلم طبقہ سے ہے تاکہ اردو کے باب میں ان کی خدمات اور سرگرمیوں سے عام لوگ واقف ہوسکیں۔ اس میٹنگ میں سیمینار، کانفرنس، ورکشاپ، مشاعروں، اردو، عربی، فارسی مسودات کی اشاعت اور ریسرچ پروجیکٹ سے متعلق درخواستوں پر غور وخوض کیا گیا اور ملک کے مختلف حصوں سے موصول ہونے والی درخواستوں کو مالی تعاون کے لیے منظور کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت پروفیسر صغیر افراہیم نے کی۔ اس میٹنگ میں ممبران نے مالی تعاون کی اسکیموں میں شفافیت کا خیال رکھنے اور تمام ریاستوں کو متناسب نمائندگی دینے پر اتفاق کیا اور یہ تجویز پیش کی گئی کہ کونسل کی مالی تعاون اسکیموں کی رقومات میں بھی اضافہ کیا جائے۔ میٹنگ میں گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کے ممبران پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر قدسیہ انجم، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر فوزیہ چودھری، ڈاکٹر نصرت مہدی کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، جناب فیروز عالم، ڈاکٹر توقیر عالم راہی، جناب سید مجیب احمد، محمد طاہر، محمد جاوید انصاری اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں میٹنگ کا منظر

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 ستمبر 2015

اردو زبان کی ترقی کے لیے سنجیدہ تحقیق وتنقید کی ضرورت ہے: ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں اردو ادب پینل میٹنگ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں اردو ادب پینل کی ایک اہم میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی پٹنہ کے وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پینل کے سبھی ممبران کا استقبال کیا اور میٹنگ کی غرض و غایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور اردو ادب کے لیے سازگار ہے لیکن ہمیں زبان وادب کی ترقی کے لیے نئے نئے موضوعات تلاش کرنے ہوں گے۔ زبان وادب کی ترقی سنجیدہ تحقیق وتنقید سے مشروط ہے۔

اردو ادب پینل کی میٹنگ

پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ کونسل زبان وادب کے فروغ کے لیے مثالی کام کررہی ہے۔ کونسل کی مطبوعات قابل قدر اور مثالی ہیں مگر اب اشاعت کے لیے کتابوں کے انتخاب میں نئے اور اچھوتے موضوعات کو ترجیح دی جائے تو یہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ عام موضوعات جن پر پہلے سے وافر مواد موجود ہے ان کو شائع کرنے سے قبل اُس کی ضرورت واہمیت پر غور وخوض کرنا ضروری ہے۔ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری اور معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے کہا کہ کتابوں کی اشاعت سے قبل مسودّے کو اچھی طرح جانچنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر نریش نے اس موقعے پر کہا کہ کلیات کی اشاعت کے سلسلے میں کونسل کو نظرثانی کرنی چاہیے۔ میٹنگ میں اتفاق رائے سے یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ کلیات کا مسودہ کونسل میں جمع کرانے کے بعد ہی اس کی اشاعت کے بارے میں غور وخوض کیا جائے گا۔

میٹنگ میں پروفیسر ایس مسعود سراج، پروفیسر رئیس انور، محترمہ سلیمہ بی کولور نے بھی شرکت کی۔ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے میٹنگ کے بعد سبھی ممبران کا شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، محمد انصر، آبگینہ عارف اور ڈاکٹر شاہد اختر انصاری بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 ستمبر 2015

تخلیقی ادب پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون، جسولہ نئی دہلی میں تخلیقی ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے کی۔ میٹنگ میں تخلیقی ادب کی کتابوں کی اشاعت سے متعلق اہم نکات پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

اس موقعے پر معروف تخلیق کار اقبال مجید نے تجویز پیش کی کہ کونسل اردو تھیٹر کی ترویج وترقی میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ پروفیسر گنگا پرشاد ومل نے عالمی ادب کے شاہکار تحریروں کا اردو ترجمے کرانے پر زور دیا۔ سلام بن رزاق نے بھی ترجمہ کے متعلق کہا کہ بھیشم ساہنی کی صدی کے موقعے پر ان کی کہانیوں کا اردو ترجمہ کرایا جانا چاہیے۔ شائستہ یوسف افسانوں نے افسانوں کے ورکشاپ اور افسانوی نشستوں کے اہتمام کو موجودہ دور کی ضرورت بتایا۔ ڈاکٹر ترنم ریاض نے اردو کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کی بقا کے لیے سنجیدگی سے کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ سید محمد اشرف نے تخلیقی ادب سے متعلق تمام تجاویز وسفارشات کو مثبت کوشش سے تعبیر کیا اور کہا کہ اسکول کی سطح پر بھی تخلیقی ادب کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کونسل تخلیقی ادب کی اشاعت اور فروغ کے لیے جلد ہی مربوط لائحہ عمل تیار کرے گی اور اس سلسلے میں پیش کی گئی تجاویز کو عملی شکل عطا کرنے کی کوشش کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کے تمام اسکولوں میں کونسل جلد ہی اردو کارنر شروع کرنے جارہی ہے، اس کارنر کے تحت تخلیقی کام اسکولی سطح پر کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے نسائی ادب اور دلت ادب پر علاحدہ سے پینل کی تشکیل کی بابت جانکاری دیتے ہوئے کہا کہ نسائی ادب اور دلت ادب سے متعلق نمائندہ تحریروں کی اشاعت پر بھی غور وخوض کیا جائے گا۔

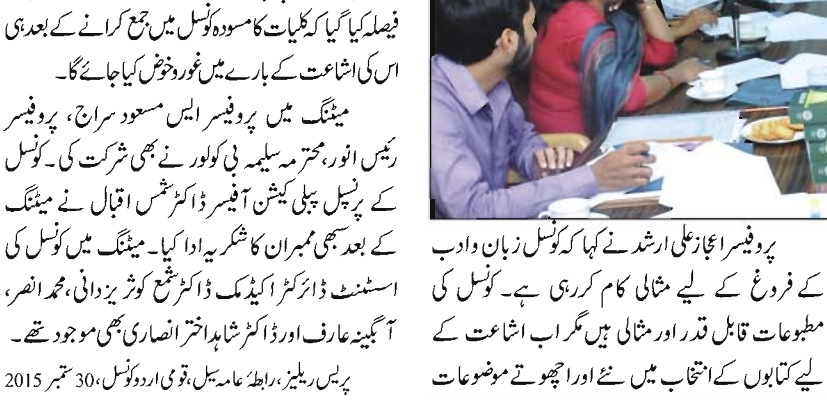

تخلیقی ادب پینل کی میٹنگ

میٹنگ میں جناب رتن سنگھ، طارق چھتاری، اسرار گاندھی، پروفیسر بیگ احساس اور پروفیسر ظہیر انور کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم ومحترمہ آبگینہ عارف نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 ستمبر 2015

اردو صحافت کا دوسو سالہ جشن

کولکاتہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو صحافت کے دوسو سال مکمل ہونے پر ملک بھر میں اردو صحافت پر سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔ چونکہ اردو صحافت ہی نہیں بلکہ صحافت کا آغاز ہی کلکتہ شہر سے ہوا تھا اس لیے اس سلسلے کا پہلا سیمینار کلکتہ میں 19 اور 20 ستمبر کو منعقد کیا گیا۔ افتتاحی تقریب میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے احمد سعید ملیح آبادی نے کہا کہ آغاز میں اردو کردار ادا کرسکتی ہے۔ اس میں یو این آئی اردو سروس کا کلیدی کردار ہے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید محمد فیصل علی نے اردو صحافت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت کو نظریہ اور قدیم سوچ سے نکل کر جدید تقاضوں سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو صحافت کا مستقبل روشن ہو تو ہمیں خود احتسابی کرنی چاہیے اور معیاری و معلوماتی صحافت کی تعمیر و

صحافت کا بنیادی مقصد تجارت نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد قوم و ملک کی رہنمائی، جبر و استبداد سے خلاصی اور انگریزی استعماریت سے آزادی دلانا تھا۔ احمد سعید ملیح آبادی نے مولانا آزاد کے 'الہلال' و 'البلاغ'، مولانا محمد علی جوہر کے 'کامریڈ' مولانا ظفر علی خان کے 'زمیندار' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ صرف اخبار نہیں تھے بلکہ ان اخبارات نے انگریزی اقتدار کو ہلا کر رکھ دیا، ان کی چولیں ہل گئیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اب حالات بدل چکے ہیں اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اردو صحافت کا مقصد تجارت نہیں ہونا چاہیے بلکہ وقت اور ضرورت کے مطابق تبدیلی ضروری ہے مگر آج بھی اردو صحافت قومی اتحاد کے فروغ میں کلیدی تشکیل کے لیے غور و فکر کرنا ہوگا۔ اس موقعے پر اخبار مشرق کے ایڈیٹر و بزرگ صحافی محمد وسیم الحق نے 1947 تک بنگال کی صحافت کا جائزہ کے عنوان سے اپنے علمی مقالہ میں کہا کہ بنگال کی صحافت کی تاریخ روشن اور منور ہے۔ الہلال، البلاغ، آزاد ہند، عصر جدید یا پھر روزنامہ اخبار مشرق نے صحافت کی آبیاری کی، افراد سازی کا کارنامہ عظیم انجام دیا اور عظیم شخصیتیں پیدا کیں۔ قومی کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سیمینار کے انعقاد کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کونسل نے پہلی مرتبہ اردو صحافت کے نام پر سیمینار کے انعقاد کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا ہے تاکہ اردو صحافت کا تعلق

اردو صحافت کے دوسو سال

کولکاتہ: اردو زبان کے رسم الخط کی حفاظت کی وکالت کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے اردو صحافیوں سے اپیل کی کہ اردو صحافت کو

عام انسانوں سے جوڑا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی مرثیہ خوانی یا پھر قصیدہ خوانی کے بجائے اردو زبان کو جدید تکنالوجی اور عام آدمی تک رسائی کے لیے تگ و دو کیا جانا چاہیے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام اردو صحافت کے 200 سال مکمل ہونے پر دو روزہ سیمینار کے موقعے پر پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مظفر حسین نے کہا کہ اردو زبان کے پاس علمی ذخیرہ کی کمی نہیں پس ضرورت ہے تو قاری پیدا کرنے کی اور اس کے لیے اردو صحافت ایک بہترین ذریعہ ہوسکتی ہے اس لیے صحافیوں کو جدید تکنالوجی کے ساتھ، بدلتے زمانے کا شعور وادراک ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کا جادو اب بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے ملک کے وزیر اعظم نریندر مودی بھی اردو سیکھنے کے متمنی ہیں۔ اردو زبان نے ہی جواہر لعل نہرو کو ہندوستان کا مقبول لیڈر بنایا۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سیمینار کے انعقاد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کونسل ملک بھر میں اردو صحافت کے 200 سال مکمل ہونے پر سلسلہ وار پروگرام انعقاد کر رہی ہے۔ چونکہ کلکتہ سے ہی اردو صحافت کی ابتدا ہوئی اس لیے اس سلسلہ کا پہلا پروگرام کلکتہ میں انعقاد کیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سیمینار کا مقصد اردو صحافت کی تاریخ اور اس کے لیے قربانیاں دینے والی عظیم شخصیتوں کے تذکرے اور تاریخ کو ہمیشہ ہمیش کے لیے محفوظ کرنا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 19 ستمبر 2015

عوام سے جوڑا جائے اور اس کی روشن تاریخ کو نئی نسلوں تک پہنچایا جائے۔ آئندہ ایک سال تک ملک بھر میں سیمینار کا انعقاد کیا جائے گا۔ دو روزہ سیمینار کے پہلے دن متعدد مقالے پیش کیے گئے۔ جن مقالہ نگاروں نے مقالے پیش کیے۔ ان میں محمد وسیم الحق ایڈیٹر اخبار مشرق، مشہور صحافی امان اللہ محمد، مشہور نقاد ابوذر ہاشمی، مژگاں کے ایڈیٹر نوشاد مومن، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائریکٹر امام اعظم، اسسٹنٹ پروفیسر محمد ندیم شامل تھے۔

مغربی بنگال میں اردو صحافت کے زیر عنوان دوسرے دن کے اجلاس کی صدارت پرویز حفیظ، وسیم الحق اور عبدالعزیز نے کی جبکہ مقالہ نگاروں میں ظہیر انور، جہانگیر رضا کاظمی، نصر اللہ نصر، انیس رفیع، ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کولکاتا کا یہ دو روزہ سیمینار ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ اس کے لیے اردو اخبارات مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کولکاتا کے اردو داں طبقے نے جس طرح اردو کے تئیں اپنی بیداری کا ثبوت پیش کیا ہے اس کی نظیر دوسری ریاستوں میں ڈھونڈنا تقریباً ناممکن ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سیمینار کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا بلکہ اس سے مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جو بہت ہی کامیابی کے ساتھ ہمارے سامنے آئے ہیں اب اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کونسل اردو اور اردو صحافت کی پہلے بھی خدمت کرتی رہی ہے لیکن اب اس کی رفتار میں تیزی آئے گی۔ پرویز حفیظ نے کہا کہ اب یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اردو اخبارات میں ریاستی خبریں ہوتی ہیں۔ زمانہ انفارمیشن ٹکنالوجی کا ہے۔ اب جتنی دیر میں ایک خبر ٹائمز آف انڈیا تک پہنچتی ہے اتنی ہی دیر میں کسی اردو اخبار تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ حالاتِ حاضرہ اور نئی ٹکنالوجی کو بھی اردو اخبار تیز رفتاری کے ساتھ اپنا رہے ہیں۔

آخر میں کونسل کے ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم نے تمام مہمانان و سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کولکاتا میں پہلا سیمینار کرنے کا میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے لوگوں نے جس بیداری کا ثبوت دیا ہے وہ کسی ریاست میں نہیں ملے گی۔ کولکاتا نے ثابت کر دیا ہے کہ واقعی یہ اردو صحافت کی جائے پیدائش ہے۔

روز نامہ 'سیاسی تقدیر' 20 ستمبر و روز نامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 ستمبر 2015

بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سیمینار کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز کے سہ روزہ سیمینار کے افتتاحی پروگرام میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے تمام مہمانوں کا

خیر مقدم کیا اور کہا کہ ادب، تہذیب و ثقافت کا حلقہ کافی وسیع ہے لہٰذا یہ سیمینار مستقبل میں ادبی دنیا کو روشن و تابناک کرے گا۔ تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بھی تمام مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہاں پر موجود ہر ریسرچ اسکالرز ہمارے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ موصوف نے ریسرچ اسکالرز کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ یہ سیمینار ریسرچ اسکالرز کو حوصلہ اور توانائی عطا کرے گا۔ افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ اسکالرز کو چاہیے کہ اپنے سبجیکٹ میں دلچسپی لیں اور اپنے اپنے شعبے کے لیڈر بھی بنے اور ریڈر بھی بنیں اور ریسرچ کے ذریعے اپنے شعبے میں نئے نئے تصورات کو پیش کریں۔ پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ریسرچ اسکالرز کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ یہ جلسہ آپ لوگوں سے منسوب ہے۔ آپ اپنے مسائل بالخصوص تحقیقی مسائل کا دلچسپی سے مطالعہ اور اس کا سدباب بھی تلاش کریں۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ یہ سیمینار اردو و فارسی کے باہمی رشتہ کو مضبوط کر رہا ہے۔ عہد حاضر کے ممتاز ادیب و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ یہ سیمینار ریسرچ اسکالرز کو ذہنی استحکام عطا کرے گا۔ پروفیسر نارنگ نے ریسرچ کی موجودہ صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہمارے

دور کے مقابلے آج کے ریسرچ اسکالرز کے درمیان وسائل کی کمی نہیں ہے اس لیے انھیں اپنی ریسرچ کو صحت مند روش کی طرف لے جانا چاہیے۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کے سابق وائس چانسلر اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ممتاز سائنس داں پروفیسر سید احتشام حسنین نے ریسرچ کی اہمیت و افادیت پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیمینار ریسرچ اسکالرز کو ایک نئی روشنی اور ایک نئی سمت عطا کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے بھی افتتاحی اجلاس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی میں ایک شامیانہ ہے اور سارے علوم اس میں شامل ہیں لہٰذا ریسرچ اسکالرز کو چاہیے کہ دوسرے علوم و فنون سے بھی فائدہ اٹھائیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے اپنی صدارتی گفتگو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہمیشہ سے اردو زبان و ادب کا ایک گہوارہ رہی ہے اور ہماری پوری کوشش ہے کہ اس یونیورسٹی کے ذریعہ زبان و ادب کو استحکام ملتا رہے۔ ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر سید رضا حیدر نے اپنے افتتاحی کلمات میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد مزید دو اجلاس ہوئے جس میں ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر امتیاز حسنین، ڈاکٹر اطہر فاروقی، پروفیسر علیم اشرف اور پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے صدارتی فریضے کو انجام دیا اور مختلف یونیورسٹیوں سے آئے ہوئے متعدد حضرات نے اپنے مقالات پیش کیے اور خیالات کا اظہار کیا۔

سیمینار کے دوسرے دن چار اجلاس منعقد کیے گئے

جس میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو و شعبۂ فارسی کے ریسرچ اسکالرز کے علاوہ ایران کے ریسرچ اسکالرز نے تقریباً 30 مقالے پیش کیے۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر علی جاوید اور ڈاکٹر خالد علوی نے انجام دیے، نظامت کا فریضہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر رفعت مہدی رضوی نے ادا کیا۔ اس اجلاس میں سات مقالے پیش کیے گئے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر اختر مہدی اور امریکہ سے آئے مہمان شاعر 'فرحت شہزاد' نے انجام دی۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ نورین علی حق نے انجام دیا۔ اس نشست میں چار مقالے پیش کیے گئے۔ تیسرے اور چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر معین الدین جینابڑے، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، قاسم خورشید، پروفیسر عین الحسن، پروفیسر مظہر مہدی اور ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی۔ اجلاس میں نظامت کا فریضہ احمد علی جوہر اور جاوید حسن نے انجام دیا۔ ان دونوں اجلاس میں تقریباً چودہ مقالات پیش کیے گئے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سیمینار کے اختتامی اجلاس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تین دن کے اس سیمینار میں بہت سی باتیں سامنے آئی ہیں۔ یہ سیمینار جس میں پروفیسر اور مقالہ کے نگراں حضرات شامل تھے اور ہمارے ریسرچ اسکالرز نے مقالے بھی پڑھے اور سوالات بھی سامنے آئے نیز اساتذہ نے اپنے تجربات کی روشنی میں مشورے بھی دیے مگر مشکل یہ ہے کہ سچی بات سامنے نہ آسکی۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی میں جو طلبا داخلہ لیتے ہیں وہ صرف ایم اے کرکے آتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں نگراں یا استاد کا تجربہ زیادہ ہوتا ہے لیکن امید یہ رکھی جاتی ہے کہ طالب علم ہی تمام تر کام کرے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک تازہ وارد طالب علم تحقیق کے اصول وضوابط سے کما حقہ واقف ہوسکے۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی مقالہ کی خرابی اور کمزوری کی بڑی ذمہ داری نگراں کی ہوتی ہے چونکہ موضوع پر اس کی نگاہ زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے میں طالب علم کو گرتے ہوئے تحقیقی معیار کا ذمہ دار نہیں کہہ سکتا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن نے اختتامی اجلاس کے صدارتی کلمات میں باہر سے آئے ہوئے تمام ریسرچ اسکالرز کو ان کے مقالات پر مبارکباد دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اگر اسی طرح ان ریسرچ اسکالرز کو اپنی گفتگو پیش کرنے کا وقتاً فوقتاً موقع دیا جائے تو ہمیں پوری امید ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ ریسرچ اسکالرز اچھے استاد ثابت ہوں گے۔ آخری دن کے ساتویں اجلاس میں پروفیسر عتیق اللہ اور دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے صدارت کا فریضہ انجام دیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے ریسرچ اسکالرز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ صرف علم ہی جہالت کی تاریکی کو دور کرتا ہے کہ آنے والی نسلوں سے توقع رکھتے ہیں کہ اپنی غلطیوں سے سیکھیں گے۔ اس اجلاس کے دوسرے صدر ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے اپنے صدارتی کلمات میں تمام مقالہ نگاروں کے مقالے پر اپنی آرا پیش کرتے ہوئے مقالہ نگاروں کی پذیرائی کی۔ اس اجلاس میں 6 مقالے پڑھے گئے۔ نظامت کا فریضہ شاہین نے انجام دیا۔

آٹھویں اجلاس میں فارسی کے ممتاز اسکالر پروفیسر شریف حسین قاسمی اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ابن کنول نے صدارتی فریضہ کو انجام دیا۔ اس اجلاس میں پانچ مقالے پیش کیے گئے۔ نظامت کا فریضہ سفینہ بیگم نے انجام دیا۔

اس بین الاقوامی سیمینار کے نویں اور دسویں اجلاس میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر انور پاشا، پروفیسر قادر جعفری، پروفیسر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن اور ڈاکٹر شعیب رضا خان بحیثیت صدر موجود تھے۔ اس سے بیشتر کے اجلاس میں 12 مقالے پیش کیے گئے۔ اس سیمینار میں ملک و بیرون ملک کی تقریباً 30 یونیورسٹیوں سے ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 تا 14 اکتوبر 2015

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو استقبالیہ

نئی دہلی: ادبی اور سماجی تنظیم سالویشن کے زیر اہتمام اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے اشتراک سے کالج کے پیلے ہال میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں انھوں نے کہا کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے زمینی طور پر جو کام ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا ہے، ہماری ترجیحی کوشش ہے کہ ہم اپنے کام کو بہتر طریقے سے انجام دیں تاکہ اردو زبان کو واقعی فروغ ہوسکے۔

قبل ازیں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے سالویشن کے سرپرست ڈاکٹر محمد انظار عالم نے کہا کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم پچھلے کئی دہائیوں سے اردو کی خدمت کررہے ہیں اور وہ اردو کی موجودہ صورت حال سے بہت اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے ہمیں پوری امید ہے کہ وہ اردو کے فروغ کے لیے زمینی کام کریں گے۔ اس موقع پر یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر مجتبیٰ خان نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اخیر میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ ارتضیٰ کریم ہمارے دہلی یونیورسٹی کے ساتھیوں میں ہیں اور ان کا این سی پی یو ایل کا ڈائریکٹر مقرر ہونا اردو کے لیے فال نیک ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ بہتر کام کریں گے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عذرا نے کی اور ڈاکٹر محمد انظار عالم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر پروفیسر فرقان احمد، پروفیسر کوثر مظہری، جامعہ کوآپریٹو بینک کے چیئرمین مرزا قمرالحسن بیگ، مرزا احمد بیگ، اسسٹنٹ رجسٹرار نسیم احمد، ڈاکٹر سرورالہدیٰ کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے متعدد ریسرچ اسکالر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 ستمبر 2015

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

حکیم عبدالحمید کی طبی خدمات

نئی دھلی: حکیم عبدالحمید مرحوم ایک ایسی عظیم شخصیت کا نام ہے، جس نے طب، تعلیم، ادب اور فنون لطیفہ کے شعبہ میں ناقابل فراموش خدمات انجام دے کر انسانیت

کی خدمت کی۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے غالب اکادمی کی مجلس منتظمہ کے اراکین کی جانب سے حکیم عبدالحمید کے 107 ویں یوم ولادت کے موقعے پر 'حکیم عبدالحمید کی طبی خدمات' کے موضوع پر منعقد خصوصی لیکچر کے دوران کیا۔ نظامت کے فرائض غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے ادا کیے۔ اس موقعے پر معروف شاعر گلزار دہلوی بھی بطور خاص موجود تھے۔ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے اپنی زندگی میں تقریباً 60 لاکھ سے زیادہ مریضوں کو دیکھا اور ملک میں طب یونانی کے فروغ کے لیے نمایاں خدمات انجام دیتے ہوئے مدھیہ پردیش کے برہان پور، کولکاتہ، دارالعلوم دیوبند اور دہلی میں طب یونانی کے معیاری ادارے قائم کرائے۔ حکیم اجمل خان کی تشکیل شدہ آل انڈیا طبی کونسل کا احیا بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ حکیم عبدالحمید بے شمار صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے طب کے علاوہ تعلیم، ادب اور فنون لطیفہ میں بھی بہترین خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے ہمدرد کے تعلق سے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی خدمت کی۔ خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ حکیم عبدالحمید دواؤں پر ہی نہیں بلکہ زبانوں کے آپسی روابط پر بھی ریسرچ کیا کرتے تھے۔ وہ اس کام کو بہت سنجیدگی سے کر رہے تھے لیکن افسوس ان کے انتقال سے یہ کام نامکمل رہ گیا۔ ابتدا میں غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ حکیم عبدالحمید اردو زبان کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور غالب سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ غالب اکادمی کا قیام ان کی اردو ادب اور غالب سے محبت کا ثبوت ہے۔ اس موقعے پر موجود دیگر اہم شخصیات میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر نصیر احمد خان، انجم عثمانی، محترمہ نگار عظیم، متین امروہوی، محمد شمیم، سرفراز احمد اور شمس رمزی وغیرہ بھی موجود تھے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 ستمبر 2015

پنڈت آنند نرائن ملا- حیات وکمالات

نئی دھلی: پنڈت آنند نرائن ملا نہ صرف ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار تھے بلکہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ ایک مجاہد آزادی، معتبر شاعر اور ماہر قانون بھی تھے۔ ان خیالات کا اظہار مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو کی جانب سے آئیڈیا کمیونی کیشن کے زیر انتظام جامعہ ہمدرد کے کنونشن سینٹر میں 'پنڈت آنند نرائن ملا کا اردو ادب اور مشترکہ تہذیب کے فروغ میں رول' کے موضوع پر منعقد ایک روزہ قومی سیمینار میں معروف شخصیات نے کیا۔ پروگرام کی نظامت معین شاداب نے کی۔ معروف قانون داں اور ممبر آف پارلیمنٹ مجید میمن ایڈووکیٹ نے کہا کہ جسٹس پنڈت آنند نرائن ملا ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک ممتاز قانون داں ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے اہم شعرا میں منفرد مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔ کمشنر فار لنگوسٹک مائنارٹیز حکومت ہند پروفیسر اختر الواسع نے صدارتی خطاب میں کہا کہ پنڈت آنند نرائن ملا ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار تھے۔ انھوں نے جدوجہد آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے آنند نرائن ملا کی نظم نگاری کے مختلف پہلوؤں اور بعض تانیثی پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی۔ ممتاز نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے کلیدی خطبہ میں آنند نرائن ملا کے تہذیبی اور ثقافتی رویوں کو بطور خاص واضح کیا اور کہا کہ وہ جس عہد کی پیداوار تھے انھوں نے اس سے کہیں آگے سوچنے کی کوشش کی۔ اس موقعے پر مہمان اعزازی مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو کے بانی شکیل احمد صبرحدی، آنند نرائن ملا کی بیٹی چترا کول ملا، سابق وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر شمیم جیراجپوری نے بھی اظہار خیال کیا۔ جامعہ ہمدرد کے رجسٹرار ڈاکٹر فردوس احمد وانی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس سے قبل ڈائرکٹر آئیڈیا کمیونی کیشنز آصف اعظمی نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ افتتاحی اجلاس کے علاوہ 2 سیشن میں مقالہ نگار حضرات نے مقالات پیش کیے۔ پہلے سیشن میں پروفیسر الطاف احمد اعظمی

اور کرنل وامکیی کاٹجو، جبکہ دوسرے سیشن میں پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر معین الدین جینابڑے نے صدارت کی۔ بالترتیب نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر اور سلمان فیصل نے انجام دیے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 ستمبر 2015

اردو زبان کی شیرینی

نئی دہلی: پرگتی میدان کے کتاب میلے میں جہاں بچوں نے اسکول کی درسی اور غیر درسی کتابیں خریدیں، وہیں کچھ نونہالوں کی بھیڑ اردو اسٹالوں پر بھی دیکھی گئی، یہ نونہال کچھ تو اس لیے اردو سیکھ رہے ہیں کہ انھیں بعد میں زیادہ مواقع ملیں گے اور کچھ اس لیے سیکھ رہے ہیں کہ انھیں تہذیب وتمدن سے واقفیت ہوگی اور بولنے برتنے کا سلیقہ آجائے گا۔ اس سلسلے میں آئی پی ایس اندرا پورم پبلک اسکول کے 9 سالہ لیش آنند نے بتایا کہ میں اردو سیکھنا چاہتا ہوں، کیوں کہ ہندوستان میں اردو میں فی الحال بہت کم مواقع ہیں، لیکن جس زبان میں کم مواقع ہوتے ہیں۔ بعد میں چل کر اس میں مواقع بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ زبان، بہت پیاری ہے۔ اے پی جے انٹرنیشنل گریٹر نوئیڈا میں زیر تعلیم مدھور میندر کمار اور کرتی نریندر دونوں بھائی بہن ہیں اور اردو سیکھ رہے ہیں۔ گھر میں ان کے دادا اور والدہ بھی اردو جانتے ہیں، اپنی والدہ کی تحریک پر یہ دونوں بچے اردو سیکھ رہے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ اردو سیکھنے سے زبان میں نکھار پیدا ہوجاتا ہے اور بولنے کا سلیقہ آجاتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 ستمبر 2015

اردو ادیبوں کا انسائیکلو پیڈیا

نئی دہلی: اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، سولن کے زیراہتمام اردو ادیبوں کے انسائیکلو پیڈیا کے موضوع پر غالب اکادمی، دہلی میں ایک سہ روزہ ورکشاپ منعقد کی گئی۔ اردو ادیبوں کے انسائیکلو پیڈیا کی ضرورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ورکشاپ کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ضیاءالرحمٰن نے کہا کہ انسائیکلو پیڈیا حوالہ جاتی کتب ہوتی ہیں جو تیار و فی الفور حوالے کا حکم رکھتی ہیں۔ اردو میں ان کا چلن کم ہے کیونکہ اردو انسائیکلو پیڈیا کی تیاری کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے زیراہتمام مذکورہ اردو انسائیکلو پیڈیا ایسی ہی ایک ضرورت کی تکمیل کا باعث ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ مذکورہ سینٹر اس سے قبل ہی اردو ہندی لغت اور اردو شعرا کے انسائیکلو پیڈیا پر کام کر چکا ہے اور یہ دونوں کتابیں اشاعت کے مرحلے میں ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی جیسی مقتدر علمی و ادبی شخصیات کے علاوہ ورکشاپ میں پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر توقیر احمد خان، پروفیسر شہناز انجم، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر شمیم اور ڈاکٹر نفیس حسن نے شرکت کی۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 ستمبر 2015

یومِ اردو اب گوگل پر

نئی دہلی: شاعر مشرق علامہ اقبال کی یوم پیدائش 9 نومبر کی مناسبت سے ہندوستان اور دنیا بھر میں منائے جانے والے عالمی یوم اردو کو اب گوگل نے بھی اپنے سرچ انجن پر جگہ دے دی ہے۔ عالمی یوم اردو کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خان نے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ گوگل کی طرف سے یوم اردو کو اپنے سرچ انجن میں شامل کیا جانا اردو سے محبت کرنے والوں کے لیے خوشی کی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ گوگل کا یہ قدم اس بات کا ثبوت ہے کہ 9 نومبر کو عالمی یوم اردو کی حیثیت سے اب دنیا بھر میں تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاعر مشرق علامہ اقبال کی یوم پیدائش کی مناسبت سے یوم اردو منانے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا تھا کہ علامہ اقبال آفاقی شخصیت کے مالک ہیں اور ان کے خیالات نے ایک عالم کو متاثر کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2015

دہلی:

جے این یو میں عصمت چغتائی پر خصوصی لیکچر کا انعقاد

نئی دہلی: عصمت چغتائی صدی تقریبات کے تحت سنٹر فار انڈین لنگویجز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کی جانب سے عصمت چغتائی عرف لیڈی چنگیز خان کے عنوان سے خصوصی لکچر کا اہتمام کیا گیا، جن میں بطور مہمان خصوصی اردو فکشن کے ممتاز ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی نے شرکت کی اور ترقی پسند تحریک کے تناظر میں عصمت چغتائی کی فکر اور فن کے مختلف گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ عصمت چغتائی ایک غیر معمولی ادیبہ تھیں جنھوں نے سماج اور تہذیب کے ان گوشوں کو اپنی کہانیوں اور ناولوں میں نمایاں کیا۔ عصمت چغتائی نے گھریلو زندگی سے متعلق ان مسائل و معاملات کو اپنی تخلیقات میں مرکزی طور پر نمایاں کیا جن کے بارے میں ان کے تجربات و مشاہدات بے حد وقیع اور وسیع تھے اور جن سے وہ بخوبی آگاہ اور مانوس تھیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی اور دیگر شرکا کا استقبال کرتے ہوئے سینٹر فار انڈین لینگویجز جواہر لال نہرو یونیوسٹی کے چیئر پرسن پروفیسر انور پاشا نے اپنے تعارفی خطبے میں کہا کہ عصمت چغتائی ترقی پسند فکشن نگاری کا ایک اہم ستون رہی ہیں۔ ان کا تعلق اردو فکشن نگاری کی اس نسل سے تھا جس نے پریم چند کی روایت کو نئی جہات سے روشناس کرایا۔ عصمت چغتائی ایک بے باک اور معروضی اندازِ فکر رکھنے والی ادیبہ تھیں جنھوں نے جنس کی بنیاد پر عورتوں کے ساتھ کسی بھی امتیاز کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اس جلسے کی صدارت بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر، صدر ڈاکٹر شکیل معین نے کی اور عصمت چغتائی کی ادبی خدمات کا ذکر کیا۔ پروگرام پروفیسر رام چندر کے شکریہ کے ساتھ اختتام پذیر ہوئے۔ اس جلسے میں بڑی تعداد میں مختلف شعبوں کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 ستمبر 2015

خواجہ حسن نظامی کی حیات و خدمات

نئی دہلی: خواجہ ہال واقع بستی حضرت نظام الدین میں مصور فطرت شمس العلما خواجہ حسن نظامی کے عرس کے موقعے پر خواجہ حسن نظامی: حیات و خدمات پر منعقدہ سیمینار میں ادیب و دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار

کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں خواجہ صاحب جیسی شخصیات نظر نہیں آتی۔ پروگرام میں خواجہ حسن نظامی کی علمی اور تحقیقی جہات پر فاروق ارگلی اور ڈاکٹر مشتاق تجاروی نے اپنے مقالے میں ان کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی جبکہ افضل منگلوری نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے خواجہ حسن ثانی نظامی کے خلیفہ اور جانشین خواجہ سید محمد نظامی نے خواجہ حسن نظامی کی خدمات اور ان کے کارنامے بیان کیے اور عرس کی روایات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے خواجہ حسن نظامی کی علمی روایات کو جاری رکھنے پر زور دیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ وہ آج بظاہر ہمارے درمیان تو نہیں لیکن ان کا روحانی فیضان آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اکتوبر 2015

اگنو کے غالب اکادمی سینٹر میں ترغیبی پروگرام

نئی دہلی: اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے سینٹر غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں اردو ڈپلومہ سرٹیفکیٹ میں مندرج طلبہ وطالبات کے اندر اردو سیکھنے اور اردو کے تئیں تحریک پیدا کرنے کے لیے ایک ترغیبی

پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں طلبہ و طالبات نے اپنے تجربات پیش کیے۔ اردو ڈپلوما کی طالبہ ڈاکٹر گیتانجلی کالا نے کہا کہ ہم نے سرٹیفکیٹ کورس میں داخلہ لیا تو اس وقت کچھ بھی نہیں آ رہا تھا لیکن یہاں سے کورس کر کے اب اردو پڑھنے لگے ہیں اور جہاں بھی اردو میں چھپا ہوا دکھائی دیتا ہے تو اسے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے اور پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ آشوتوش برنوال نے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اردو سیکھنے کے بعد لہجے میں ندرت پیدا ہو جاتی ہے اور ہماری زبان درست ہو جاتی ہے اور ہم دوسری زبانوں کو بھی اچھی طرح بول لیتے ہیں۔ گوری نے کہا کہ غالب اکادمی کا سینٹر طلبہ کے لیے بہت ہی کارآمد ہے۔ اس موقعے پر غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے اردو سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر عرشیہ حسن نے اگنو کے بارے میں مختلف جہتوں سے روشنی ڈالی اور اردو کے حوالے سے دوسرے کورسیز کے بارے میں تفصیلات سے روشنی ڈالی۔ غالب اکادمی سینٹر کو آرڈینیٹر بشریٰ نے کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ یہاں زیادہ سے زیادہ طلبہ داخلہ لیں اور اردو زبان سیکھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اکتوبر 2015

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام کوی سندھی پروگرام کا انعقاد

نئی دھلی: میں شعر و ادب میں کسی تحریک، رجحان یا نظریے کا قائل نہیں۔ نہ ادب کو مکتبی، صوبائی یا ملکی

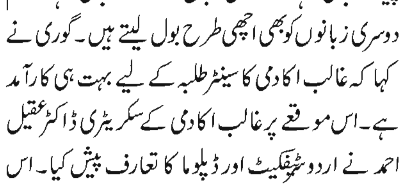

دائرے میں قید کرنے کے حق میں ہوں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ میں اپنے احساسات کے اظہار میں کسی سکہ بند نظریے کو رکاوٹ نہ بننے دوں بلکہ صرف حقائق اور سچائی کا دامن تھام کر آزادانہ طور پر جو محسوس کروں وہی لکھوں۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے معروف شاعر اور نئے موسم کی تلاش، زہر گل، خیال آباد، کارزیاں اور نہ یہ بستی ہماری نہ وہ صحرا ہمارا جیسے شعری مجموعوں کے خالق عالم خورشید نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام رویندر بھون میں منعقد کوی سندھی پروگرام میں کیا۔ اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے کوی سندھی پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کے تحت ہندوستان کے مشہور و معروف شعرا کو دعوت دی جاتی ہے اور اس موقعے پر ان سے ان کے تخلیقی عمل کے ساتھ ان کی شاعری کو سنتے ہیں۔ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے پروگرام کے آغاز میں عالم خورشید کا تعارف پیش کیا اور آخر میں شرکا کا شکریہ بھی ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 ستمبر 2015

غالب انسٹی ٹیوٹ میں ماجد دیوبندی کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب کا منظر

ماجد دیوبندی کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب

نئی دھلی: مشاعرے، سیمینار اور مذاکروں سے اردو کی حالت نہیں سدھرے گی بلکہ اردو زبان کو زندہ رکھنا ہے تو سب سے پہلے صرف ایک کام کرنے کی جانب توجہ مرکوز کرنی ہوگی اور وہ کام ہے اردو اساتذہ کی بحالی۔ یہ بات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پرفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو کلچرل سوسائٹی کی جانب سے غالب اکادمی میں اردو اکادمی کے نئے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی کے اعزاز میں منعقد استقبالیہ تقریب میں صدارتی تقریر کے دوران کہی۔ نظامت کے فرائض شعیب رضا فاطمی نے انجام دیے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مزید کہا کہ اگر اسکولوں میں طلبہ کو اردو نہیں پڑھائی جائے گی تو نئی نسل میں اردو کا فروغ کیسے ممکن ہے اور جب زبان ہی نہیں رہے گی تو پھر یہ شاعری اور کتابیں کون پڑھے گا؟ انھوں نے کہا کہ آج خود احتسابی کا وقت ہے، انھوں نے ماجد دیوبندی سے کہا کہ اگر آپ اردو کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو وزیر تعلیم اور ایجوکیشن سکریٹری کے سامنے یہ بات رکھیے کہ جو آر آر ہندی اور سنسکرت اساتذہ کی تقرری کے لیے نافذ ہیں ان ہی کو اردو اساتذہ کی بحالی کے لیے بھی کیا جائے۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال نے انھیں جو ذمے داری سونپی ہے وہ اس پر پورا اترنے کی کوشش کریں گے اور پوری ایمانداری اور محنت سے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے بہتر سے بہتر کام کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی کی جانب سے صحافت کے لیے دیے جانے والے ایوارڈ کو بھی مولوی محمد باقر کے نام منسوب کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر مہمان ذی وقار میں سلیم پور کے ممبر اسمبلی اشراق خان، دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر پرویز میاں، غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد اور مولانا جنید بنارسی بھی شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 جولائی 2015

المنت ایجوکیشن کی جانب سے تقسیم انعام

نئی دھلی: المنت ایجوکیشن کی جانب سے تقسیم انعام کا ایک پروگرام 13 ستمبر 2015 منعقد کیا گیا، جس میں 13 طلبہ و طالبات کو ٹرافی اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا اور بقیہ تمام شرکا کو سند دیا گیا۔ یہ انعام ان بچوں کو دیا گیا جنھوں نے 6 ستمبر کو اسلامی کوئز میں حصہ لیا تھا۔ واضح ہو کہ اول انعام کے مستحق شفابنت ریاض الحق ملی ماڈل اسکول، دوم انعام بشریٰ پروین بنت چاند محمد ملی ماڈل اسکول اور تیسرا انعام محمود صدیقی ولد محمد مسعود صدیقی ایم ایس کریٹیو نے حاصل کیا ان کے علاوہ دس امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے ذیشان خاں، جنت نشاں، محمد طلحہ، فاطمہ سیفی، عائشہ کوثر، صائمہ، صحیفہ، حذیفہ، کلثوم حامدی، شادان رضا ہیں۔ المنت ایجوکیشن کے سکریٹری محمد شہاب الدین نے اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ بچوں میں دینی مزاج پیدا کرنے کے لیے یہ کوئز منعقد کیا گیا تھا۔ دو سو سے زائد مختلف اسکول و مدارس کے طلبہ و طالبات نے شرکت کر کے اسلامی معلومات کا ثبوت دیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے حضرت مولانا اسرار الحق صاحب قاسمی ممبر آف پارلیمنٹ نے کامیاب ہونے والے طلبہ کو انعام سے نوازا۔ مولانا نے ایجوکیشن کے چیئرمین شہنواز احمد اور سکریٹری مولانا شہاب الدین رحمانی قاسمی کو مبارک باد دی۔ ذاکر حسین کے استاد ڈاکٹر عبیداللہ قاسمی

المنت ایجوکیشن کی جانب سے تقسیم انعام تقریب کا منظر

نے کہا کہ قرآن نے بار ہا تعلیم پر زور دیا ہے اور ابتدا وحی بھی تعلیم ہی کے متعلق ہے۔ بالخصوص عورتوں کی تعلیم کے متعلق اسلام نے بار ہا تاکید کی ہے۔

المنت ایجوکیشن کے چیئرمین شہنواز احمد نے کہا کہ آنے والے دنوں میں بھی ہم اس طرح کی خدمات انجام دیتے رہیں گے۔ انھوں نے اپنے تمام معاونین کو دل کی گہرائیوں سے دعائیں دی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب (Director of NCPUL) جن کی صدارت میں پروگرام ہونا تھا لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے وہ نہ آسکے، انھوں نے اپنی نیک خواہشات کے ساتھ اس مثبت قدم کو سراہا۔ نظامت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے مولانا میکائیل نے آخر میں صدر محترم پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی صاحب کا اور اپنے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس مبارک موقعہ پر راشد جمال صاحب چیئرمین نگر پالیکا، پریشد مئو، وسیم احمد، ابوذر رحمانی، کوکب، ثاقب حسنین، شارب ضیا رحمانی، شاہد انور، مولانا علاء الدین، محمد شہنواز، مشہود، فیاض صاحبان وغیرہ بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز: محمد شہاب الدین، سکریٹری، المنت ایجوکیشن، ابوالفضل، نئی دہلی، 14 ستمبر 2015

آندھرا پردیش:

خالد سعید کی الوداعی تقریب اور تحسین غزل پروگرام

حیدرآباد: ''پہلے میں غزل کو محسوس کر کے گاتی تھی لیکن اب اسے سمجھتی بھی ہوں اور لطف لیتے ہوئے گاتی ہوں۔ غزل میں لفظوں کی گہرائی، تلفظ، قواعد اور طریقۂ اظہار کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ گلوکاری کے فن کو سمجھنے کا یہ ایک پیمانہ ہے اور غزل احساسات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔'' ان خیالات کا اظہار معروف غزل گلوکارہ محترمہ نیرجا گری نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ''تحسینِ غزل'' کورس کے روحِ رواں پروفیسر خالد سعید کی الوداعی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر سعید 30 ستمبر کو سبکدوش ہو رہے ہیں۔ اس موقعے پر تحسین غزل کے طلبہ نے یونیورسٹی کے سید حامد سنٹرل لائبریری آڈیٹوریم میں اس تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر پرسادراؤ کوڈوری نے کہا کہ اردو یونیورسٹی کے اس کورس کے ذریعہ اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اساتذہ نے شعر کے ذریعے الگ الگ طریقوں سے غور و فکر کرنا سیکھا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر دپتی نے کہا کہ غزل کے ذریعے اب وہ بہتر طور پر اردو سمجھ کر اور لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس پروگرام کے ذریعے کئی کلچر، زبان اور شاعری کی قدر و قیمت سے آگاہی حاصل ہوئی۔ یہ ایک منفرد کورس ہے اور ان کے لیے ایک نایاب تجربہ ثابت ہوا۔ ڈاکٹر عینی حسن نے کہا کہ تحسین غزل پروگرام کے ذریعے اردو سیکھی۔ انھوں نے مختلف شعرا کے اشعار کے ذریعے پروفیسر خالد سعید کو خراج تحسین پیش کیا۔ کورس کی متعلم ڈاکٹر رتنا نے کہا کہ تحسین غزل پروگرام کی کلاسس بہت دلچسپ ہوا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر جسوین جیرات نے کہا کہ اردو سیکھنا ان کے بچپن کی تمنا تھی جواب پوری

ہوئی۔ اس کو مزید وسعت دینا چاہیے۔ محترمہ مونا کورین نے اشعار کے ذریعے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ پروگرام باغ سخن میں غزل کی خوشبو کی مانند ہے۔ آئی ٹی شعبہ سے وابستہ ایک اور متعلم ملن شریواستو نے کہا کہ تحسین غزل پروگرام کے ذریعے انھیں اردو سیکھنے میں بہت مدد ملی ہے اور غزل کو سمجھنے کا ایک نیا زاویہ حاصل ہوا ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 30 ستمبر 2015

اتر پردیش:

فراق گورکھپوری: فن اور شخصیت

کوشامبی: ڈاکٹر اے ایچ رضوی پوسٹ گریجویٹ کالج کراری کے زیراہتمام منیجر سید کرار حسین عرف راشد رضوی کے زیرصدارت فراق گورکھپوری کی تاریخ پیدائش کے موقعے پر ان کے 'فن اور شخصیت' پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا، جس

میں اساتذہ اور دیگر مقررین کے علاوہ طالبات نے بھی مقالے پڑھے۔ شاہانہ بانو، آفرین زہرا، اعجاز فاطمہ اور یٰسین فاطمہ نے فراق کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

کالج کے پی آر او جناب سنجے چوبے نے اپنی تقریر میں کہا کہ فراق جیسی شخصیت ملنا مشکل ہے۔ شعبۂ اردو کے ڈاکٹر شمشاد حیدر زیدی نے اپنے مقالے میں فراق کے انٹرویوز، خطوط، استقبالیے اور 'من آنم' کے حوالوں سے فراق کی شخصیت کی عکاسی کی اور کہا کہ فراق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل میں نئے نئے الفاظ داخل کیے جو اس سے قبل غزل میں استعمال نہیں کیے جاتے تھے۔ سیمینار کے آخر میں پرنسپل ڈاکٹر اشتیاق عالم اعظمی نے کہا کہ کچھ کم علم لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے جبکہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور خالص ہندوستانی زبان ہے۔ بہت سے غیر مسلم شعرا اور نثر نگاروں نے اردو کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے جن میں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا نام بھی شامل ہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شمشاد حیدر زیدی نے انجام دیے اور سامعین اور مقررین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر شمشاد حیدر زیدی، کوشامبی، الہ آباد 28 اگست 2015

اردو ادب کی آبیاری میں صوفیائے کرام کا حصہ

مراد آباد: اترپردیش اردو اکادمی اور ریاجن کلیان سمیتی رجسٹرڈ کے باہمی اشتراک سے مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج میں اردو ادب کی آبیاری میں صوفیائے کرام کا حصہ موضوع پر یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی سرپرستی علی نعیم چشتی سجادہ نشین درگاہ حضرت سلطان شاہ میاں نے کی۔ پروگرام کی صدارت حیات النبی خاں سجادہ نشین درگاہ حافظ صاحب نے کی۔ اترپردیش سرکار کے درجہ حاصل وزیر حاجی اکرام قریشی اس پروگرام کے مہمان خصوصی تھے۔ مہمانان گرامی میں یوپی اردو اکادمی کے رکن سید محمد ہاشم اور کادیہ سوربھ رستوگی منیجر مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج تھے۔ اس سیمینار میں مقامی و بیرونی مقالہ نگاروں نے اپنے پرمغز مقالات سے اردو شاعری میں صوفیائے کرام کے تعاون اور نگارشات کو بیان کیا اور بتایا کہ اردو میں تصوف اور صوفیائے کرام کے کلام کو خاص مقام حاصل ہے۔ سجادہ نشین علی نعیم چشتی نے مقالہ نگاروں کو سراہا۔ یوپی کے درجہ حاصل وزیر حاجی اکرام قریشی نے سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صوفی شعرا نے اپنے کلام سے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاق، عزت، ادب و احترام کا درس دیا ہے۔ سیمینار کے صدر حیات النبی نے صوفیائے کرام خصوصاً صوفی شعرا کی خدمات کا ذکر کیا۔ سیمینار کی نظامت سمیتی کے جنرل سکریٹری ناصر منصوری نے کی اور سبھی کا خیر مقدم و استقبال کیا اور سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ اس سیمینار میں مقالہ پیش کرنے والوں میں شفیق الرحمٰن برکاتی، ڈاکٹر آصف علی، ترنم پروین، سلمان نبی، بدر جہاں خورشید وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 ستمبر 2015

لکھنؤ میں اردو کوچنگ کا افتتاح

لکھنؤ: اردو کی بنیادی تعلیم اور تدریس کے سلسلے میں اترپردیش اردو اکادمی نمایاں ذمے داری نبھا رہی ہے۔ اس جذبے کے تحت صوبے کے حکام اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد/ افسران کے لیے اکادمی کے کیمپس میں کوچنگ کلاس کا افتتاح ضلع مجسٹریٹ راج شیکھر نے 'الف' لکھ کر کیا۔ افتتاحی پروگرام کی صدارت ضلع کے ایس ایس پی راجیش پانڈے نے کی۔ اس موقعے پر ڈی ایم راج شیکھر نے کہا کہ اردو اپنے ملک کی زبان ہے اور اسے سبھی کو پڑھنا اور سیکھنا چاہیے۔ اردو کو پڑھنے سے انتظامیہ کے افسروں کو بہت فائدہ ہوگا کیونکہ بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں یہ زبان کثرت سے بولی جاتی ہے۔ ایسی جگہ پر لا اینڈ آرڈر کو کنٹرول کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ دوسرے پرانے کاغذات اور رجسٹریاں اردو میں ہوتی ہیں اگر ہم افسران کو اردو زبان آتی رہے گی تو فیصلہ لینے میں آسانی رہے گی۔ میں اردو میں اپنا نام تحریر کرلیتا ہوں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ڈی ایم دفتر میں اردو کلاسز چلیں گی جس میں پڑھنے والوں کی فہرست تین دن میں اردو اکادمی کے چیئرمین نواز دیوبندی کو پہنچا دی جائے گی۔ ایس ایس پی راجیش پانڈے نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر نواز دیوبندی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے ہم لوگوں کو اردو پڑھنے اور سمجھنے کا موقع دیا ہے، اس سے ہم سب کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں نے اردو اور فارسی زبان اپنے والد سے پڑھی اور میرے دو بچے انجینئرنگ کررہے ہیں مگر میں انھیں اردو پڑھا رہا ہوں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اردو ڈپلوما کورس کررہے ہیں۔ اس موقعے پر چیئرمین اکادمی ڈاکٹر نواز دیوبندی نے بتایا کہ اس سے افسران کو اردو تعلیم اور اردو زبان کی اہمیت معلوم ہوگی۔ ان کو اردو والوں کے نام اور ان کی تحریر وغیرہ آسانی سے پڑھنا اور سیکھنا آجائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 ستمبر 2015

'نیا دور' کے علی برادران نمبر کا اجرا

لکھنؤ: اترپردیش کے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے اردو اور ہندی کو معاشرے کو ملانے اور مربوط کرنے والی زبان بتاتے ہوئے کہا کہ ہندی کے ساتھ آزادی کی لڑائی میں اردو کا بھی لاجواب کردار تھا۔ ریاستی حکومت اس زبان کی ترویج و اشاعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھے گی۔ مسٹر یادو آج یہاں ان کی سرکاری رہائش گاہ پر محکمہ اطلاعات کی طرف سے شائع اردو میگزین 'نیا دور' کے 21 ویں ورژن کو جاری کررہے تھے۔ یہ ورژن مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی پر خصوصی شمارہ ہے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ان زبانوں کی ترقی کے لیے ان کی حکومت نے کئی اقدامات اٹھائے ہیں۔ انھوں نے 'نیا دور' کو دیوناگری رسم الخط میں ترجمہ کرانے کا بھی اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو نے آزادی کی لڑائی اور معاشرے کو سمت دینے میں اہم ترین تعاون کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ 'نیا دور' میگزین ان لوگوں کے سامنے لائی جائے جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مسٹر یادو نے کہا کہ آنے والی نسل 'ڈیجیٹل' ہے اور وہ سب کچھ فوری طور پر جاننا چاہتی ہے، تو 'نیا دور' کو 'ایپ' پر بھی بھیجنا چاہیے۔ اس موقعے پر ریاستی وزیر مسٹر اعظم خاں نے مولانا جوہر اور ان کی ماں کی آزادی کی لڑائی میں دی گئی قربانیوں کا ذکر کیا اور ان کے کردار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ محکمہ اطلاعات کے چیف سکریٹری نونیت سہگل نے 'نیا دور' کو ڈیجیٹل کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ اس میں ان لوگوں کے بارے میں خصوصی طور پر مواد فراہم کیا جائے گا جنھوں نے ملک کی ترقی میں خصوصی کردار ادا کیا ہے اور اب عوام انھیں بھول گئی ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 24 ستمبر 2015

بہار:

عصمت چغتائی کی صد سالہ تقریب

عصمت چغتائی کی صد سالہ تقریب کا منظر

گیا: عصمت چغتائی نہایت ہی بے باک اور بے رحم افسانہ نگار مانی جاتی ہیں۔ اس لیے قرۃ العین حیدر نے انھیں لیڈی چنگیز خاں کہا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوکر انھیں ایک نظریہ مل گیا اور وہ لحاف کے بجائے ننھی کی نانی، لچھو پھوپھی، دو ہاتھ، ہندوستان چھوڑ دو جیسے عمدہ افسانے لکھ گئیں۔ یہ باتیں انجمن ترقی پسند مصنفین گیا کے زیر اہتمام مرزا غالب کالج کے سیمینار میں اردو ادب کی مشہور و معروف افسانہ نگار 'عصمت چغتائی'

کی صد سالہ تقریب کے موقعے پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہیں، اس پروگرام میں اردو مشاورتی کمیٹی بہار کے چیئر مین شفیع مشہدی، علی احمد فاطمی صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، خورشید اکبر ڈپٹی ڈائرکٹر راج بھاشا اردو بہار، مشتاق احمد نوری سکریٹری بہار اردو اکادمی پٹنہ کو گلدستہ اور شال پیش کر کے اعزاز دیا گیا۔ پروگرام دو نشست میں منعقد ہوا۔ پہلی نشست کی صدارت پروفیسر افصح ظفر اور نظامت مسعود منظر نے کی۔ اس موقعے پر ماہنامہ سہیل کا عصمت چغتائی نمبر مئی تا اگست کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر افصح ظفر اور نظامت ڈاکٹر احمد صغیر نے بحسن و خوبی انجام دی۔ پروفیسر افصح ظفر نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کے موضوعات جن کا تعلق عورت کی ذات اور صفات سے ہے اس کو عام نظر سے نہ دیکھ کر دیو مالائی اور تاریخی تناظر میں مطالعہ کرنا چاہیے۔ کوئی عورت سماج کے خلاف جب اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو وہ اپنی ذات اور صفات کو سماج کے سامنے کیسے پیش کرتی ہے۔ اس موقعے پر شفیع مشہدی نے کہا کہ اردو ادب میں وہ تانیثیت کی پہلی علم بردار تھیں۔ اس موقعے پر پروفیسر حسین الحق، خورشید اکبر، مشتاق احمد نوری، احمد کفیل، احمد صغیر، فخر الکریم، اشہد کریم، معصوم عزیز کاظمی وغیرہ نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 ستمبر 2015

بہار کے تمام اضلاع میں اردو لرننگ کورس

پٹنہ: اظہار الحق صدیقی، صدر، انجمن ترقی اردو بہار نے ایک پریس بیان جاری کر بتایا کہ انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام تمام اضلاع میں اردو لرننگ کورس اور ڈیجیٹل خواندگی مہم کے تحت شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ انجمن ترقی اردو بہار کو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الکٹرانک اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی، حکومت ہند کے ذریعے ڈیجیٹل خواندگی مہم کو چلانے کی منظوری حاصل ہے۔ انجمن ترقی اردو بہار کے تحت تمام ضلعی شاخوں کو ہدایات دی گئی ہیں۔ اس کورس میں داخلہ کے لیے بچوں سے 125 روپے فیس لے کر تربیت شروع کرنی ہے۔ سنٹرس کو تربیتی میٹریل انجمن ترقی اردو بہار مہیا کرائے گی۔ ان بچوں کا رجسٹریشن انجمن ترقی اردو بہار کے آئی ڈی سے کیا جائے گا۔ آخر میں ان بچوں کو آن لائن امتحان پاس کرنا ہوگا۔ پاس ہونے پر انھیں سرٹیفکیٹ مل سکے گا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 7 ستمبر 2015

عبدالمنان طرزی شخصیت اور فن

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام 4 اکتوبر کو ملت کالج کے کانفرنس ہال میں

عبدالمنان طرزی: شخصیت اور فن کے عنوان سے عالمی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام میں بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی جبکہ ڈاکٹر شمیم قاسمی، امجد علی سرور وغیرہ بطور مہمان اعزازی شریک ہوئے۔ پروگرام کی صدارت ملت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے کی جبکہ نظامت کے فرائض افسانہ نگار ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے انجام دیے۔ اس دوران ڈاکٹر منصور خوشتر، فردوس علی صحافی، نثار احمد ڈاکٹر عقیل صدیقی اور عرفان احمد پیدل نے مہمانوں کو شال اور گلدستہ دے کر استقبال کیا۔ پروگرام کے دوران ڈاکٹر منصور خوشتر کے تازہ شعری مجموعہ 'کچھ محفل خوباں کی' کا مہمانوں کے ہاتھوں اجرا کیا گیا۔ وہیں اس موقعے پر ٹرسٹ کی جانب سے بہار گیت کے شاعر ایم آر چشتی کو ان کی شعری خدمات کے لیے محمد فاروق ایوارڈ، جواں سال صحافی اور شاعر کو ان کی ادبی خدمات کے لیے الطاف حسین دمری ایوارڈ اور بزم اردو دوحہ قطر کے سکریٹری احمد اشفاق کو عبدالمنان طرزی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھوں نے عبدالمنان طرزی کی ادبی خدمات کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جو کام کیا ہے وہ بہار کی ادبی خدمات کو دور تک پہنچانے میں مدد و معاون ہوگا۔ پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے مہمان اعزازی ڈاکٹر شمیم قاسمی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مشتاق احمد نوری نے اپنے بیان میں ڈاکٹر طرزی کی زندگی اور ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ اس دوران عبدالمنان طرزی نے بھی اپنی زندگی پر مختصر طور پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 79 سال میری زندگی کے گزر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف مدارج پر روشنی ڈالی اور کانفرنس میں موجودہ طلبہ و طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی ہے۔ اس موقعے پر دوحہ قطر کی ادبی انجمن بزم اردو دوحہ قطر کے چیئر مین امجد علی سرور نے کہا کہ جناب طرزی کی شاعری کی دھوم ہندوستان کے ساتھ ساتھ خلیجی ممالک میں بھی ہے۔ ملت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے اپنے صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر طرزی کی علمی و فنی جدت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ جس میدان میں قدم رکھتے ہیں اس میں اپنی انفرادیت ضرور قائم کر دیتے ہیں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 5 اکتوبر 2015

تلنگانہ:

چینئی کے بخاری ہال میں یک روزہ سمپوزیم

چینئی: تامل ناڈو میں اردو شاعری کی روایت بہت توانا رہی ہے اور موجودہ دور کے شعرا کے کلام کے مطالعے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس کا مستقبل بھی بہت روشن ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ادیب و دانشور موسیٰ رضا نے چینئی میں نیو کالج کے بخاری ہال میں منعقد ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام یک روزہ سمپوزیم میں اپنی افتتاحی تقریر کے دوران کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ گرچہ لکھنؤ، دہلی ادب کا گہوارہ رہا ہے، تاہم شمال سے دور جنوب کی ریاست تمل ناڈو کی ادبی سرگرمیاں قابل فخر و قابل ستائش رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے خطاب میں ریاست تمل ناڈو میں 300 سال سے زائد عرصے سے جاری ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور نوائطی خاندان کی ادبی خدمات کا مختصراً خاکہ بھی پیش کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں معروف شاعر و صحافی چندر بھان خیال نے کہا کہ چینئی میں ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام اس سمپوزیم اور شعری نشست کے انعقاد کا مقصد اردو زبان و ادب کو فروغ دینا ہے اور یہاں کے شعرا کے معیاری کلام کو لوگوں تک پہنچانا ہے انھوں نے ریاست تمل ناڈو میں اردو ادب کی ارتقائی کوششوں کو بھی سراہا۔ پروفیسر سجاد حسین، صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی نے 'تمل ناڈو میں

اردو شاعری: تاریخی تناظر میں‘ کے عنوان سے اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے اپنے استقبالیہ کلمات میں ساہتیہ اکادمی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور ریاست تمل ناڈو کی ادبی سرگرمیوں پر مسرت کا اظہار بھی کیا۔ اکادمی کے پروگرام آفیسر مشتاق صدف نے تمل ناڈو میں اردو شاعری کی روایت اور معنویت پر روشنی ڈالی نیز تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد سیمینار کے پہلے تنقیدی اجلاس کی صدارت موسیٰ رضا نے کی جس میں ڈاکٹر کے ایچ کلیم اللہ نے ’تمل ناڈو میں اردو مثنویاں‘ اور ڈاکٹر ایم سعید الدین نے ’تمل ناڈو کی خواتین شاعرات‘ کے عنوانات سے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے تنقیدی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر قاضی حبیب احمد نے کی اور ڈاکٹر ایم بی امان اللہ نے ’تمل ناڈو میں اردو نظم نگاری‘، ڈاکٹر طیب خرادی نے ’تمل ناڈو کے نمائندہ غزل گو شعرا‘ اور ڈاکٹر مظفر الدین نے ’تمل ناڈو میں اردو نعتیہ شاعری‘ کے موضوع پر اپنے مقالے پیش کیے۔ آخر میں ایک شعری نشست کا بھی انعقاد کیا گیا۔

روزنامہ ’جدید خبر‘ دہلی، 30 ستمبر 2015

جموں و کشمیر:

عصمت چغتائی افسانوں کی روشنی میں

جموں: شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں اردو کی قدآور فکشن نگار عصمت چغتائی صد سالہ تقریبات کی کڑی کے تحت یک روزہ قومی سیمینار بعنوان ’عصمت چغتائی افسانوں کی روشنی میں‘ پروفیسر گیان چند جین سیمینار ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت نامور افسانہ نگار خالد حسین نے کی جبکہ مورخ اور شاعر اسیر کشتواڑی اور پروفیسر قدوس جاوید سابق صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی مہمانان ذی وقار کے طور پر شریک ہوئے۔ ریسورس پرسنز کی حیثیت سے پروفیسر خواجہ اکرام الدین سابق ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر صدف شاہ اور محمد آصف ملک نے شرکت کی اور عصمت چغتائی کے افسانوں کے موضوعات، کرداروں، موجودہ دور میں ان کے افسانوں کی اہمیت سے متعلق خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے عصمت چغتائی کے افسانوں اور ناولوں پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا کہ موصوفہ نے اپنی کہانیوں میں خواتین کے جنسی مسائل پر بڑے موثر طریقے سے لکھنے کے علاوہ معاشرے کے تلخ زمینی حقائق سے قارئین کو آگاہ کیا۔ خالد حسین نے صدارتی خطاب میں کہا کہ عصمت چغتائی کو فن افسانہ پر دسترس حاصل تھی اور ان کے منفرد انداز افسانہ نگاری کے سبب آج بھی ان کے افسانے اور ناول قارئین کی دلچسپی کا موجب ہیں۔ اسیر کشتواڑی نے عصمت چغتائی کو اردو ادب کی قد آور فکشن نگار قرار دیتے ہوئے کہا کہ عصمت اور ان کے معاصر راجندر سنگھ بیدی کی بازیافت وقت کا تقاضا ہے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک نے کہا کہ عصمت چغتائی کی بازیافت وقت کی پکار ہے جس کے لیے شعبہ اردو سرگرم ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے کہا کہ عصمت چغتائی نے جس انداز سے خواتین کے جنسی مسائل کی عکاسی کی ہے وہ کوئی دوسرا فکشن نگار نہیں کر سکا ہے۔ سیمینار کی نظامت ڈاکٹر عبدالرشید منہاس نے کی جبکہ شکریہ ڈاکٹر فرحت شمیم نے ادا کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 15 ستمبر 2015

مہاراشٹر:

شبلی اور حالی کی عصری معنویت

پونے: دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے 12 ستمبر 2015 کو قومی سیمینار بعنوان ’شبلی اور حالی کی عصری معنویت‘ اعظم کیمپس کے ہائی ٹیک ہال میں منعقد کیا

گیا۔ سیدہ ممتاز ظہور الدین اعزازی معتمد نے مہمانوں کا استقبال کیا اور محترمہ عظمیٰ تسنیم نے پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے مہمان خصوصی محترم جناب اشتیاق احمد ظلی (ڈائریکٹر دارالمصنفین شبلی اکادمی، اعظم گڑھ) نے اپنے کلیدی خطبے میں مولانا شبلی نعمانی کی تاریخی اور ادبی خدمات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

محترم جناب ڈاکٹر سلیم شہزاد (ادیب و مصنف) مہمان اعزازی نے شبلی کے شعری اسلوب پر روشنی ڈالی اور کہا کہ انھوں نے شعریت میں کافی اضافے کیے۔ جناب شمیم طارق (صحافی محقق و کالم نگار) نے اس پروگرام میں بطور اعزازی مہمان شرکت کی اور کہا کہ اس زمانے میں حالی نے اپنے کلام میں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو مخاطب کیا اور مجالس النسا جیسی کتاب لکھی اور خواتین کو توہمات سے باہر نکالا۔

محترمہ عابدہ انعامدار، صدر دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ نے اپنے صدارتی خطبے میں بچوں کو موجودہ دور کی نئی تکنیک کے ذریعے فائدہ اٹھانے کی تلقین کی اور یہ بھی کہا کہ تقریباً آج سے سو سال پہلے دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کے سیمینار کا سید سلیمان ندوی نے افتتاح کیا۔ اس سیمینار کے اختتام پر طلبا و طالبات کو انعامات سے نوازا گیا اور انجمن خیر الاسلام کو ان کی ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں (سابق صدر دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ) مرزا نیاز بیگ ٹرافی سے نوازا گیا۔ محترمہ سیدہ شاہدہ رفیق کے شکریہ پر اس سیمینار کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: عظمیٰ تسنیم، صدر شعبۂ اردو، مہاراشٹر، 12 ستمبر 2015

اقرا اردو ہائی اسکول بورنار (جلگاؤں) میں یوم ہندی کا انعقاد

جلگاؤں: اقرا ایجوکیشن سوسائٹی جلگاؤں کے زیر انصرام اقرا اردو ہائی اسکول بورنار تعلقہ و ضلع جلگاؤں میں 14 ستمبر 2015 کو بڑے پیمانے پر یوم ہندی منایا گیا۔ پنجم تا دہم جماعت کے تقریباً 25 طلبہ نے ہندی زبان میں نظمیں، گیت اور تقریر پیش کی۔ ابتدائی کلمات اسکول ہذا کے ہندی ٹیچر فیروز خان نے ادا کیے۔ جبکہ پروگرام کی نظامت ہندی کے استاد فہیم پٹیل نے کی۔ اس موقعے پر اسکول ہذا کے معاون مدرسین جناب شیخ روشن جعفر، جناب شیخ احمد حسین اور جناب امیر شیخ حمید نے بھی ہندی زبان اور ہماری مادری زبان اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اپنے صدارتی کلمات میں اسکول ہذا کے انچارج ہیڈ ماسٹر جناب عارف محمد خان نے پورے پروگرام کا احاطہ کرتے ہوئے اساتذہ اور طلبہ کی کوششوں کو سراہا۔ جواد شیخ نے رسم شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، شیخ احمد حسین، اقرا اردو ہائی اسکول، جلگاؤں، 15 ستمبر 2015

تہذیب و ثقافت:

ڈراما ’شام کے بعد کا سناٹا‘ کی پیشکش

بھیونڈی: حالات ادبی اسٹیج نے مصنف و ہدایتکار محمد صادق انصاری کا تحریر کردہ فل لینتھ ڈرامہ ’شام کے بعد کا سناٹا‘ کو پیش کر کے پذیرائی حاصل کی۔ 13 ستمبر کی شام کو بھیونڈی شہر کے مشہور میناتائی ٹھاکرے ہال میں ’شام کے بعد کا سناٹا‘ پیش ہوا۔ جس میں بطور مہمانان ممبئی سے تشریف لانے والوں میں ہمایوں پیرزادہ، سلیم بیگ، ادیب حسنین اور مہیب عالم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تمام کا استقبال ہفت روزہ حالات کے مدیر ایم ابوبکر اور

انصاری محمد صادق نے کیا۔ ان صاحبان نے اپنی اداکاری کی شروعات اسی ہال سے اور انصاری محمد صادق کی ہدایت کاری میں پیش کیا گیا ڈراما 'مجنوں کی اولاد' میں بطور اداکار کام کرکے کیا تھا۔ ڈراما میں ذوالفقار مومن، نیاز خان، مومن اصغر، اظہر انصاری، وسیم اختر انصاری، عظمت انصاری، جنید مومن اور وسیم مرزا نے اپنی لاجواب اداکاری سے سامعین کا دل جیت لیا۔

پریس ریلیز: عبدالرحمٰن یوسف، بھیونڈی، 18 ستمبر 2015

یوم اساتذہ پر مشاعرے کا انعقاد

نئی دہلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیراہتمام یوم اساتذہ کے موقعے پر درس و تدریس سے وابستہ شعرا کے لیے اکادمی کے قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے شمع روشن کرکے مشاعرے کا افتتاح کیا۔

مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض اطہر سعید نے انجام دیے اور مشاعرے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر رحمٰن مصور نے انجام دیے۔ پروفیسر طلعت احمد نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ سب سے کامیاب اساتذہ وہ ہوتے ہیں جنھیں 5 ستمبر کو ان کے طلبا بحیثیت استاد یاد کریں، طلبا کو تعلیم صرف اسناد کے لیے نہیں دی جائے بلکہ ساتھ ساتھ طلبا کی تربیت بھی کریں تاکہ وہ صرف تعلیم یافتہ نہ ہوں بلکہ ایک اچھے انسان بھی بن سکیں۔ اساتذہ اپنے طلبا کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھیں تاکہ وہ کسی بھی عہدے پر جائیں تو ان کی قدر و منزلت برقرارر ہے۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے خیرمقدمی کلمات پیش کیا اور تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مشاعرے کا باضابطہ آغاز ڈاکٹر احمد امتیاز کے کلام سے ہوا۔ اہم شعرائے کرام میں پروفیسر صادق، پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، ڈاکٹر شبانہ نذیر، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر عفت زریں، ڈاکٹر سلمٰی شاہین کے نام قابل ذکر ہیں۔ اردو اکادمی کے سکریٹری ایس ایم علی نے افتتاحیہ اجلاس کے اختتام پر اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 ستمبر 2015

اردو اکادمی کے زیراہتمام کل ہند مشاعرہ

نئی دہلی: اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی زبان ہے۔ اردو اکادمی کا سب سے بڑا کام ہے کہ اردو کو گھر گھر پہنچایا جائے۔ ان خیالات کا اظہار دہلی کے وزیراعلیٰ اروند کجریوال نے اردو اکادمی کے زیراہتمام منعقد کل ہند مشاعرے سے خطاب کرتے ہوئے ایوان غالب میں کیا۔ اس موقعے پر وزیر دہلی سرکار کپل مشرا، ممبر اسمبلی عمران حسین، حاجی محمد اشراق عرف بھورے، ایس کے بگا، ڈاکٹر سید فاروق، کمار وشواس، سابق ممبر پارلیمنٹ الیاس اعظمی بطور مہمان خصوصی موجود تھے۔ اس کی صدارت کنور بے چین نے جبکہ نظامت انور جلال پوری نے کی۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین ماجد دیوبندی نے خیرمقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے دہلی کے وزیراعلیٰ اروند کجریوال اور ان کے وزرا کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اس موقعے پر انور جلال پوری نے کہا کہ مذہبوں کی تو کوئی زبان ہوسکتی ہے لیکن زبانوں کا مذہب نہیں ہوتا ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ درجہ آٹھ تک کی تعلیم میں اردو رسم الخط کو ضرور جوڑ دیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں اردو سے واقف ہوجائیں اور اردو کو روزی روٹی سے بھی جوڑ دیا جائے۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی اور ممبران اظہرالدین، خالد سیفی، ڈاکٹر کوثر اسماعیل، مطلوب احمد، ڈاکٹر عرفان احمد، حاجی ارشاد احمد نے اروند کجریوال کو گلدستہ دے کر استقبال کیا۔ اس موقعے پر تمام شعرا کو اروند کجریوال نے گلدستہ دے کر استقبال کیا۔ جبکہ اس مشاعرہ میں بیکل اتساہی، ڈاکٹر راحت اندوری، جوہر کانپوری، گلزار دہلوی، معین شاداب، فیاض فاروقی، ڈاکٹر طارق قمر، نسیم نکہت، نصرت مہدی، شبینہ ادیب، سکندر حیات گڑبڑ، شہباز ندیم ضیائی، شمس رمزی، اقبال اشہر، ملک زادہ جاوید، منظر نسیم، شرف نان پاروی، اقبال فردوسی نے اپنا کلام پیش کیا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 اکتوبر 2015

اوکھلا میں آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد

نئی دہلی: گاندھی جی کے یوم پیدائش کے موقعے پر اوکھلا کے ممبر اسمبلی امانت اللہ خاں کی جانب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم کے سبزہ زار پر آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ مشاعرہ کی شمع عام آدمی پارٹی کے سینئر لیڈر و ترجمان سنجے سنگھ نے روشن کی۔ دیگر مہمانان میں گوپال رائے، عمران حسین ممبر اسمبلی، منوج کمار ممبر اسمبلی و جرنل سنگھ نے شرکت کی۔ سنجے سنگھ نے کہا کہ مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی کے لیے قربانی کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے مشاعرے کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے امانت اللہ خاں کو مبارکباد پیش کی۔ عمران حسین نے گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں گاندھی جی کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے سوچ کو بلند رکھنے کے ساتھ سادگی کے ساتھ رہنا چاہیے۔ امانت اللہ خاں نے اس موقعے پر کہا کہ مشاعرہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے اور اردو کے فروغ کے لیے مشاعروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے مشاعرہ میں شامل مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے سامعین کا بھی شکریہ ادا کیا۔ مشاعرہ کی نظامت معین شاداب نے کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 3 اکتوبر 2015

مشاعرہ طالبات

دیوبند: اترپردیش اردو اکادمی کے زیراہتمام نواب عظمت علی خاں گرلز انٹر کالج میں 'مشاعرۂ طالبات' کا انعقاد کیا گیا جس میں مذکورہ کالج کی طالبات کے علاوہ

ڈگری کالج تسمیہ جونیئر ہائی اسکول ڈی اے وی انٹر کالج، زینبیہ گرلز انٹر کالج اور آزاد ہائی اسکول کی طالبات نے مختلف شعرا کا کلام خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ مشاعرہ کا افتتاح آئی جی پولیس میرٹھ زون آلوک کمار شرما نے کیا اس موقعے پر مہمان خصوصی آلوک کمار شرما نے کہا کہ اردو زبان شیریں زبان ہے، نئی نسل کو اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھنا چاہیے اس سے سماجی رشتے مضبوط ہوں گے اور قومی یک جہتی کو فروغ ملے گا۔ اکادمی کے چیئرمین اور کالج کے منیجر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان اور تہذیب کو آپ سے بڑی توقعات ہیں۔ آپ تعلیم کے ساتھ فنون لطیفہ پر بھی بھرپور توجہ دیں تاکہ آپ کی شخصیت مکمل ہو اور آپ بلندیوں کو چھوسکیں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 23 ستمبر 2015

شام غزل کا انعقاد

نئی دہلی: اردو پریس کلب انٹرنیشنل کے زیراہتمام شام غزل کا انعقاد کیا گیا جس میں بطور مہمان خصوصی جامعہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دبئی چیپٹر کے صدر نے شرکت کی جبکہ مہمان ذی وقار کے طور پر اردو کے معروف

ناول نگار پیغام آفاقی اور مراد آباد کے اہم سماجی کارکن سعود عالم نے شرکت کی۔ صدارت اردو پریس کلب انٹرنیشنل کے چیئرمین ڈی آئی جی واجد علی نے کی۔ اردو پریس کلب انٹرنیشنل کے جنرل سکریٹری محمد طارق فیضی نے آئے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اردو شاعری اور اردو غزل کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ندیم زیدی نے اردو زبان کے حوالے سے یہ بات کہی کہ اردو ایک تاریخی زبان ہے اور گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ پیغام آفاقی نے کہا کہ اردو غزل ہو، نظم ہو، ناول ہو یا افسانے ہوں ہر چند کہ عام بول چال میں بھی بڑی اہمیت کی حامل زبان ہے اور اس زبان کو فروغ دینے کے لیے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 18 ستمبر 2015

آرٹ فیملی کے زیر اہتمام پینٹنگ نمائش

نئی دھلی: آرٹسٹ کی بین الاقوامی 'آرٹ فیملی' کے زیر اہتمام للت کلا اکادمی میں معاصر فنون لطیفہ کی ایک قومی گروپ نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر مختلف

رنگوں اور خطوط سے موجودہ دور کے سماجی مسائل کی تصویروں کے ذریعے عکاسی کی گئی تھی۔ آرٹ فیملی کے صدر ایس اے جعفر نے کہا کہ ہم نے 2009 میں اس کو شروع کیا ہے اور ہمارا یہ نواں شو ہے۔ اس میں دوسرے ممالک کے آرٹسٹ جیسے امریکہ، بحرین، جرمنی اور بنگلہ دیش سمیت ہندوستان کی تمام صوبائی تہذیب و ثقافت پیش کی جاتی ہے۔ اس گروپ شو میں ہم نے سماجی سروکاروں کو پیش کیا ہے۔ پروفیسر ایس پی ورما نے کہا کہ فنون لطیفہ کا تعلق انسانی جذبات سے ہوتا ہے جو بھائی چارے، رواداری، مساوات اور ہمدردی پر مشتمل ہے اور ہم ان پینٹنگ اور آرٹس کے ذریعے بھی اسی پیغام کو آرٹسٹ عام کرتے ہیں۔ اس گروپ شو میں ایس پی ورما، راج ماجی، میناکشی ٹھاکر، راجو رام رتن، ڈاکٹر بشریٰ نسیم، نبین داس، ربی پاشی، راہل مکھرجی، نصر باقری اور ڈاکٹر حنا فاطمہ معینی کی بنائی ہوئی خوبصورت تصویریں نمائش کے لیے آویزاں کی گئی تھیں۔ خاص طور سے نصر باقری کی پینٹنگ اسلامی نظریات و خیالات پر مشتمل ہے جس میں اسلام کے نقطے کو واضح کیا گیا ہے۔ ان کی تصویروں میں لا الہ الا اللہ، بسم اللہ، انا مدینۃ العلم کو بہت اچھے رنگوں اور ماڈرن آرٹس کے ذریعے بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلامی آرٹس کو ہم نے اس لیے اپنایا کہ اس میں مختلف فنون کا سرمایہ پوشیدہ ہے اور اس کے ذریعے پوری دنیا میں اسلام کے پیغام امن و محبت کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ نمائش کا افتتاح مینو اگروال بھشٹ اور کویتا متھل نے کیا اور تمام آرٹسٹ کو گلدستہ پیش کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اکتوبر 2015

اعزاز و اکرام:

پروفیسر شمیم حنفی، گیان گریما مانداایوارڈ سے سرفراز

نئی دھلی: ہندوستانی گیان پیٹھ نے اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر شمیم حنفی کو 'گیان گریما مانداایوارڈ' سے سرفراز کیا

گیا۔ آل انڈیا گیان گریما کمیٹی کے 70 سال مکمل ہونے کے موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی کو یہ ایوارڈ ان کے گھر واقع ذاکر باغ میں پیش کیا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی اپنے قابل ذکر تنقیدی سرمایوں کی وجہ سے اردو تنقید میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کا شمار برصغیر ہندو پاک میں اردو کے انتہائی معتبر اور صف اول کے ناقدین میں ہوتا ہے۔ اس موقعے پر گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ شاعر کیدارناتھ سنگھ، مرتی دیوی ایوارڈ یافتہ مشہور نقاد اور محقق ڈاکٹر وشواش ناتھ ترپاٹھی، معروف صحافی مدھوسودن آنند، گیان پیٹھ کمیٹی انتظامیہ کے ممبر نیاسی ساہو اکھلیش جین وغیرہ موجود تھے۔

روز نامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 ستمبر 2015

محمد صہیب قاسمی کو ایوارڈ

کیرانہ: کیرانہ میں واقع مغل گارڈن میں رہبر فاؤنڈیشن کی جانب سے منعقد پروقار تقریب میں کیرانہ سے روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' کے نوجوان و بے باک صحافی محمد صہیب قاسمی کو سابق گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی کے دست مبارک سے خصوصی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھوں نے دوران خطاب کہا کہ صحافت قلم کا جہاد ہے، حق باطل کے امتیاز کی وضاحت، مظلوموں کی آرزوؤں کی امیدیں، ہندو مسلم میں اتحاد پیدا کرنا وغیرہ ان قلم کے

مجاہدوں اور قلم کے سپاہیوں کا ہی کارنامہ ہوتا ہے، ان کی جتنی حوصلہ افزائی کی جائے کم ہے۔ میڈیا سینٹر کے صدر سدھیر چودھری نے محمد صہیب قاسمی کو ایوارڈ برائے صحافت ملنے پر مبارکباد پیش کی۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 ستمبر 2015

قلمکار ویلفیئر سوسائٹی کی اعزازی تقریب

مئو: 30 اگست کو شہر کے راجستھان بھون میں معروف شاعروں، ادیبوں اور ادب نوازوں کی جانب سے قلمکار ویلفیئر سوسائٹی کے بینر تلے ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں پانچ قلمکاروں کو اعزاز سے سرفراز کیا گیا جنھیں اردو اور ہندی اکادمی اتر پردیش نے ان کے قلمی شاہکاروں پر انعامات سے نوازا ہے۔ ان قلمکاروں میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر جے پرکاش دھوم کیتو، ڈاکٹر شکیل احمد، اوماشنکر رائے ایڈوکیٹ اور ڈاکٹر اعظم انصاری شامل ہیں۔

اس تقریب کی صدارت سابق چیئرمین محمد طیب پالکی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے بار کونسل آف اتر پردیش کے سابق چیئرمین عبدالرزاق نے شرکت کی اور مہمان اعزازی کے طور پر ڈاکٹر شباب الدین، صدر شعبہ اردو، شبلی نیشنل پی جی کالج، اعظم گڑھ نے شرکت کی۔ صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے طیب پالکی نے کہا کہ ہمارے شعرا اور ادبا سماج کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر ہمارا قلمکار صحیح لکھتا رہے گا تو سماج صحیح راستہ پر چلتا رہے گا اور اگر قلمکار بھٹک جائے گا تو پورا سماج اور معاشرہ بے راہ ہوجائے گا۔ پروگرام کا آغاز محمد اسلم ایڈوکیٹ، بانی و صدر قلمکار ویلفیئر سوسائٹی نے خطبۂ استقبالیہ سے کیا۔ اس کے بعد سوسائٹی کے سکریٹری ستیہ پرکاش ایڈوکیٹ نے سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔

مہمان خصوصی عبدالرزاق نے ادب کے حوالے سے اپنے تجربات کا اشتراک کیا اور اسے معاشرہ کی حالت میں

تبدیلی لانے کا ایک موثر ذریعہ قرار دیتے ہوئے اصلاحی ادب کی تخلیق پر زور دیا۔ ڈاکٹر شباب الدین نے کہا کہ ماضی میں اردو اور ہندی ادب کے فروغ میں ہندو مسلم کا جو سنگم رہا ہے اسے اس دور میں بھی بڑھاوا دینے کی ضرورت ہے۔ اعزاز سے نوازے گئے قلمکاروں نے اپنے تاثراتی کلمات میں قلمکار ویلفیئر سوسائٹی اور اس کے اراکین اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز: اسلم ایڈوکیٹ، صدر قلمکار ویلفیئر سوسائٹی، مئو، 14 ستمبر 2015

اشرف استھانوی کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ

پٹنہ: بہار کے معروف صحافی، مصنف اور عوامی اردو نفاذ کمیٹی بہار کے سربراہ اشرف استھانوی کے اعزاز میں لسانی تنظیم ایوانِ اردو مجلس (رجسٹرڈ) پٹنہ کے زیر اہتمام

پٹنہ ہائی کورٹ کے سابق سیشن آفیسر بدر احمد خاں کی رہائش گاہ واقع کنکر باغ میں 'ایک شام اشرف استھانوی کے نام' کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں کثیر تعداد میں موجود اردو کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے ان کے صحافتی اور تصنیفی خدمات نیز اردو کی ترویج و ترقی میں ان کے گراں قدر کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر انھیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوان اردو مجلس (رجسٹرڈ) کے جنرل سکریٹری پروفیسر سید احسان اشرف نے اشرف استھانوی کی کئی کتابوں پر اپنی رائے پیش کی۔

پریس ریلیز: اشرف استھانوی، سینئر جرنلسٹ، پٹنہ 31 اگست 2015

رسم اجرا:

خرمن

نئی دہلی: انڈیا ہیبیٹیٹ سینٹر کے جوزف اسٹین

آڈیٹوریم میں مشہور شاعر اور نغمہ نگار جاوید اختر کے دادا اور جاں نثار اختر کے والد مضطر خیر آبادی کے پانچ جلدوں پر مشتمل کلیات 'خرمن' کی رسم اجرا نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ مضطر خیر آبادی کے کلام کی اشاعت بہت بڑا کارنامہ ہے جس کے لیے جاوید اختر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے مضطر خیر آبادی کا ایک شعر بھی پڑھ کر سنایا۔ معروف ادیب و نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 90 سال بعد مضطر خیر آبادی کی اس کلیات کی اشاعت کو تاریخی واقعہ بتایا۔ پانچ جلدوں پر ان کے کلیات کو شائع کرنا بہت بڑا کام ہے۔ انھوں نے کہا کہ جاوید اختر کا خاندان چھ نسلوں سے علم و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں علامہ فضل حق خیر آبادی، علامہ فضل امام، علامہ عبدالحق، جاں نثار اختر، صفیہ اختر اور دیگر لوگوں کے نام بھی پیش کیے۔ اس موقعے پر کتاب کے حوالے سے اپنے تجربات پیش کرتے ہوئے کہا کہ دس سالوں کی سخت محنت اور تلاش و جستجو کے بعد یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ انھوں نے تاریخی انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ مشہور زمانہ غزل 'نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں' جو بہادر شاہ ظفر سے منسوب ہے، وہ دراصل مضطر خیر آبادی کی تخلیق ہے۔ انھوں نے اس کلیات کی ترتیب و تحقیق کے حوالے سے بتایا کہ والد محترم جاں نثار اختر کے انتقال کے تقریباً 22 سال بعد جب نقل مکانی کا ارادہ کیا تو جو کاغذات ان کے پاس تھے، انھوں نے مجھے دے دیے، میں نے ایک دن اس کو کھول کر دیکھا تو اس میں فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی اور آل احمد سرور اور دیگر ادبا و شعرا کے خطوط ملے اور تقریباً پونے دو سو غزلوں پر مشتمل ایک مجموعہ کلام کا مسودہ بھی ملا جس پر 'خرمن' کا عنوان درج تھا۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے عبداللہ نے مضطر خیر آبادی کا تعارف پیش کیا، شبانہ اعظمی فرحان اختر اور منیزہ نے مضطر خیر آبادی کے اشعار پیش کیے۔ اس موقعے پر ریختہ فاؤنڈیشن کے سربراہ سنجیو صراف، زویا اختر، سید شاہد مہدی، ایم کے رینا، کانگریس کے ترجمان م افضل، صدیق الرحمٰن قدوائی، برکھا سنگھ، سراج الدین قریشی، نعمان شوق، سیماب سلطان پوری، انیس اعظمی، سید فیصل علی، کمال فاروقی کے علاوہ بڑی تعداد میں مضطر خیر آبادی کے خاندان کے افراد و دیگر ادبی و فلمی ہستیاں موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 7 ستمبر 2015

سرمایہ سخن

نئی دہلی: علی سردار جعفری کی کتاب 'سرمایہ سخن' کا کوئی جواب نہیں، اس سے صرف اردو کے اسکالر ہی استفادہ نہیں کریں گے بلکہ اردو کے عام قارئین بھی اس سے محظوظ ہوں گے۔ ہمیں اس بات کا عزم کرنا چاہیے کہ سردار جعفری کے بقیہ تحقیقی سلسلوں کو بھی عوام تک پہنچا دیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے اپنی رہائش گاہ پر منعقدہ پروگرام میں علی سردار جعفری کی کتاب 'سرمایہ سخن' کی دوسری جلد کی رسم اجرا کی تقریب میں مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ اس کتاب کو مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدر آباد نے شائع کیا ہے۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے مانو کے وائس چانسلر خواجہ ایم شاہد نے کہا کہ اس کتاب کے ذریعے ہم علی سردار جعفری کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ ان کی تحریری اور تحریکی سرگرمیوں کا نصب العین سماجی اصلاح، غریبوں اور مظلوموں کی دادرسی تھی۔ اس کتاب کی جلد اوّل 2001 میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے شائع ہو چکی تھی۔ پروفیسر نسیم الدین فرید نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ سرمایہ سخن سردار جعفری کا شاہکار علمی اور تحقیقی کارنامہ ہے جس میں ان الفاظ کی تراکیب، تلمیحات، اشارات اور توضیحات سے تحقیقی بحث کی گئی ہے جو بیک وقت کئی جہات رکھتے ہیں اور ان تمام معنوں کو انھوں نے کئی شعری اور نثری مثالوں سے بھی ثابت کیا ہے۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامی کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے اپنے خیالات پیش کیے۔ ہدیہ تشکر پیش کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ سردار جعفری کا بہت بڑا احسان ہے کہ ان کے سرمایہ سخن سے نئی نسل مختلف جہتوں سے فائدہ حاصل کرے گی۔ انھوں نے علی سردار جعفری کی علمی، فکری اور تحقیقی صلاحیتوں کو مختلف مثالوں سے بھی واضح کیا۔ انھوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ اس کتاب کے بقیہ ٹائپ شدہ مواد کو قومی کونسل شائع کرے گی خواہ وہ کتنے ہی جلدوں پر مشتمل ہوں۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی،

فرح حبا کی کتاب کے اجرا کا منظر

اے ایم یو کے سابق وائس چانسلر اور قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین آئی اے ایس نسیم احمد، مانو کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں، بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اکتوبر 2015

فرح حبا کی کتاب کا اجرا

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ انجینئرنگ کے آڈیٹوریم میں فرح حبا پرویز کی کتاب Feminist and Orientalist Perspectives کا اجرا کیا گیا جس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کے ساتھ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر طلعت احمد، ترکی سفیر محمد اکبر سراج قریشی، ظفر اقبال، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر مکیش رنجن وغیرہ نے شرکت کی۔ اس موقعے پر نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے فرح حبا کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ یقیناً عمدہ اور مایہ ناز کتاب ہے۔ اس سے صنف نازک کو مستقبل میں نمایاں کارنامہ انجام دینے کا حوصلہ ملے گا۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری اور مہمانانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا۔ واضح رہے کہ فرح کی یہ کتاب ترکی سفارت خانہ کے میری منغا گیوز کی زندگی کے بارے میں ہے۔ علاوہ ازیں پروگرام میں جامعہ کے مختلف شعبہ جات کے پروفیسران، فرح حبا کے اہل خانہ کے ساتھ ساتھ باہر کے کئی ماہرین و دانشور لوگوں نے شرکت کی۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 ستمبر 2015

ساؤتھ ایشیا بائبل کمنٹری

نئی دھلی: نئی دہلی کے نارتھ ایونیو میں واقع شاہی چرچ میں معروف مصنف ڈاکٹر برئین وٹل کی تحریر کردہ کتاب 'ساؤتھ ایشیا بائبل کمنٹری' کا اجرا نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر نائب صدر محمد حامد نے محبت، اتفاق و اتحاد پر زور دیا اور ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو ایک پیالہ میں سموتے ہوئے کہا کہ بڑی خوشی ہورہی ہے کہ ایک مسلم بائبل کا اجرا کررہا ہے، یہ صرف ہندوستان کی ہی خوبی ہے جہاں ایسا ممکن ہے۔ صدر نے کہا کہ بائبل ہبروزبان میں ہے، قریب ایشیا کے 90 سے زیادہ لوگوں نے بائبل کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر جو ترجمہ مصنف نے کیا ہے وہ قابل تعریف ہے، میں اس کے لیے کاتب کا شکریہ اور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس سے قبل معروف قلمکار ڈاکٹر ابراہیم نے تمام مہمانوں کا گلدستہ پیش کرکے استقبال کیا۔ جبکہ چرچ کے فادر ڈاکٹر پال سوروپ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 5 اکتوبر 2015

اے ایم یو میں 15 کتابوں کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے سرسید ہاؤس میں واقع پبلیکیشن ڈویژن کے زیراہتمام مختلف زبانوں میں شائع پندرہ کتب کا اجرا کیا۔ ساتھ ہی سرسید اکادمی کے زیراہتمام منعقدہ آرٹ نمائش میں حصہ لینے والے طلبا و طالبات کو انعامات سے نوازا۔ واضح ہو کہ علی گڑھ مسلم یونیورٹی کی تاریخ میں پہلی بار سرسید پر پروفیسر شان محمد کی کتاب کا پنجابی ترجمہ ڈاکٹر کرانتی پال نے کیا ہے۔ اس پنجابی کتاب کا بھی اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر آذرمیدخت صفوی کی امیر خسرو پر ترتیب دی گئی کتاب، پروفیسر گلریز کی عرب اسپرنگ پر ترتیب دی گئی کتاب، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کی کتاب قرآنیات و ادبیات، پروفیسر آصف نعیم صدیقی کی ترتیب دی گئی کتاب دیوانِ نظیری، پروفیسر توقیر عالم کی دو کتاب، ڈاکٹر محمد اظہر کی مغربی ایشیا پر کتاب، پروفیسر حسین مہدی رضوی کی علامہ اقبال پر کتاب، ڈاکٹر گلفشاں خاں کی سرسید اور شیخ عبداللہ پر کتاب، ڈاکٹر راشد انور راشد کی اردو غزل پر کتاب، ڈاکٹر لامان سمیع کی کامرس پر کتاب، اے بی کے اسکول کی ڈاکٹر فرحت پروین کی انگریزی کتاب اور ڈاکٹر محمد آزاد حسین کی غالب پر کتاب کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ڈاکٹر حسین حیدر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر آرٹ نمائش میں یونیورسٹی سطح کے مقابلہ میں راجیو کمار شرما، کالج سطح پر نایاب خاں اور اسکول سطح پر حفصہ بن اختر کو وائس چانسلر نے انعامات سے نوازا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 9 ستمبر 2015

ضد، جنون اور زندہ دلی کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے لکھنؤ سے آئے ہندی کے ممتاز قلم کار اور صحافی پنڈت ہری اوم شرما ہری کی اردو کتاب 'ضد، جنون اور زندہ دلی' کا اپنے دفتر میں اجرا کیا۔ اس موقعے پر اے ایم یو کے رجسٹرار ڈاکٹر اصغر علی خاں، ماس کمیونی کیشن شعبہ کے پروفیسر ایم شافع قدوائی اور شعبۂ تاریخ کے ڈاکٹر محمد سجاد کے علاوہ پنڈت ہری اوم شرما کی اہلیہ مایا دیوی شرما بھی موجود تھیں۔ اس موقعے پر وائس چانسلر نے سماجی ہم آہنگی اور اتحاد کے تئیں پنڈت ہری اوم شرما کے نظریہ کو سراہا اور انھیں تکثیریت اور رواداری کا علمبردار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ شرما جی کی تحریروں میں جس طرح انسانی اقدار کو ابھارا گیا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ جنرل شاہ نے کہا کہ ان کی تحریروں میں ذات، مذہب، زبان اور علاقائیت کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ اس موقعے پر پنڈت ہری اوم شرما نے کہا کہ آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے دنیا میں علی گڑھ کی پہچان ہے اور جو فرقہ پرست طاقتیں اے ایم یو کو بدنام کرنے کی سازش کررہی ہیں، انھیں یونیورسٹی کیمپس میں کچھ وقت گزار کر یہاں کی روایات، اخلاق اور تہذیب وثقافت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 ستمبر 2015

'لہو میں وطن'

الٰہ آباد: پدم شری پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے ہیسٹنگ روڈ واقع مکان میں عطاء الرب ایڈوکیٹ سپریم کورٹ کا

تحریر کردہ ہندی کا شعری مجموعہ 'لہو میں وطن' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی نے کی۔ اس موقعے پر مذکورہ شعری مجموعہ کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ ہندی کویتا پر مشتمل اس مجموعہ کی خوبی یہ ہے کہ شاعر عطاء الرب نے سماج کو بہت قریب سے سمجھا ہے اور اپنے تجربات کو بہ حسن وخوبی شاعری کے ذریعے پیش کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اکتوبر 2015

اقبال اور اسرارِ حیات

نئی دھلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں سینٹ اسٹیفن کالج کے استاذ ڈاکٹر شمیم احمد کی کتاب 'اقبال اور اسرارِ حیات' کی رسم اجرا کی تقریب منعقد ہوئی، جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ اکرام نے شرکت کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ دہلی یونیورسٹی کا شعبہ اردو انتہائی فعال اور متحرک ہے۔ انھوں نے طلبہ و طالبات کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ متن کی قرأت پر انحصار کریں کسی متن کی تنقید کو ہی پڑھ کر مطمئن نہ ہوں۔ اس موقعے پر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم احمد انتہائی فعال اور متحرک ہیں۔ گفتگو میں شعبہ کے سینئر استاذ ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ عالمی منظرنامے کی بدلتی صورت حال کے پیش نظر اقبال کو مزید سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال عقائد و مذاہب سے اوپر اٹھ کر انسان کو انسانیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس موقعے پر مرتب کتاب ڈاکٹر شمیم احمد نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے شعبے کے صدر پروفیسر ابن کنول کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام کے صدر پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اقبال کی تفہیم کا شوق رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب اہم ثابت ہوگی۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے کی۔ اخیر میں ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کتاب، صاحب کتاب اور اقبال کے فن پر گفتگو کی اور اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 ستمبر 2015

ہمارا طرزِ زندگی اور بیماریاں

کامٹی: کامٹی ضلع ناگپور کی معروف ادبی شخصیت ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی کی چوتھی کتاب 'ہمارا طرز زندگی اور بیماریاں' کا اجرا بتاریخ 29 اگست 2015 کو پبلک لائبریری گجری بازار کامٹی میں محترم ایس کیوزماں (سابق ایم ایل سی) کے ہاتھوں سے انجام دیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت محترم حفظ الرحمٰن صاحب (سابق مدرس) نے فرمائی۔ مذکورہ کتاب کے محاسن پر بالترتیب ڈاکٹر سمیہ افشاں (افراح)، ڈاکٹر ابوالکلام (سابق پرنسپل) ڈاکٹر اظہر حیات (سابق صدر شعبۂ اردو) صاحبان نے پرمغز مقالے پیش کیے۔ خطبۂ صدارت میں محترم حفظ الرحمٰن نے ڈاکٹر جاوید صاحب کی کتاب کی اہمیت، افادیت اور ضرورت پر سیر حاصل بحث کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر جاوید احمد، کامٹی، 1 ستمبر 2015

'سائنس پڑھو اور آگے بڑھو'

کولکاتا: 11 ستمبر 2015: مشہور و معروف سائنسی مصنف و مضمون نگار پرنسپل عبدالودود انصاری کی اکیسویں کتاب 'سائنس پڑھو اور آگے بڑھو' کی تقریب رونمائی 11 ستمبر 2015 کو بدست محمد ندیم الحق، ایم پی و مدیر روزنامہ اخبار مشرق، کولکاتا، ڈاکٹر اے ایم او غنی پرائمری اسکول میں ہوئی۔ صدارت شاہ محمد قادری اور نظابت کے فرائض خواجہ احمد حسین نے انجام دیئے۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے محمد ندیم الحق نے کہا کہ سائنس کے موضوع پر یہ ایک انوکھی کتاب ہے یعنی روایتی سائنس کے خشک مضمون کے بجائے اس کے مضمون میں پڑھنے والوں کے لیے قصہ کہانی کے انداز میں چاشنی پیدا کی گئی ہے۔ اس موقعے پر تقریب کے صدر شاہ محمد قادری نے کہا کہ ابتدائے اسلام میں ہم نے سائنس سے استفادہ کیا اور دنیا پر غالب ہوگئے اور آج نوبت یہ کہنے کی آ پہنچی کہ "سائنس پڑھو اور آگے بڑھو"۔

پریس ریلیز: محمد نسیم، صدر مدرس، اے ایم او غنی میموریل پرائمری اسکول، 26 دلکشا اسٹریٹ، کولکاتا، 21 ستمبر 2015

پرشکستہ

جمشیدپور: کریم سٹی کالج جمشیدپور کے پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو کی جانب سے ڈاکٹر افسر کاظمی کے

شعری مجموعہ 'پرشکستہ' کی رونمائی پروفیسر سید صفدر رضی پرنسپل کوآپریٹو کالج کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس پروگرام کی صدارت ڈاکٹر محمد زکریا پرنسپل کریم سٹی کالج نے کی۔ مقررین میں شہر کے نقاد جناب منظر کلیم نے افسر کاظمی کی شاعری پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ افسر کاظمی بنیادی طور پر طنز و مزاح کے آدمی ہیں جن کی تحریریں انسان کے دکھے دلوں کو مزاح کی چاشنی سے خوش کرتی ہیں۔ مہمان خصوصی سید صفدر رضی نے کہا کہ افسر کاظمی کریم سٹی کالج کے شعبۂ اردو سے منسلک تو ہیں ہی لیکن اب ادبی حلقوں میں ان کی پہچان بن چکی ہیں۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر محمد زکریا نے کی۔ اظہار تشکر ڈاکٹر محمد ریاض نے پیش کیا۔ جب کہ نظامت پروفیسر نداز کریا نے کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 ستمبر 2015

عیدگاہ سے واپسی

جمشیدپور: 'عیدگاہ سے واپسی' نئی صدی میں منظرعام پر آنے والے افسانوی مجموعوں میں انفرادیت کا حامل ہے۔ مجموعہ کے زیادہ تر افسانے سماج کے تضاد کو عمدگی سے پیش کرتے ہیں۔ مظہرالحق عربی فارسی یونیورسٹی، پٹنہ کے وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے ڈاکٹر شری کرشن سنہا سنستھان، بسٹوپور جمشیدپور میں 'دنیائے ادب' کے زیراہتمام معروف افسانہ نگار اسلم جمشیدپوری کے تازہ افسانوی مجموعے 'عیدگاہ سے واپسی' کی رسم اجرا کے موقعے پر بطور مہمان خصوصی خطاب کررہے تھے۔ اسی موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معروف افسانہ نگار ابرار مجیب نے کہا کہ مجموعہ میں شامل تمام تر افسانے اسلم جمشیدپوری کی روایت سے گہری وابستگی اور فنی شعور کی اعلیٰ جہت کی نمائندہ ہیں۔ اس موقعے پر شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ، میرٹھ کے رسالہ ہماری آواز کے خصوصی شمارے کا بھی اجرا سید رضا عباس رضوی 'چھبن' کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ خطبۂ صدارت میں سید رضا عباس رضوی 'چھبن' صاحب نے کہا کہ عیدگاہ سے واپسی کے ذریعے اسلم جمشیدپوری کے ساتھ ساتھ جمشیدپور کی بھی ادبی شناخت ادب میں مزید واضح ہوگی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شری کرشنا سنستھان کے جنرل سکریٹری جناب ہرولبھ سنگھ آرسی اور شہر کے مشہور وکیل اور ہندی ادیب جناب لکشمی ندھی نے بھی پریم چند اور عیدگاہ کی روایت پر روشنی ڈالی اور قومی ایکتا کے عناصر کو نمایاں کیا۔ نظامت کے فرائض جناب پروفیسر احمد بدر صاحب اور اظہار تشکر پروفیسر پی کے مشرا نے انجام دیے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' علی گڑھ، 5 اکتوبر 2015

'امروز'

بھیونڈی، ممبئی: کتاب کی اہمیت کل بھی قائم تھی

اور آج بھی، اس سے کسی کو انکار نہیں، اور ایسی کتابیں جن سے نونہالان قوم کے علم میں اضافہ ہو اس کی اہمیت تو دوچند ہے۔ ان خیالات کا اظہار مایہ ناز محقق، ناقد اور استاذ ڈاکٹر محمود الحسن الہ آبادی نے ڈاکٹر ابوطالب انصاری

کی کتاب 'امروز' کی رسم رونمائی کے موقعے پر یہاں اردو بسیرا، رئیس ہائی اسکول کیمپس، بھیونڈی میں کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ابوطالب کامیاب معالج ہی نہیں ہیں بلکہ وہ ایک اچھے مصنف بھی ہیں۔ یہ کتاب دراصل جنرل نالج کے موضوع پر ہے۔ جس میں ایک پورے عیسوی سال کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس دوران پیش آنے والے تاریخی واقعات، حادثات اور دیگر معلومات کو نہایت بچوں کی نفسیات کا خیال کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ابوطالب انصاری نے کتاب کے اشاعت کے مقاصد کے بارے میں بتایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 ستمبر 2015

وفیات:

سید احمد، گورنر منی پور

ممبئی: منی پور کے گورنر ڈاکٹر سید احمد کا ممبئی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 73 برس کے تھے اور ممبئی کے لیلاوتی اسپتال میں داخل تھے۔ مرحوم کے خاندانی ذرائع نے یہ معلومات دی۔ سید احمد کینسر میں

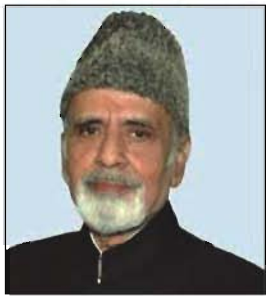

مبتلا تھے اور گذشتہ ہفتے انھیں مضافاتی علاقے باندرا کے لیلاوتی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کے پسماندگان میں بیوی کے علاوہ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ انھوں نے 16 مئی 2015 کو منی پور کے گورنر کا حلف لیا تھا۔ مہاراشٹر کے سابق کانگریسی لیڈر سید احمد اس سے پہلے جھارکھنڈ کے گورنر تھے۔ انھیں اس وقت کی یو پی اے حکومت نے 26 اگست 2011 کو جھارکھنڈ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ سیاست کے علاوہ احمد لکھتے بھی تھے، خاص کر اردو میں۔ احمد نے ڈبل ایم اے (ہندی اور انگریزی) کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان کی تخلیقات میں ان کی سوانح عمری 'پگ ڈنڈی سے شہر تک' کے علاوہ 'جنگ آزادی میں اردو شاعری'، 'مقتل سے منزل' وغیرہ شامل ہیں۔ مرحوم احمد 1977 میں کانگریس پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔ وہ مہاراشٹر اسمبلی کے لیے پانچ بار ممبئی کی ناگپاڑہ سیٹ سے منتخب ہوئے۔ وہ مہاراشٹر میں کابینہ وزیر بھی رہے جہاں انھوں نے رہائش جیسے محکمہ کی ذمے داری سنبھالی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 ستمبر 2015

جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال

اسلام آباد: پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ کے مطابق جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال طویل علالت کے بعد لاہور میں 91 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ مفکر اور

شاعر علامہ اقبال کے بیٹے تھے۔ جسٹس جاوید اقبال کینسر کے عارضے میں مبتلا تھے اور ہفتہ کی صبح ان کا انتقال ہوگیا۔ جسٹس ریٹائرڈ جاوید اقبال لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے سینئر جج کے طور پر بھی تعینات رہے تھے۔ ان کی پیدائش 5 اکتوبر 1924 کو سیالکوٹ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کے بعد انگریزی اور فلسفہ میں ماسٹرس کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بعد میں 1954 میں یونیورسٹی آف کیمبرج سے فلسفہ کے مضمون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور 1956 میں لندن میں لنکن انز سے قانون کی تعلیم مکمل کی تھی۔ ان کی اہلیہ جسٹس ریٹائرڈ ناصرہ اقبال بھی قانون کے شعبے سے وابستہ ہیں اور لاہور ہائی کورٹ میں جج تعینات رہ چکی ہیں۔ صدر پاکستان ممنون حسین اور وزیر اعظم نواز شریف نے جسٹس جاوید اقبال کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے اور اپنے تعزیتی پیغامات میں قانون اور ادب کے لیے ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 اکتوبر 2015

مولانا طیب عثمانی

نئی دہلی: اردو کے معروف ادیب، صحافی اور جید عالم مولانا طیب عثمانی کا گیا (بہار) میں انتقال ہوگیا۔ وہ سملہ خانقاہ کے معروف بزرگ شاہ قاسم صاحب علیہ الرحمہ کے بیٹے تھے ان کی تعلیم ندوۃ العلما لکھنؤ میں ہوئی تھی، ان کا علمی و ادبی ذوق بہت ہی منفرد تھا، اسی لیے وہ ادارہ ادب اسلامی سے بھی وابستہ رہے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کی پیدائش 1930 میں ہوئی تھی، بنیادی تعلیم و تربیت سملہ خانقاہ میں ہوئی، لیکن وہ مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کی فکر سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے اور تاحیات جماعت سے وابستہ رہے۔ ان کے ندوہ کے ہم درس رفقا میں ڈاکٹر علامہ سید سلیمان ندوی کے بیٹے ڈاکٹر سید سلمان ندوی ساؤتھ افریقہ کا نام قابل ذکر ہے۔ مولانا شاہ محمد طیب عثمانی کی رحلت پر ادارہ ادب اسلامی ہند نے ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی اور ان کے فرزند ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، ڈاکٹر عمیر منظر (اسسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس) اور جملہ پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔ ملک کی معروف دینی جماعت سے آخر دم تک وابستہ رہ کر دینی اور ادبی میدان میں مولانا شاہ محمد طیب عثمانی نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 اکتوبر 2015

پروفیسر سلیمان

دیوبند: متعدد اردو و عربی کتابوں کے معروف ہندی مترجم پروفیسر سلیمان کا ان کے آبائی وطن مالا ہیڑی بہٹ سہارنپور میں طویل علالت کے بعد تقریباً 75 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ درجنوں اردو عربی کتابوں کا ہندی ترجمہ کرنے والے پروفیسر موصوف کو ہندی ترجمہ نگاری میں عبور حاصل تھا۔ انھوں نے شیخ الہند کا ہندی ترجمہ کیا تھا۔ مرحوم کی رحلت پر مسلم فنڈ دیوبند اور آئی ٹی وغیرہ میں تعزیتی مجالس اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اکتوبر 2015

منظر سلطان

نئی دہلی: سرزمین بہار سے تعلق رکھنے والے اردو کے معروف شاعر منظر سلطان کا یکم اکتوبر کو پٹنہ میڈیکل کالج میں انتقال ہوگیا۔ وہ 60 سال کے تھے۔ گردے کی

تکلیف کی وجہ سے پچھلے تین دنوں سے اسپتال میں زیر علاج تھے۔ منظر سلطان کا اصلی نام انیس احمد تھا وہ مغربی چمپارن میں بتیا کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنا ادبی سفر 1975 سے شروع کیا۔ بہار اور بیرون بہار کے اہم مشاعروں میں نظامت کی وجہ سے وہ عوام میں کافی مقبول تھے۔ لواحقین میں ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ ان کی تدفین ان کے آبائی قصبہ بیتیا میں عصر کی نماز کے بعد ہوئی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 2 اکتوبر 2015

شاعر عبداللہ نصر

مئوناتھ بھنجن: مقبول شاعر عبداللہ نصر کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال سے پورے شہر میں خاص طور سے ادبی وشعری حلقہ میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی تدفین میں شہر کے معززین واکابرین، شعراو ادبا کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگ موجود رہے۔ بزم شعر و ادب اور بزم تعمیر اردو کی جانب سے بزرگ شاعر عبداللہ نصر کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 ستمبر 2015

علی حافظ

بنگلور: اردو کے سرکردہ صحافی علی حافظ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ 84 سال کے مسٹر حافظ کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ وہ روزنامہ سالار کے چیف رپورٹر کے طور پر ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ بنگلور رپورٹرز گلڈ کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ انھیں کرناٹک حکومت کے راجیہ اتسوا ایوارڈ کے علاوہ کئی دیگر اعزازات سے نوازا گیا۔ مرحوم کولار ضلع کے باگے پلی میں پیدا ہوئے تھے اور سیاسی واقعات پر گہری نظر رکھتے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 ستمبر 2015

خراجِ عقیدت:

مولوی محمد باقر کو خراجِ عقیدت

نئی دہلی: میرے نزدیک مولوی محمد باقر صرف عالم، صرف صحافی اور مظلوم ہی نہیں بلکہ وہ استعارہ ہیں قوم پرستی اور وطن پرستی کا۔ انھوں نے صرف 47 برس کی عمر پائی اور 21 برس تک صحافتی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے دین اور دنیا دونوں کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا۔ ان کی صحافت صداقت کی علامت تھی۔ ان خیالات کا اظہار سینئر صحافی منصور آغا نے اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام 'دہلی اردو اخبار' کے بے باک مدیر اور عظیم صحافی مولوی محمد باقر کو قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے منعقدہ ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پروگرام کی صدارت روزنامہ اخبار مشرق کے مدیر وسیم الحق نے کی جبکہ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر وصحافی اور اردو اکادمی دہلی گورننگ کونسل کے ممبر معین شاداب نے انجام دیے۔ بلیماران کے ممبر اسمبلی عمران حسین نے اس پروگرام میں بطور خاص شرکت کی۔ اس موقعے پر منصور آغا، معصوم مرادآبادی، اسد رضا اور سہیل انجم نے مولوی محمد باقر اور دہلی اردو اخبار کے حوالے سے پر مغز مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 17 ستمبر 2015

شیخ امان اللہ فیضی کے انتقال پر تعزیتی نشست

نئی دہلی: شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر ولی اختر ندوی کے والد محترم معروف عالم دین مولانا امان اللہ خاں فیضی سابق شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ریاض العلوم، اردو بازار، جامع مسجد دہلی کے انتقال پر ملال پر شعبۂ عربی کے زیر اہتمام پروفیسر محمد نعمان خان کی صدارت میں تعزیتی نشست منعقد کی گئی۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد نعمان خان نے مولانا مرحوم کی وفات پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ مولانا نیک، صالح اور جید عالم دین تھے۔ انھوں نے عرصہ تک درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا اور ایک نسل کو دینی علوم سے آراستہ کیا، جوان کے لیے صدقۂ جاریہ ہے۔ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر نعیم الحسن اثری نے اپنے خطاب میں کہا کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم مدرسہ اصلاح المسلمین، پتھر والی مسجد پٹنہ سے حاصل کی، بعد ازاں جامعہ فیض عام سے سند فضیلت حاصل کی اور جامعہ سلفیہ دربھنگہ، جامعہ سلفیہ بنارس میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ 1977 سے 1992 تک دہلی میں واقع جامعہ ریاض العلوم میں شیخ الحدیث رہے۔ بعد ازاں اپنے آبائی وطن بیرگنیا، سیتامڑھی میں دینی ادارہ قائم کیا اور وہاں بھی تاعمر دینی واصلاحی کاموں میں ہمہ تن مصروف رہے۔ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر سید حسنین اختر نے اپنے تعزیتی کلمات میں مولانا مرحوم کے اوصاف کو بیان کیا۔ تعزیتی نشست سے شعبہ کے استاذ ڈاکٹر مجیب اختر ندوی نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 ستمبر 2015

عتیق مظفر پوری کو خراجِ عقیدت

نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام عتیق

مظفر پوری کی وفات پر تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کانگریس کے ترجمان اور معروف صحافی م افضل نے اور نظامت معین شاداب نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر شکیل شمسی ایڈیٹر روزنامہ انقلاب اور سید فیصل علی گروپ ایڈیٹر راشٹریہ سہارا نے شرکت کی۔ میزبان کی حیثیت سے ڈاکٹر اطہر فاروقی سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) بھی موجود تھے۔ م افضل نے تعزیتی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عتیق مظفر پوری سے ان کے تعلقات ذاتی طور پر تو تھے ہی مگر وہ میرے ادارے سے بھی وابستہ رہے ہیں اس لیے ان سے میرا رشتہ اور بھی زیادہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ ایک اچھے صحافی کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی اچھے انسان بھی تھے۔ شکیل حسن شمسی نے اپنے کئی اشعار پڑھ کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر سید فیصل علی نے بھی اظہارِ تعزیت پیش کی۔ بعد ازاں مرحوم عتیق مظفر پوری کے بیٹے جاوید رحمانی نے تمام مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 ستمبر 2015

یادِ جگر

مرادآباد: علی سکندر عرف جگر مرادآبادی کی 55 ویں برسی کے موقعے پر ان کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے نگر نگم

کے ہال میں جگر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 'یادِ جگر' کے نام سے پروگرام منعقد ہوا۔ اس دوران اردو ادب نوازی کے لیے شاعر ضمیر درویش اور ستیش فگار کو جگر مرادآبادی کے نام پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروگرام میں مہمان خصوصی ایل ایل سی ڈاکٹر جے پال سنگھ بیست نے شرکت کی۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی کی صدارت اور ڈاکٹر محمد آصف کی نظامت میں منعقدہ پروگرام میں مقررین نے جگر مرادآبادی کے نام پر آڈیٹوریم، ڈاک ٹکٹ جاری کیے جانے اور میونسپل ہال میں ان کی تصویر لگائے جانے کا مطالبہ رکھا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 ستمبر 2015

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عصری عالمی ادب کے ستون: احوال وافکار

مصنف: زبیر رضوی
صفحات: 216
قیمت: 111 روپے

مشاہدات وتاثرات

مصنف: ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ
ترتیب وتہذیب: اطہر صدیقی
صفحات: 412
قیمت: 185 روپے

تاریخ علم الادویہ

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی
صفحات: 498
قیمت: 220 روپے

اسلام: تعارف وتاریخ

مرتبین: پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر محمد ارشد
صفحات: 288
قیمت: 137 روپے

فضائی آلودگی
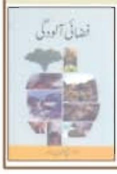
مصنف: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر
صفحات: 179
قیمت: -/108 روپے

ہمارا طرزِ زندگی اور بیماریاں

مصنف: ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی
صفحات: 69
قیمت: -/42 روپے

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی
صفحات: 307
قیمت: 113 روپے

تعلیمی نفسیات

مصنف: ڈاکٹر طلعت عزیز
صفحات: 242
قیمت: -/100 روپے

ہند کی مایۂ ناز ہستیاں ودیگر مضامین

مصنف: بی شیخ علی
صفحات: 176
قیمت: -/35 روپے

معالجات (جلد اول، دوم، سوم چہارم)
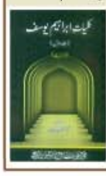
مصنف: وسیم احمد اعظمی
صفحات: 2273 (مکمل سیٹ)
قیمت: 613 روپے (مکمل سیٹ)

کاشف الحقائق

مصنفہ: سید امداد امام اثر
مرتبہ: ڈاکٹر وہاب اشرفی
صفحات: 740
قیمت: 305 روپے

مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال
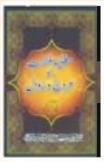
مصنف: آر پی ترپاٹھی
مترجم: ریاض احمد خاں شروانی
صفحات: 543
قیمت: 242 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا
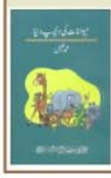
مصنف: محمد خلیل
صفحات: 83
قیمت: -/24 روپے

لکھنؤ کے شعر وادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر

مصنف: سید عبدالباری
صفحات: 690
قیمت: -/286 روپے

شرارِ جستجو

مصنف: قیصر ضحیٰ عالم
صفحات: 125
قیمت: -/80 روپے

پیسے کی کہانی
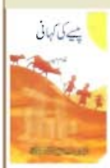
مصنف: غلام حیدر
صفحات: 80
قیمت: -/22 روپے

شماریات

ادارہ
صفحات: 95
قیمت: -/50 روپے

حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد

مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, November-2015, Vol.17, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/10/2015**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Prof. Syed Ali Karim, Tel : 49539000